نقطے سے کالم تک

لکھنا سیکھیے

مدارس کے لیے بطور نصاب لکھی گئی تدریسی کتاب

مفتی ابولبابہ شاہ منصور

الحجاز
0314-2139797

نقطے سے کمال تک

لکھنا سیکھیے

کالم و مضمون نگاری، حاشیہ و مقالہ نگاری
اصول و آداب، اقسام و طریقِ کار، مشقی سوالات

مفتی ابولبابہ شاہ منصور

الحجاز کراچی
0314-21 39 797

نقطے سے کالم تک

جملہ حقوق طباعت بحق مصنف محفوظ ہیں

کتاب.................. نقطے سے کالم تک

مصنف.................. مفتی ابولبابہ شاہ منصور

طبع اوّل.................. صفر 1437ھ - 2015ء

ناشر.................. الحجاز کراچی

علماء دیوبند کے علوم کا پاسبان
دینی و علمی کتابوں کا عظیم مرکز ٹیلیگرام چینل
حنفی کتب خانہ محمد معاذ خان
درس نظامی کیلئے ایک مفید ترین
ٹیلیگرام چینل

Karachi, Pakistan.
PASSION | QUALITY | INNOVATION
E-MAIL:hafizsaeedalam@gmail.com
CELL: +92-321-4283 199

ملنے کے پتے

پاکستان کے تمام مشہور کتب خانوں سے دستیاب ہے

رابطہ: 797 39 0314-21

فہرست

مقدمہ: بلبلے سے کائنات تک ۱۲
پہلی بات ۱۵
سات قرآنی نصیحتیں ۱۷
اسلامی صحافت کے آداب واصول مشاہیر اہل علم کی نظر میں ۲۲
صاف لکھنا سیکھیے ۳۳
اچھا لکھنا سیکھیے ۳۵
تحریر کے مقاصد ٤١
تحریر کے عناصر ٤٣

پہلا باب: لکھنے سے پہلے

(مبادیات، لوازمات، انتباہات)

تحریر کے تین مراحل

۱- لکھنے سے پہلے

دو اہم فیصلے ٤٩
۱- صنفِ تحریر کا فیصلہ ٤٩
۲- ذہنی تیاری ۵۰
دو ذہنی مشقیں ۵۱
۱- سوچ و بچار ۵۱
۲- موضوع کے انتخاب کے طریقے ۵۱

پہلا طریقہ.....دوسرا طریقہ.....تیسرا طریقہ.....چوتھا طریقہ..... پانچواں طریقہ... ۵۲

۲- لکھنے کے دوران

پیش تحریر(Pre-writing,Manuscript).. ۵۷
تدوین(writing).. ۵۷
۱- ابتدا کیسے کی جائے؟.. ۵۸
۲- خیالات کا تسلسل کیسے برقرار رکھا جائے؟.. ۵۹
۳- اچھا اختتام کیسے ہو؟.. ٦۰

۳- لکھنے کے بعد

نظرِ اوّل.. ٦۲
نظرِ ثانی.. ٦۳
حتمی مسوّدہ(Final Proof).. ٦۵
اشاعت سے پہلے اور بعد.. ٦۵

تحریر کا مواد حاصل کرنے کے چار ذرائع

۱- مطالعہ........................ ٦۹   ۲- مشاہدہ........................ ٦۹
۳- مکالمہ (غیر رسمی انٹرویو)...... ۷۰   ٤- سماعت........................ ۷۱

مواد محفوظ کرنے کے ذرائع

۱- بیاض اور کشکول (نوٹ بک اور جرنل).. ۷۳
۲- کٹنگ فائل.. ۷٤

تحریر کی ظاہری خوبیاں

۱- قواعدِ انشا........................ ۷٦   ۲- املا........................ ۷٦
۳- مکمل اور برمحل نقطے........................ ۸۰   ٤- پورے شوشے........................ ۸۱

۵- صحیح جوڑ.......................... ۸۲ ٦- علامات کا درست استعمال..... ۸۲

اردو املا

ہمزہ.................. ۸۷ نون اور نون غنہ.................................. ۸۷
دہری واؤ.................. ۸۸ ہائے اصلی وہائے مختفی.......................... ۸۸
عربی الفاظ................ ۸۷ فارسی تراکیب (مرکبِ اضافی وتوصیفی)....... ۹۱
الفاظ کے اندراعداد......... ۹۱ متفرق.. ۹۱

اُردو کے رموز اوقاف

۹۳ - ۱۱۱

تحریر کی معنوی خوبیاں

پہلی خوبی-تحریری لوازم.. ۱۱٤
دوسری خوبی-موضوع سے مناسبت.. ۱۱٤
تیسری خوبی-وضاحت.. ۱۱۵
چوتھی خوبی-مقصدیت.. ۱۱۷
پانچویں خوبی-اختصار اور جامعیت.. ۱۱۷
چھٹی خوبی-مکمل بات... ۱۱۸
ساتویں خوبی-نتیجہ خیزی.. ۱۱۸

دوسرا باب: لکھنا سیکھیے!

(آغاز، ارتقاء، انتہاء)

لکھنے کی ابتدا کیسے؟... ۱۲۱
ادبی طریقِ مطالعہ.. ۱۲۳
مطالعے کے بارے میں تین سوال.. ۱۲٤
مطالعے کے قابل تین چیزیں... ۱۲۵

ایک صاحبِ علم کا طریقِ مطالعہ............ ۱۲۶

کارآمد مطالعے کے اصول

اہم، زیادہ اہم، اہم ترین............ ۱۲۹
مطالعہ کن کتابوں کا کیا جائے؟............ ۱۲۹
چند نثری تصانیف............ ۱۳۰
چند شعری مجموعے............ ۱۳۱

تحریر سیکھنے کے دس طریقے

۱-مطالعاتی جدول یا اسکیٹنگ چارٹ. ۱۳۲
۲-کہانی لکھنا............ ۱۳۳
۳-تطبیقی خاکہ لکھنا............ ۱۳۳
٤-چربہ اتارنا............ ۱۳۳
۵-تلخیص و تسہیل............ ۱۳٤
٦-ترجمانی کرنا............ ۱۳٤
۷-مکالمہ، مباحثہ اور مناظرہ............ ۱۳۵
۸-روزنامچہ نویسی (ڈائری لکھنا)۱۳٦
۹-منظر نگاری............ ۱۳٦
۱۰-خبر، مراسلہ ومکتوب نگاری.. ۱۳۷

فنِ تحریر سیکھنے کا آسان اور مؤثر ترین طریقہ

مطالعاتی جدول یا اسکیٹنگ چارٹ............ ۱۳۹
لکھنے کی مشق کے تین مرحلے............ ۱۳۹
اسکیٹنگ چارٹ پُر کرنے کا طریقہ............ ۱٤۰
متضاد و متقابل............ ۱٤۲
مترادف و متقارب............ ۱٤۹
تشبیہات............ ۱۵۷
استعارات............ ۱۵۸
تشبیہ اور استعارے میں فرق............ ۱۵۹
تلمیحات............ ۱٦۲

ذُو معنی الفاظ ۱۶۹
محاورات ۱۷۲
ضرب الامثال ۱۷۵
محاورے اور ضرب المثل (کہاوت) میں فرق ۱۷۶

تیسرا باب: چار اہم اصناف تحریر

(کہانی نویسی، مضمون نویسی، کالم نگاری، حاشیہ و مقالہ نگاری)

پہلا حصہ: بطورِ نمونہ چند اخلاقی کہانیاں ۱۸۱
دوسرا حصہ: چند خاکے اور ان کی مدد سے لکھی گئی کہانیاں ۱۸۶
تیسرا حصہ: خاکے کی مدد سے کہانی لکھنا ۱۹۲

مضمون نویسی

مضمون کے تین حصے ۱۹۷
۱-ابتدائیہ .... ۱۹۷ ۲-مرکزی خیال .... ۱۹۷ ۳-خاتمہ ۱۹۷
مضمون کی اقسام ۱۹۷
مضمون نگاری سیکھنے کے لیے دو ہدایات ۱۹۹
(۱) مطالعے کی عادت .... ۱۹۹ (۲) استاد کی رہنمائی ۱۹۹

مضمون نویسی کے تین مراحل

۱-تخطیط .... ۲۰۰ ۲-تسوید .... ۲۰۰ ۳-تبییض ۲۰۱
ان اصولوں کو اپنایئے! ۲۰۳
ان غلطیوں سے بچیے ۲۰۵
ایک مشکل کا حل ۲۰۷
بیانیہ مضمون لکھنے کا طریقہ ۲۰۷
فوائدی مضمون لکھنے کا طریقہ ۲۰۸

مضمون نگاری کی مشق

مضمون نگاری کی مشق کے تین طریقے............ ۲۱۰
مضمون نگاری کی مشق کا پہلا طریقہ: تطبیقی خاکے............ ۲۱۱
دوسرا طریقہ: اشارتی خاکے............ ۲۱۶
تیسرا طریقہ: مشقی خاکے............ ۲۱۷

کالم نگاری

تعریف............ ۲۱۸ مضمون اور کالم میں فرق............ ۲۱۹
کالم کی اقسام............ ۲۲۰
(۱) رنگ برنگا کالم............ ۲۲۱
(۲) ذاتی کالم............ ۲۲۱
(۳) مزاحیہ کالم............ ۲۲۲
(٤) سینڈیکیٹ کالم............ ۲۲۲
(۵) خصوصی کالم............ ۲۲۳
کالم نویس کے اوصاف............ ۲۲٤
(۱) تعلیم یافتہ............ ۲۲٤
(۲) وسیع المطالعہ............ ۲۲٤
(۳) زبان وبیان پر عبور............ ۲۲۵
(٤) صحافتی قوانین واخلاقیات.. ۲۲۵
(۵) تحریری صلاحیتیں............ ۲۲٦
(٦) اچھا رپورٹر............ ۲۲٦
(۷) حسِ مزاح............ ۲۲٦
کالم کیسے لکھا جائے؟............ ۲۲۷

کالم نویسی کے مراحل

پہلا مرحلہ-موضوع کا انتخاب............ ۲۲۹
دوسرا مرحلہ-مواد کا حصول............ ۲۳۰
تیسرا مرحلہ-کالم لکھنا............ ۲۳۵
۱- سوچ وبچار............ ۲۳۵
۲- خاکہ سازی............ ۲۳٦

۳- متاثر کن آغاز............۲۳۶ ٤- بامعنی اختتام..............۲۳۷

کالم کا ابتدائیہ

ابتدائیہ کی اقسام..۲۳۸
۱-خبری ابتدائیہ..................۲۳۸ ۲- مقولاتی ابتدائیہ..............۲۳۹
۳-محاوراتی ابتدائیہ..............۲٤۱ ٤-حکایتی ابتدائیہ..............۲٤۱
۵-واقعاتی ابتدائیہ...............۲٤۱ ٦-مفاجاتی ابتدائیہ..............۲٤۳
۷-ڈرامائی ابتدائیہ...............۲٤۳ ۸-استفہامی ابتدائیہ..............۲٤٤
۹-مکالماتی ابتدائیہ..............۲٤۵ ۱۰-شعری ابتدائیہ..............۲٤٦

کالم کا اختتامیہ

تین مثالیں..۲٤۷

اچھے کالم کی خوبیاں

(۱) صحت زبان............۲٤۹ (۲) سلاست..............۲۵۰
(۳) اسلوب..............۲۵۰ (٤) شگفتگی..............۲۵۱
(۵) اختصار..............۲۵۱ (٦) انوکھا پن..............۲۵۲
(۷) منطق اور دلیل.........۲۵۲ (۸) تکلف سے پرہیز.........۲۵۲

کالم لکھنے کے بعد

(۱) تصحیح..............۲۵۳ (۲) اعادہ..............۲۵۳
(۳) مراجعت..............۲۵۳ (٤) جائزہ..............۲۵٤
(۵) تلافی..............۲۵٤ (٦) مشورہ یا مشاورتی اصلاح ۲۵٤
کالم کیسے شائع کروایا جائے؟..۲۵۵
اہم اخبارات کی ویب سائٹس اور ای میل ایڈریس..........................۲۵۷

اہم قومی، عالمی واسلامی دن.......... ۲۵۸
کالم شائع ہونے کے بعد.......... ۲۶۱

حاشیہ نگاری

-حواشی کے اندراج کا طریق کار.......... ۲۶۳
-متعدد صفحات کا حوالہ.......... ۲۶۵
-حوالۂ مکرّرہ کا اندراج.......... ۲۶۶
-اہم ہدایات.......... ۲۶۶
-اشاریے (انڈکس) کی ترتیب.......... ۲۶۸
-مآخذ ومصادر (کتابیات) کی ترتیب.......... ۲۶۸
-مراجع کے اندراج کی ترتیب.......... ۲۶۹

مقالہ نگاری

-تحقیق کی کامیابی کے عوامل.......... ۲۷۲
-مقالہ نگاری کے چار مراحل.......... ۲۷۵
-مقالہ کو حتمی شکل دینا.......... ۲۹۵
-مقالے کے مراجع ومصادر.......... ۳۰۰
آخری بات.......... ۳۰۴
کتابیات.......... ۳۰۵

انتساب

”ملّا صاحب اور طالب جان کے نام“

اس شہرہ آفاق ”ملّا صاحب“ کے نام
جنہوں نے یہ کتاب لکھنے کا حکم دیا

اور

اس گمنام ”طالبؒ جانؒ“ کے نام
جس کے شوق سے متاثر ہو کر یہ کتاب لکھنے کا داعیہ پیدا ہوا۔ *

* تفصیل کے لیے کتاب کا مقدمہ دیکھیے۔

مقدمہ

بلبلے سے کائنات تک

جب اس کائنات میں کچھ نہ تھا تو خدا تھا.....اور جب بہت کچھ ہے تو درحقیقت تب بھی خدا ہی ہے جو اصل قادرِ مطلق اور مالکِ کُل ہے.....اور جب کچھ نہ ہوگا تو بھی خدا ہوگا۔

یہ کائنات کسی وقت ایک نقطہ تھی۔ نقطے سے بلبلہ پھوٹا، بلبلے کو "کُنْ" کے امر نے پھیلا کر جیتی جاگتی، ہنستی بستی کائنات میں تبدیل کر دیا۔ فسبحان من خلق الخلق، فأحصاهم عددًا.

اس کائنات میں ہر چیز کی ایک اکائی ہے۔ یہ اکائی پھیلتی جائے تو مرکّب مجموعہ وجود میں آ جاتا ہے۔ مجموعہ سمٹتا جائے تو دوبارہ اکائی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ تحریر کی اکائی نقطہ ہے۔ چند نقطوں کے ملنے سے حرف بنتا ہے۔ حروف سے الفاظ اور الفاظ سے جملے وجود پاتے ہیں۔ جملوں کے ان مجموعے کو کالم یا مضمون کہہ دیتے ہیں۔ "نقطے سے کالم تک" کے اس سفر میں جو منزلیں آتی ہیں، اس عاجز نے کوشش کی ہے کہ ہمارے نو آموز "طالبِ جان" کے لیے یہ راہیں آسان ہو جائیں اور وہ "قلم کاری" اور "سطر سازی" کا فن سیکھ کر لوح و قلم کو پیدا کرنے والے اور "وَالْقَلَمِ، وَمَا يَسْطُرُوْن" کی قسم کھانے والے کے سچے دین کی دعوت کا فرض انجام دے سکے۔

اس کتاب کی محرّک دو چیزیں ہیں: ایک تو وہ حیرت و استعجاب جو صلاح و صالحیت کے حامل ایک نوجوان طالب علم کے چہرے پر اس وقت پھیلا جب اس نے احقر سے پوچھا: "صحافت کیسے سیکھی جاتی ہے؟" بندہ نے جو سچ تھا وہ کہہ دیا: "خبر نہیں۔" یہ سن کر اس کے چہرے پر حزن و ملال کی جو کیفیت طاری ہوئی، حیرت و استعجاب اور نیم انکار، نیم عار کا جو تاثر پھیلا، یہ عاجز اسے آج تک بھلا نہیں سکا۔ میر قافیہ شناسی کے مطابق وہ یہ سمجھا تھا کہ بظاہر فقیر منش نظر آنے والا یہ شخص (یعنی راقم الحروف) دل سے کس قدر بخیل اور اندر سے کتنا گھنا ہے کہ ایک مسافر طالب علم سے کتمانِ علم کرتا ہے اور اس کے لیے غلط بیانی سے بھی نہیں شرماتا۔ مجھے اس کا چہرہ پڑھ کر نہایت شرمندگی ہوئی اور سچ ہے کہ اپنے آپ سے اور اپنی عجز بیانی سے گھن آئی کہ اس کو کیسے باور کراؤں

کہ حقیقت یہ ہے پورے زمانہ طالب علمی میں کبھی کوئی مضمون نہیں لکھا۔ اس میدان میں آمد اتفاقی واقعہ تھا۔ پھر تھوڑی سی ہمت کر کے اس کی دلجوئی کے لیے کہا:

''بھائی سچ یہ ہے کہ ہم تو بس وضو کر کے، دو رکعت پڑھتے ہیں۔ درود شریف اور مسنون ذکر کرتے ہوئے ''قلم کشی'' کرتے ہیں۔ پھر کاتب کو تحریر تھما کر استغفار کرتے ہوئے واپس آجاتے ہیں۔ اس کے آگے پیچھے ہمیں کچھ خبر نہیں کہ یہ صحافت کیا بلا ہوتی ہے؟''

اس پر وہ طالب علم جس کے چہرے سے صلاح کا نور ٹپکتا اور بُشرے سے علم کی خوشبو آتی محسوس ہوتی تھی، سلام کر کے رخصت ہو گیا، لیکن پیچھے ایک بڑا سوال چھوڑ گیا کہ اگر حادثاتی پیداوار کے طور ہی سہی، اس میدان میں کوئی آ ہی گیا ہے تو وہ اپنی برادری کے دوسرے فقیروں کو اس کی اونچ نیچ اور خم و پیچ سے آگاہ کرنے سے کیوں کتراتا ہے؟ اس سوال نے ضمیر پر اتنے کچوکے لگائے کہ اس عاجز نے ایک مضمون بنام ''مدارس میں اردو ادب کی تدریس و تمرین'' کے نام سے لکھ مارا اور یہیں سے اس تالیف کے دوسرے محرّک کا آغاز ہوا جو پہلے سے بھی زیادہ قوی تھا۔

ہوا یوں کہ یہ مضمون استاذ الاساتذہ، شیخ الشیوخ، رئیس الوفاق، جانشینِ شیخ الاسلام، حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی خدمت میں پہنچا۔ انہوں نے اس کمترین سے فرمایا کہ اس کے لیے کوئی نصاب ہونا چاہیے۔ ان کے اس فرمان میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ اس وقت اللہ کے بھروسے پر دل ہی دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ اپنی طلبہ برادری کے نو آموزوں کے لیے ''فنِ تحریر'' سیکھنے سکھانے کا کوئی ''بغدادی یا نورانی قاعدہ'' ترتیب دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس پر اللہ کے نام سے تحقیق و جستجو کے جس سفر کا آغاز ہوا اس کا اختتام ''تحریر کیسے سیکھیں؟'' نامی کتاب کی یافت پر ہوا۔ یہ کتاب چونکہ فن کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے لکھی گئی تھی، اس لیے اکثر اصنافِ تحریر کو جامع اور طویل و ضخیم ہے۔ جب طلبہ کے لیے ''کالم نگاری'' کی تربیت کا آغاز ہوا تو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کتاب کی تلخیص کر کے صرف کالم و مضمون نویسی پر اکتفا کیا جائے، تاکہ جو پورا فن پڑھنا چاہے، وہ اول الذکر کتاب دیکھ لے اور جو صرف کالم یا مضمون سیکھنے کا شوق رکھتا ہو، وہ اس مختصر مجموعے سے استفادہ کر لے۔ اس کے بعد بعض احباب کے مشورے پر ''حاشیہ و مقالہ نگاری'' بھی اس میں شامل کر دیے گئے کہ مدارس میں مقالہ نویسی کا رجحان زور پکڑ

رہا ہے اور اکثر طلبہ اس کے اصول ومبادی جاننے کی جستجو میں لگے رہتے ہیں۔

اس کتاب کا اصل مواد اوّل الذکر کتاب سے ماخوذ ہے۔ کہیں کہیں مثالوں میں تبدیلی اور کچھ ترمیم واضافہ ہے۔ چونکہ ایک سوچ یہ بھی ہے کہ اس کتاب کو بطور نصاب مدارس میں پڑھایا جائے، اس لیے ہر سبق کے آخر میں مشقوں کا اضافہ کردیا گیا ہے۔ اسباق کے بعد تمرینات تیار کرنے میں کلیۃ الفنون جامعۃ الرشید کے استاذ برادرم مولانا عمر فاروق راشد صاحب نے تعاون کیا جس کے لیے وہ ہم سب کی طرف سے دعائے خیر اور شکر جزیل کے مستحق ہیں۔ اسی طرح وہ تمام حضرات (ناموں اور کتابوں کی فہرست آخر میں دی گئی ہے) مؤلف اور تمام طلبہ کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں جن کی کتابوں سے استفادہ کرکے دینی مدارس کے طلبہ کے لیے فن تحریر کی تعلیم وتدریس کے لیے یہ "مختصر نصاب" ترتیب دیا گیا ہے۔ ہمارے اکثر طالب علم فطری طور پر ادیب اور خطیب ہوتے ہیں بس ضرورت اس بات کی ہے کہ ان دونوں فنون (تحریر وتقریر) کے اصول وآداب سے انہیں ایک مرتبہ گذار دیا جائے تو نجانے ان میں کتنے ایسے گودڑی کے لعل ہوں جن کی آب وتاب کو وہ نور ہیرے کی چمک دمک کو ماند اور دنیا کی نگاہوں کو خیرہ کر ڈالے۔ وہ دنیا جو دین کی دعوت سننے کے لیے ترس گئی ہے اور امید بھری نگاہوں سے انسانیت کے حقیقی خیر خواہوں اور سچے ہمدردوں کی راہ تک رہی ہے۔

شاہ منصور

۳۰ ویں شعبان

۱۴۳۶ھ

پہلی بات-راہ اور شاہراہ

''اصلاح کا کام یوں بھی دشوار اور نازک ہے اور پھر اصلاحی صحافت تو اور بھی دشوار تر اور نازک تر ہے۔ خدا کے لیے اپنی ذمہ داریوں کا پورا احساس رکھیے۔ بس! اس کے بعد ہر مشکل آسان ہوتی جائے گی۔ اصلاح کا کام پیمبرانہ عزم وحوصلہ اور پیمبرانہ روحانیت ودقتِ نظر چاہتا ہے اور اصلاحی صحافت گویا اسی کا شعبۂ تذکیر وتبلیغ ہے۔ جتنا اس کو سیرتِ پیمبری میں جذب وتحلیل کرتے جائیے گا، جتنا اپنے کو پیمبری کے سانچے میں ڈھالتے جائیے گا۔ تزکیۂ نفس وتربیتِ ضمیر از خود ہوتی جائے گی۔ راہ اور شاہراہ صرف یہی ہے۔ اس کے سوا جتنی بھی گلیاں کوچے ہیں، سب منزلِ مقصود سے ہٹانے والے، بھٹکانے والے ہیں۔''

(مکتوب عبدالماجد دریابادی بنام سید لقمان، مشمولہ ضمیمہ صدقِ جدید، لکھنؤ، یکم جنوری ۱۹۸۲ء، ص ۲۱ بحوالہ عبدالماجد دریابادی، احوال وآثار، ڈاکٹر تحسین فراقی، ص: ۳۴۰، ادارہ ثقافت اسلامی، لاہور، پاکستان)

دوسری بات-خدائی معیار

''دوسری بات یہ کہ زبان کو''کتابتاً'' بھی حاصل کیا جائے، بلکہ''کتابتاً'' حاصل کرنا''نطقاً'' اور''خطابتاً'' سیکھنے سے زیادہ ضروری ہے، اس لیے کہ تقریر اور گفتگو کا فائدہ عموماً وقتی ہوا کرتا ہے، جب کہ تحریر کا فائدہ دیرپا اور دوررس ہوا کرتا ہے۔ گفتگو کرنے والے کی گفتگو اور مقرر کی تقریر، خواہ وہ مقرر کتنا ہی لسان اور قادر الکلام ہو، اس کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد، بلکہ بعض دفعہ اس کے حینِ حیات ہی نسیاً منسیاً ہو جاتی ہے۔ لیکن اہل قلم کا مضمون اور مؤلف کی تصنیفات بعض دفعہ صدیوں بلکہ ہمیشہ باقی رہتی ہیں اور''ما ینفع الناس ''(انسانوں کے لیے مفید) کے خدائی معیار پر وہ جس درجہ اترتی ہیں اسی درجہ''یمکث فی الأرض ''یعنی پائیدار زندگی کی حامل ہوتی ہے۔ ہم جو کتابیں درس میں پڑھتے ہیں یا مطالعہ کرتے ہیں، ان کے لکھنے والے صدیوں پہلے اس جہانِ

فانی سے جا چکے، لیکن ان کی نگارشات جاوداں ہیں اور ہم ان سے فائدہ اٹھا کر ان کے لیے قلب و زبان سے دعا کرتے رہنے کو سعادت دارین کا بہترین ذریعہ گردانتے ہیں۔(مولانا نور عالم خلیل امینی، حرف شیریں:۳۸)

فنِ تحریر سیکھنے والے کے لیے قرآنِ کریم کی سات نصیحتیں

قرآنِ کریم نے زندگی کے ہر شعبے کی طرح فنِ تحریر یا تقریر (آج کل کی اصطلاح میں صحافت وابلاغیات) سیکھنے والے کے لیے بھی بہت اہم اور مفید نصیحتیں بیان کی ہیں۔ ان پر عمل کرنے سے جہاں تحریر کو چار چاند لگ جاتے ہیں، وہیں تحریر نگار مخالفین کی بے جا تنقید اور آخرت کی گرفت سے بھی بچ سکتا ہے۔

پہلی نصیحت۔ تصحیحِ نیت:

ان میں سے سب سے پہلی اور اہم ترین بات یہ ہے کہ تحریر نگار اپنی نیت درست اور قلم پاک رکھے۔ وہ ہر لمحے یہ دھیان رکھے کہ اللہ تعالیٰ حاضر وناظر ہیں اور ان کی طرف سے اس کی نگرانی اور اعمال نویسی کے لیے ایسے خدائی اہلکار مقرر کیے گئے ہیں جو اپنے فرائض سے کبھی بھی غفلت نہیں کرتے۔ ارشاد باری ہے:

"مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ، اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْد."

ترجمہ: ''انسان کوئی لفظ زبان سے نہیں نکال پاتا مگر اس پر ایک نگران مقرر ہوتا ہے، ہر وقت (لکھنے کے لیے) تیار!'' (ق:۱۸)

یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ کسی بات کا قلم سے لکھنا بعینہ وہی حکم رکھتا ہے جو زبان سے کہنے کا ہے۔ جس کلام کا زبان سے ادا کرنا ثواب ہے اس کا قلم سے لکھنا بھی ثواب ہے اور جس کا بولنا گناہ ہے اس کا قلم سے لکھنا بھی گناہ ہے، بلکہ لکھنے کی صورت میں ثواب اور گناہ دونوں میں ایک اضافہ ہو جاتا ہے، کیونکہ تحریر ایک قائم رہنے والی چیز ہے، مدّتوں تک لوگوں کی نظر سے گزرتی رہتی ہے، اس لیے جب تک وہ دنیا میں موجود رہے گی اور لوگ اس کے اچھے یا برے اثر سے متاثر ہوتے

رہیں گے، اس وقت تک کاتب کے لیے اس کا ثواب یا عذاب برابر جاری رہے گا۔ اس لیے ہر مضمون نگار کا فرض ہے کہ کسی مضمون پر قلم اٹھانے سے پہلے اس کو مندرجہ ذیل معیار پر جانچ لے اور درحقیقت یہی معیار تمام ان آداب کا خلاصہ ہے جو اسلامی صحافت کے حوالے سے بیان کیے جاتے ہیں۔

اس بنیادی نصیحت کے بعد دورانِ تحریر وتقریر چند اہم آداب کا خیال رکھنے کا حکم دیا گیا ہے:

دوسری نصیحت-قولِ سدید:

آدابِ تحریر وتقریر کے بارے میں قرآن وسنت کے حوالے سے جو باتیں، جتنے پہلوؤں سے آئی ہیں، ان سب کو قرآنِ کریم نے سورۂ احزاب کی اس آیت میں جمع کر دیا ہے:

"یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ، وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا."

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سیدھی سچی بات کہا کرو۔'' (الاحزاب: ۷۰)

اس آیت میں قول کی صفت ''سدید'' بیان کی گئی ہے۔ ''قول سدید'' کے مختلف ترجمے کیے گئے ہیں: سیدھا کام، سیدھی بات، سچی بات۔ لیکن مفسرین کے مطابق لفظِ ''سدید'' میں مذکورہ بالا تینوں معانی خود بخود آ جاتے ہیں، بلکہ اس لفظ میں اس سے بھی زیادہ وسیع مفہوم پنہاں ہے اور ایک چوتھا معنی بھی اس میں شامل ہے۔ چنانچہ ان کے بقول سدید وہ قول ہے جو:

- سچا ہو، جھوٹ کا اس میں شائبہ نہ ہو۔
- صحیح ہو، غلطی کا اس میں احتمال نہ ہو۔
- نرم ہو، دلخراش نہ ہو۔
- بامقصد ہو، محض ہنسی، دل لگی، وقت گذاری نہ ہو۔

جب یہ چاروں صفات کسی کلام میں جمع ہوں گی تو اس کو ''قولِ سدید'' کہا جائے گا۔ اگر ہمارے اربابِ صحافت قرآنِ کریم کے صرف اسی ایک لفظ کو اپنے لیے مشعل راہ بنالیں تو موجودہ صحافت میں ایک خوشگوار انقلاب برپا ہوسکتا ہے۔

تیسری نصیحت-قولِ حسن:

ایک اور جامع اور انقلاب آفرین نصیحت اس آیت میں کی گئی ہے:

"وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا." (البقرة:۸۳)

یعنی عام لوگوں سے اچھی بات کہو۔ یہ اسلامی صحافت کا انتہائی اہم اصول ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریر نگار کا بنیاد نقطہ اور محورِ عمل ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' ہے۔ دوسرے لفظوں میں اچھائی کے فروغ اور برائی کی روک تھام کے لیے قلم کے ذریعے جدوجہد کرنا اسلامی صحافت کا بنیادی فریضہ ہے اور یہ فریضہ اتنا عظیم الشان ہے کہ قرآنِ کریم کی تصریح کے مطابق فریضۂ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی بجا آوری تمام انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے بنیادی مقاصد میں شامل ہوتی تھی۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صحافت کتنا مقدس میدانِ عمل ہے اور چونکہ ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' ہی اسلامی صحافت کا بنیادی مقصد ہے، اس لیے ایک داعیٔ حق کی جو صفات قرآن وسنت سے معلوم ہوتی ہیں وہ تمام صفات ایک مسلم صحافی میں پائی جانی چاہییں۔

چوتھی نصیحت-قولِ لیّن:

دوسری ہدایت یہ ہے کہ بات دلخراش انداز میں نہ کی جائے، شائستگی اور نرمی سے کی جائے۔ دلخراشی اور سخت کلامی ہوگی تو بات بے اثر ثابت ہوگی، بلکہ بعض اوقات اس کا نقصان دہ اثر بھی ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو جب کلمۂ حق کہنے کے لیے فرعون کے پاس بھیجا گیا تو ان کو ہدایت دی گئی: "وَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا" کہ آپ فرعون سے نرم بات کیجیے۔ (طٰہٰ:٤٤)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے: جب حضرت موسیٰ علیہ وحضرت ہارون علیہما السلام جیسے جلیل القدر انبیاء کو فرعون جیسے گمراہ انسان کے سامنے سخت کلامی کی اجازت نہیں دی گئی تو ہم جو حضرت موسیٰ وحضرت ہارون علیہما السلام سے بڑے مصلح نہیں اور ہمارے مخاطب فرعون سے زیادہ گمراہ نہیں تو ہمیں اپنے مخاطبین کے سامنے سخت کلامی کی اجازت کیسے

ہوسکتی ہے؟اس لیےتحریریاتقریرکی ایک شرعی صفت یہ ہے کہ وہ نرم ہو،دلخراش نہ ہو۔

پانچویں نصیحت-قولِ حکیم:

ایک قیمتی اوراہم ہدایت قرآنِ کریم نے یہ دی ہے:

"اُدۡعُ اِلیٰ سَبِیۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ، وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ، وَجَادِلۡهُمۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ."
(النحل:۲۵)

کہ آپ لوگوں کوحکمت ودانائی اورنصیحت کے اچھے پیرائے کے ساتھ اللہ کے راستے کی دعوت دیجیے اوراگرکسی سے مناظرہ یعنی دلائل میں مقابلہ کرناپڑے تواس میں بھی اچھا طریقہ اختیارکریں۔یعنی ایسے موقع پرعلمی انداز میں مدلّل اورسنجیدہ گفتگوکی جائے۔جذباتی،اہانت آمیز یادلخراش اندازِکلام نیزبغیردلیل کے گفتگوسےگریزکیاجائے۔

چھٹی نصیحت-قولِ فصیح:

تحریرنگارکے لیےضروری ہے کہ اسےعلمی اورعوامی دونوں زبانوں پرعبورحاصل ہو۔اس کی زبان وبیان میں فصاحت وبلاغت کی توانائی موجودہو۔فصاحت وبلاغت کے بغیرکلام اثرنہیں کرتا۔اللہ رب العالمین نے جتنے انبیاءِکرام مبعوث فرمائے،وہ اپنی قوم کےہم زبان اوران سب سےزیادہ فصیح ہوتے تھے۔سورۂ ابراہیم میں ارشادہے:

"وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ، اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ."

''ہم نے جورسول بھی بھیجاہےاس کی قوم کےہم زبان بھیجاہے۔''

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم زبان آدمی کی گفتگومحاورے کےعین مطابق ہوتی ہےاورفصاحت وبلاغت کی وجہ سے وہ مخاطب پراثرانداز ہوتی ہے،اس لیےایک مسلم صحافی یاواعظ کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اس کی زبان فصاحت کےجوہراوربلاغت کےزیورسےآراستہ ہو۔

ساتویں نصیحت-قولِ دائم:

آخری نصیحت یہ ہے کہ داعیٔ حق کوناسازحالات سےدل گیرومایوس ہوکراپنا کام چھوڑنانہیں

چاہیے، بلکہ حق بات پھیلانے کی کوشش انتہائی مایوس کن ماحول میں بھی جاری رکھنی چاہیے، کیونکہ اچھائی کے فروغ کے لیے کی جانے والی جدوجہد رائیگاں نہیں جاتی، بالآخر اس کا اثر ہوکر رہتا ہے، بشرطیکہ اس عظیم ذمہ داری کی نزاکتوں کا پورا خیال رکھا جائے۔

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ سے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ لوگ کہتے ہیں موجودہ دور میں وعظ ونصیحت کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ایسا کہنا ہرگز درست نہیں، کیونکہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

”وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ.“

یعنی ”تم نصیحت کرو۔ بیشک نصیحت ایمان والوں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔“

اس لیے یہ کہنا کہ موجودہ حالات میں نصیحت کی باتیں مفید نہیں ہوتیں، واقعہ کے خلاف ہے۔ البتہ وعظ ونصیحت کی افادیت ظاہر ہونے کے لیے تین شرطیں ہیں:

پہلی شرط یہ ہے آپ جو بات کہنا چاہتے ہیں، وہ حق ہو۔ بات خود غلط نہ ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ نیت حق ہو، کہ بات خیر خواہی کے جذبے سے کہی جائے۔ اپنی بڑائی اور بہادری جتلانا یا مخاطب کو ذلیل ورسوا کرنا ہرگز مقصود نہ ہو۔ اسی طرح بات میں مداہنت، چاپلوسی یا تعصب نہ ہو، بلکہ ایسی بات کہی جائے جو حق وانصاف کے تقاضوں پر پوری طرح اترتی ہو۔

تیسری شرط یہ ہے کہ طریقہ بھی حق ہو اور طریقہ حق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ سنتِ انبیاء کے مطابق ہو۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی میں انبیاء علیہم السلام نے حکمت واعتدال کے جو بہترین نمونے چھوڑے ہیں، ان کی تفصیلات قرآنِ کریم میں آئی ہیں۔

جب یہ تین شرطیں پائی جائیں گی کہ بات حق ہو، نیت حق ہو اور طریقہ بھی حق ہو، تو دعوت بے فائدہ نہیں ہوگی، ضرور اپنا رنگ لائے گی اور جلد یا بدیر، کم یا زیادہ، اس کا اثر بہر حال ہوکر رہے گا۔

اسلامی صحافت کے آداب واصول

مشاہیر اہل علم کی نظر میں

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ فنِ تحریر اہلِ دنیا کی میراث ہے۔ خصوصاً صحافت، خبر نویسی اور کالم نگاری کا نام آتے ہی طلبہ اور دین دار حضرات کے ذہن میں یہ تصور آتا ہے کہ تو خالصتاً دنیا داری والے کام ہیں۔ ذیل میں اکابر علمائے دیوبند جن کے ہم نام لیوا اور پیروکار ہیں، کے حوالے سے چند رہنما ہدایات اور نصیحتیں درج کی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ تقریر یا خطابت کی طرح فنِ تحریر یا صحافت بھی دراصل حق کی دعوت اور دین کی سربلندی سے تعلق رکھتا ہے۔ بدقسمتی سے داعیانِ دین کی بے توجہی اور اہلِ باطل کی (طرف سے میدان خالی دیکھ کر) اس شعبے پر ان کے پورے تسلط اور مکمل گرفت نے آج یہ دن دکھایا ہے کہ دعوت وتبلیغ کے اس اہم ذریعے پر دنیا پرستوں اور باطل خواہوں کی اجارہ داری ہے۔ اس صورتحال کی اصلاح، اس میدان میں پائے جانے والے خلا کو پُر کرنا اور زبان کی طرح قلم کے ذریعے دعوت واصلاح کا فن سیکھنا عصرِ حاضر کی اہم ترین دینی ضرورت ہے۔ آئیے! اکابر اولیاء اللہ کی اس حوالے سے چند ہدایات ذہن نشین کرتے ہیں۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ:

(۱)

''مضمون نگاری اور اخبار نویسی میں شرعی گرفت سے بچنے کا سب سے بہتر طریقہ اور جامع مانع اصول یہ ہے کہ جس وقت کسی چیز کے لکھنے کا ارادہ کرے، پہلے اپنے ذہن میں استفتاء کرلے

[اپنے ضمیر سے پوچھ لے] کہ اس کا لکھنا میرے لیے جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ثابت ہو تو قدم آگے بڑھائے، ورنہ بعض لوگوں کو خوش کرنے کے لیے گناہ میں ہاتھ رنگ کر پرائی بدشگونی کے لیے اپنی ناک نہ کاٹے۔ اگر خود احکامِ شرعیہ میں ماہر نہ ہو تو کسی ماہر سے استفتاء کرنا ضروری ہے۔ یہ ایک شرعی اجمالی قانون ہے جو فقط اخبار نویسی میں نہیں بلکہ ہر قسم کی تحریر میں ہر مسلمان کا مطمحِ نظر ہونا چاہیے۔''

(۲)

''جو خبر [یا تحریر] کسی شخص کی مذمت اور ضرر پر مشتمل نہ ہو اس کی اشاعت جائز ہے، مگر اس شرط سے کہ اس کی اشاعت کسی مسلمان کی خاص مصلحت یا مسلمانوں کی عام مصلحت کے خلاف نہ ہو۔ جس خبر یا تحریر میں ایسا ضعیف احتمال بھی ہو تو سوائے ان لوگوں کے جو اس معاملے کے ذمہ دار ہوں، عام لوگوں کے سامنے اس کو ظاہر کرنا نہ چاہیے، کیونکہ ممکن ہے کہ اس کے نقصانات کی طرف اس شخص کی نگاہ نہ پہنچی ہو۔ "وَاِذَا جَاءَ هُمْ اَمْرٌ مِنَ الْاَمْنِ اَوِالْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ" میں ایسے ہی اخباروں اور تحریروں کی مضرت اور مذمت کو بیان فرمایا ہے۔

پھر مناسب ہے کہ اس کو بھی محض خبر کی حیثیت سے نقل نہ کرے بلکہ اس سے کوئی دینی یا دنیوی فائدہ پیدا کرے۔ مثلاً آپ کسی شخص کے متعلق یہ خبر درج کرتے ہیں کہ اس نے چند ہزار روپے کسی مدرسہ یا مسجد یا کسی دوسرے نیک کام میں صرف کیے تو اس کے بعد اس شخص کے لیے دعا اور دوسرے مسلمانوں کے لیے اس کی ترغیب ذکر کر دی جائے یا مسلمانوں کی کسی جماعت یا فرد کی مصیبت کا ذکر آیا تو خود بھی دعا کرے اور مسلمانوں کو بھی اس کی طرف متوجہ کرے نیز یہ بھی کہے کہ جس سے ہو سکے اس کی مادی امداد بھی کرے۔ کسی کی موت کا ذکر کیا ہے تو لوگوں کو اس طرف متوجہ کرے کہ عبرت حاصل کریں اور اپنے اسی وقت کے لیے سامان تیار کریں۔''

(۳)

''کسی شخص کے عیب یا گناہ کا واقعہ اگر حجت شرعیہ سے ثابت ہو جائے تب بھی اس کی

اشاعت اور اخبار میں درج کرنا جائز نہیں، بلکہ اس وقت بھی اسلامی فرض یہ ہے کہ خیر خواہی سے تنہائی میں اس کو سمجھایا جائے۔ اگر سمجھانے سے نہ مانے اور آپ کو قدرت ہو تو بجبر اس کو روک دیں، ورنہ کلمۂ حق پہنچا کر آپ اپنے فریضہ سے سبکدوش ہو جائیں۔ اس کی اشاعت کرنا اور رسوا کرنا شرعاً ممنوع ہونے کے علاوہ تجربہ سے ثابت ہے کہ بجائے مفید ہونے کے ہمیشہ مضر ہوتا ہے۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں اس کی تاکید فرمائی ہے کہ اگر اپنے بھائی مسلمان کا کوئی عیب یا گناہ ثابت ہو تو اس کو رسوا نہ کرے، بلکہ پردہ پوشی سے کام لے اور تنہائی میں اس کو سمجھائے کیونکہ یہی طرز زیادہ مؤثر اور مفید ثابت ہوا ہے۔''

(''اخبار بینی'' و ''افکارِ دینی ضمیمۂ اخبار بینی'': النور، ماہِ صفر ۱۳۵۰ ھ)

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی:

(۱)

یہ بات جانی بوجھی ہے کہ ہر جریدہ، رسالہ یا اخبار اپنے مدیر کے مزاج سے پہچانا جاتا ہے۔ ''صدقِ جدید'' کے مدیر حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی ایک ایسی شخصیت تھے جو آنکھ اور کان بند کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔ اگر یہ چیزیں ان کے مزاج کا حصہ نہ ہوتیں تو اپنی نو مسلمی کے جوش اور روایتی تصوف کے حلقہ بگوش ہونے کے کچھ ہی دیر بعد گوشہ نشین ہو چکے ہوتے، لیکن اُن کی شخصیت میں تحرک، خودداری، صاف گوئی، اسلام اور مسلم کلچر سے اٹوٹ محبت اور فحش، بغی اور تمرّد سے نفرت جیسے عناصر شامل تھے۔ ایسا شخص صحافت کا شغل کسی لمحاتی تأثر کے نتیجے میں اختیار نہیں کر سکتا تھا بلکہ اس کے پیچھے ان کا کامل تدبّر اور سلیقہ برسرِ کار تھا۔ وہ صحافت کو ایک تحریک، ایک مشن، ایک عظیم واسطہ قرار دیتے تھے تاکہ اس کے ذریعے زندگی زیادہ سہل، باوقار اور باخدا ہو سکے۔ صحافت کے باب میں ان کا نظریہ کیا تھا، اسے جاننے کے لیے اُن کے مضمون ''ہفتہ وار صحافت کے آداب'' کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس مضمون میں ماجد نے اپنے تجربے کی روشنی میں صحافت کے مقاصد کا تعین کچھ اس طرح کیا تھا:

1 -مقصود خدمتِ دین وملت رکھیے۔عام خدمتِ خلق بھی اسی کے تحت میں آ جاتی ہے۔

2 -وطن کا بڑا حق ہوتا ہے...البتہ مسلمان وطن کا ''پرستار'' نہیں ہوسکتا۔عبودیت کا یہ خصوصی تعلق تو صرف ذاتِ حق کے لیے مخصوص ہے۔اس کی مخلوق میں سے کسی کے حصہ میں نہیں آ سکتا۔

3 -خبر برائے خبر کا روزناموں میں جو بھی درجہ ہو، ہفت روزہ میں تو یہ ایک تقریباً مہمل چیز ہوگی۔ ہفت روزے میں اپنے تبصرے سے یا کم سے کم خبر کی سرخی ہی سے ہر خبر کو بامقصد بنا کر پیش کیجیے۔

4- پبلک کے جذبات کی محض نمائندگی پر اکتفا نہ کیجیے۔ پبلک کے مذاق اور جذبات کی اصلاح کی کوشش بھی جاری رکھیے۔

5 -صحافت ایک قسم کی تجارت نہیں،ایک قسم کی عبادت ہے۔

6 - دوسروں کا احتساب ہر پبلک معاملہ میں ضرور کیجیے،لیکن خود کو بھی احتساب سے بالا نہ خیال کیجیے۔احتسابِ نفس کو سب پر مقدم رکھیے۔

7 -بلا وجہ معقول کسی کی دل آزاری کیا معنی، دل شکنی بھی گوارا نہ کیجیے۔مروّت کی بھی حدود قائم کر لیجیے،ان کے آگے قدم نہ رکھیے۔

8- ملک کی اکثریت کا،حکومتِ وقت کے قانون کا ضرور لحاظ رکھیے۔حتی الامکان راہِ سلامت روی اختیار کیجیے،لیکن مرعوبیت اور احساسِ کمتری کی حد تک ہرگز نہ پہنچ جایئے۔صلح وسازگاری دوسری چیز ہے اور بزدلی اور خوشامد بالکل دوسری۔

9 -تنقید آزادی سے کیجیے،لیکن ذاتیات پر اُتر آنے سے اپنے کو اہتمام کے ساتھ بچایئے۔ کسی کے نسب پر،وطن پر،شکل وصورت پر طنز کرنا سب ذاتیات ہی کی شکلیں ہیں۔

10 - خیال کریے اور ڈرتے رہیے اس وقت سے جب آپ کا سارا دفتر آپ کے سامنے ہوگا اور آخری اور حقیقی عدالت میں اس کے ایک ایک لفظ پر سوال ہو رہا ہوگا۔

(۲)

''ان حالات کے ساتھ اب یہ نوبت پہنچ گئی ہے کہ ہمارے علوم ادبیہ بازیچۂ اطفال بن گئے

ہیں۔ وہ تصانیف جو دماغ سوزی کا ثمرہ ہوں، تقریباً مفقود ہوگئی ہیں اور اگر کسی چیز کی عام طور پر مانگ ہے تو وہ ناول اور میگزین ہے۔ گو ناول نویس اور ایڈیٹر بھی اس افراط سے پیدا ہوگئے ہیں کہ یہ پیشہ بھی اب بمشکل کامیاب پیشہ کہے جاسکتے ہیں..... ادبِ اعلیٰ جو اپنے اصل مقصود کے لحاظ سے مروج الوقت خیالات وعقائد کا مصلح وناقد تھا اور جس کی علتِ غائی موجود سطح کو بلند کرنا تھی، اب ایک حالت پر منجمد ہوکر رائج الوقت خیالات کا محض آئینہ بن گیا ہے۔''

(۳)

''اسلامی پریس سے اتنا زائد مایوس نہ ہوجائیے۔ آئیڈیل حالت نہ علماء کی ہے نہ لیڈروں کی، نہ کسی اور طبقہ کی۔ پھر اخبار نویس اتنی اونچی سطح پر کیسے آجائیں۔ باقی نرم گرم کام جس طرح اور ہر طبقے سے چلا جاتا ہے، ان سے بھی ہے۔ میری تو مدت سے تمنا ہے کہ ''مجلسِ تحفظِ ناموسِ اسلام'' کے نام سے ایک مستقل ومخصوص مجلس صرف دینی ادبی احتساب کے لیے ہو، ہر سیاسی پارٹی سے بالاتر۔''

(عبدالماجد دریابادی، احوال وآثار، ڈاکٹر تحسین فراقی: ۵۱۱، ۲۵٦، ۳٤۰)

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ:

(۱)

''مسلمان بھی کسی وقت ایک زندہ قوم تھی۔ اس کی ساری صلاحیتیں دین کے لیے وقف تھیں۔ اس کا جو قدم اٹھتا تھا تو ایک صحیح مقصد کی طرف۔ جو حرکت ہوتی تو صراطِ مستقیم پر۔ غرض ہر حرکت وسکون میں کسی نہ کسی خیر کا نقشہ سامنے آجاتا تھا۔ اگر کبھی بظاہر کسی لغو یا عبث کام میں بھی مبتلا ہوتے تو وہاں بھی کوئی ایسا اسلامی امتیازی نشان چھوڑ آتے تھے کہ وہ سب خرابیاں کافور ہوجاتی اور یہ نیکیوں سے مالا مال ہوکر "اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ" کا پروانہ لے کر ہٹتے تھے۔ غرض نقصان کی جگہ میں بھی اُن کے لیے نفع کے راستے کھلے ہوئے تھے۔ آج حال یہ ہے کہ

مسلمان اگر کبھی بھولے سے کوئی نفع کا کام بھی کرتے ہیں تو اس میں بھی اپنے (حسنِ سلیقہ سے) نقصان کے سوا کچھ حاصل نہیں کرتے۔ کبھی ایک نیکی کی توفیق ہو جاتی ہے تو جب تک اس میں دس گناہ نہیں ملائے جاتے چین نہیں آتا۔ کوئی نیک سے نیک اور ضروری سے ضروری کام ایسا نہیں جس کو ہماری بے پروائیوں نے بجائے ثواب کے ہمارے لیے عذاب نہ بنا دیا ہو۔ آج اخبارات وجرائد اور اکثر مذہبی ادارے بھی اس غفلت شعاری کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔‘‘

(۲)

’’الغرض جس اخبار کو اٹھایئے اس میں ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے جو مہمانی سب سے زیادہ اہتمام سے پیش ہوتی ہے، وہ کسی مسلمان کے گوشت (عیب اور عیب جوئی) پر مشتمل کوئی جھوٹا پروپیگنڈا ہوتا ہے یا کسی کا دلخراش استہزا و تمسخر، جس کو لطائف یا افکار، حوادث یا خواطر، سوانح یا فکاہات کے عنوان کے مہذب لباس میں پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ فرمانِ الٰہی ”لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ“ اس کا صاف اعلان کر رہا ہے کہ کسی شخص کو اس کا حق نہیں کہ دوسروں کا استہزا و تمسخر کرے۔ اکثر جھوٹی افواہیں اور بلا تحقیق خبروں کی بنا پر ایک مسلمان بھائی کی جان و مال اور عزت آبرو کے خلاف اعلان جہاد کر دیتے ہیں۔ شریعتِ مطہّرہ کا قانون مانع ہوتا ہے نہ سیاسی مصلحتیں اور اخوت واتحادِ اسلامی کا لحاظ، حالانکہ خدائے تعالیٰ کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبہ میں عرفات کے عظیم الشان مجمع کے سامنے اعلان فرما دیا ہے کہ مسلمان کی عزت وآبرو کی رعایت وحفاظت ہر مسلمان پر ایسی ہی فرض ہے جیسے اس کے جان و مال کی۔

لیکن آہ! کہ آج تمام اربابِ قلم واصحابِ صحافت نے انے آپ کو ان تمام قوانینِ شرعیہ سے مستثنیٰ سمجھ لیا ہے اور کبھی دھیان تک نہیں ہوتا کہ ہم گناہ کر رہے ہیں۔ شاید کسی اخبار کا کوئی صفحہ بمشکل ان بے لذّت گناہوں سے خالی ہوتا ہو، ورنہ عام طور پر یہی وہ چیز ہے جس پر تمام زورِ صحافت ختم کیا جاتا ہے۔ ادھر اخبار بیں طبقہ کی بدمذاقی نے اس کو اور بھی فروغ دے دیا کہ ان کے یہاں اخبار کے مقبول ہونے کی سب سے پہلی شرط یہی چیز ہے اور وہی ایڈیٹر سب سے زیادہ اپنے فن کا ماہر سمجھا جاتا ہے جو اپنی من مانی باتوں کا سکّہ لوگوں کے قلوب پر بٹھانے میں اس کی پروانہ

کرے کہ ہمارا خیال شرعاً صحیح ہے یا غلط؟ مسلمانوں کے لیے مفید ہے یا مضر؟ اپنے مخالف کو نیچا دکھانے میں حلال وحرام کی بحث کو حرام سمجھا جاتا ہے۔''

(۳)

''روزمرہ کے واقعات وحوادث چشمِ بینا کے لیے بہترین وعظ ہیں، لیکن اس کی ضرورت ہے کہ لوگوں کو اس پر متنبہ کیا جائے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا ہے ؂

انقلاباتِ جہاں واعظِ رب ہیں دیکھو
ہر تغیّر سے صدا آتی ہے فافہم فافہم

اول تو کوئی واقعہ اور کوئی خبر دنیا میں ایسی کم ہوتی ہے جو نتیجہ خیز نہ ہو یا جس سے کوئی دینی یا دنیوی فائدہ متصوّر نہ ہو، لیکن اگر کوئی خبر ایسی بھی ہو تب بھی اس کو محض تفریحِ طبع کے لیے ذکر کردینے میں بھی مضائقہ نہیں، بلکہ یہ بھی ایک درجہ میں شرعاً مطلوب ہے۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بعض اوقات مزاح (خوش طبعی) فرمانا اسی حکمت پر مبنی تھا۔ ایک حدیث میں حضرت علی کرّم اللہ وجہہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

"اِجۡمَعُوۡا هٰذِهِ الۡقُلُوۡبَ، فَاطۡلُبُوۡا لَهَا طُرَفَ الۡحِكۡمَةِ؛ فَاِنَّهَا تَمِلُّ كَمَا تَمِلُّ الۡاَبۡدَانُ."(کنز العمال: ۲/۱۳٦)

ترجمہ: ان قلوب کو بھی تھوڑی دیر (غور وفکر) سے مہلت دیا کرو۔ اس طرح کہ ان کے لیے حکمت کی لطیف وعجیب باتیں تلاش کرو (جن سے دماغی وقلبی تھکن ختم ہو) اس لیے کہ دل بھی اسی طرح تھک جاتے ہیں جیسے بدن تھکتے ہیں۔''

(اسلامی اخباروں کے لیے شرعی دستور العمل: جواہر الفقہ، ۲/ ٤٦۳-٤۸۷)

حضرت مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم:

(۱)

صحافت کے آداب کے بارے میں قرآن وسنت کے حوالے سے جو باتیں، جتنے پہلوؤں سے آئی ہیں، ان سب کو قرآنِ کریم نے سورۂ بقرہ کی اس آیت میں جمع کر دیا ہے: "وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا." ''اور عام لوگوں کو بھلی بات نرمی سے کہو۔''

قیامِ پاکستان کے بعد جب ریڈیو پاکستان کراچی کی موجودہ عمارت نئی نئی تعمیر ہوئی تو اس وقت کے ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل نے مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ سے آ کر درخواست کی کہ ریڈیو پاکستان کے مونوگرام کے لیے کوئی قرآنی آیت تجویز فرما دیں۔ حضرت نے اسی آیت کا ترجمہ تجویز فرمایا تھا۔ چنانچہ اسی وقت سے قرآنِ کریم کا یہ جملہ ریڈیو پاکستان کے مونوگرام کے طور پر چلا آ رہا ہے۔

(۲)

''میرے والد ماجد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ حکیمانہ بات ارشاد فرمائی۔ آج میں اسے آپ کی نذر کرتا ہوں: ''ہر خبر لفظوں کے اعتبار سے اگرچہ خبر ہو، لیکن اس کا مقصد حقیقت میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی ترغیب ہوتا ہے۔ مثلاً آپ کہتے ہیں کہ بھارت نے نیوٹران بم بنانے کی صلاحیت حاصل کر لی، تو کہنے کو تو یہ ایک خبر ہے، لیکن خبر کے ان الفاظ میں اہلِ پاکستان کے لیے ایک اہم پیغام پوشیدہ ہے جو حقیقت میں امر بالمعروف ہے کہ اس خطرے سے نبرد آزما ہونے کے لیے تمہیں مناسب انتظام کر لینا چاہیے۔''
اس لیے سچی خبریں بروقت فراہم کرنے اور صحیح معلومات بہم پہنچانے سے بھی انجام کار ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کا مقصد حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ ایک مسلمان صحافی کی ذات ان تمام اوصاف وکمالات کا جامع نمونہ ہونا چاہیے جو ایک داعی حق کے لیے قرآن وسنت

میں بیان کیے گئے ہیں۔''

(۳)

''اچھائی کی طرف بلانے کا طریقہ سنت انبیاء کے مطابق ہونا ضروری ہے، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب کسی تحریر یا تقریری میں تین شرطیں پائی جائیں گی تو دعوت بے فائدہ نہیں ہوگی۔ وہ تین شرطیں یہ ہیں: بات حق ہو، نیت حق ہو اور طریقہ بھی حق ہو۔ ایسی تحریر یا تقریر ضرور اپنا رنگ لائے گی اور جلد یا بدیر، کم یا زیادہ اس کا اثر بہر حال ہو کر رہے گا۔

اگر ہمارے مسلمان صحافی ان ہدایات کو اپنالیں اور اپنا صحیح مقام پہچان لیں کہ ان کا درجہ حقیقت میں داعی حق کا درجہ ہے، تو وہ اپنے بہترین کردار کے ذریعے دنیا کو یہ بتا سکیں گے کہ ایک مسلم صحافی کا کیا مقام ہوتا ہے اور اسلامی صحافت اور موجودہ صحافت میں کتنا بڑا فرق ہے؟''

(صحافت کے اسلامی آداب واصول، ایک گفتگو: ہفت روزہ فاتح 22 تا 28 ستمبر 1999ء)

شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم:

(۱)

''آج کی نشست میں ہم اپنے ملک کے مدیرانِ جرائد سے یہ التجا کرنا چاہتے ہیں کہ خدارا اس ستم رسیدہ قوم کی حالت پر رحم کیجیے جو مادّی اور اخلاقی اعتبار سے گونا گوں تباہیوں کا سامنا کر رہی ہے۔ یہ قوم نہ اپنے مزاج و مذاق اور دین و مذہب کے لحاظ سے ان عیاشیوں کی متحمل ہے اور نہ اس کے مادی وسائل و ذرائع اس کی اجازت دیتے ہیں دنیا کی دوسری اقوام عریانی و فحاشی اور عیش پرستی اختیار کر کے دنیا میں کچھ روز مزے اڑا سکتی ہیں، لیکن یہ مسلمان قوم جس کا خمیر کلمہ ''لا الٰہ الا اللّٰہ'' سے اٹھا ہے، اس کے لیے عیش و نشاط اور طاؤس و رباب کا راستہ اختیار کرنے کے بعد تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فکری قیادت و منصب عطا کیا ہے، آپ اپنی مخلصانہ جدوجہد کے ذریعے اس قوم کو اخلاق و شرافت کے بامِ عروج تک لے جا سکتے ہیں اور پھر

انسانیت کی خدمت کیلیے اس قوم کے سارے کارنامے آپ کے نامۂ اعمال میں لکھے جا سکتے ہیں۔ آپ کا فریضہ یہ ہے کہ اگر نئی نسل کسی غلط سمت کا رخ کر رہی ہے تو آپ اپنی حکمت وبصیرت اور اپنی محبت وشفقت سے اس کا رخ بدلنے کی کوشش کریں، نہ یہ کہ بے راہ روی میں اس کی حوصلہ افزائی کے مرتکب ہوں۔ آپ کے اسلاف نے آپ کو غیرت وحمیت اور عفت کی میراث عطا کی تھی، لیکن آپ اپنے بچوں کے لیے کیا چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں؟ بے حیائی؟ بداخلاقی؟ یا ذلت ورسوائی؟''

(۲)

''پھر اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ آج کے اخبارات اپنا ظاہری ڈھانچہ اور اخلاقی ضابطۂ کار مرتب کرتے وقت کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ قوم پر اور خاص طور سے ناپختہ ذہنوں پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ ہمیں یہ لکھتے ہوئے انتہائی دکھ ہوتا ہے کہ تجارتی منافع کی دوڑ میں ہماری صحافی برادری نے عفت اور اخلاق کی ہر قدر کو پامال کر ڈالا ہے۔ عریانی وفحاشی کو فروغ دینے میں ہر اخبار دوسرے سے آگے نکل جانے کی فکر میں ہے۔ سینما کے اشتہارات کا حصہ جس قدر متعفن اور اخلاقی جذام کا حامل ہوتا ہے وہ تو کسی تشریح کا محتاج ہی نہیں۔ عام خبروں کا حصہ بھی بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شریف اور باحیا انسان اسے اپنے بچوں کے سامنے نہیں پڑھ سکتا۔ اخلاقی جرائم کی خبریں بہت ممتاز اور نمایاں کر کے شائع کی جاتی ہیں اور ان کی تفصیلات مزے لے لے کر قسط وار بیان ہوتی ہیں۔ اور کچھ نہیں تو کسی غیر ملکی فاحشہ کی کسی معمولی نقل وحرکت کی خبر شائع کرنے کے بہانے اس کی نیم عریاں تصویر شائع کر دی جاتی ہے۔ خاص طور سے شام کے اخبارات نے تو اس معاملہ میں قیامت ہی ڈھا رکھی ہے اور ان کا کوئی شمارہ اس قسم کی اخلاق سوز تصویروں سے خالی نہیں ہوتا۔

سوال یہ ہے کہ اگر کسی غیر ملکی شہزادی نے کسی شخص سے ناجائز تعلقات قائم کر رکھے ہیں یا کوئی مشہور خاتون کسی جزیرے میں اپنے شوہر کے ساتھ ہنی مون منا رہی ہے تو پاکستان کے نوجوانوں نے کیا قصور کیا ہے کہ اس کی تفصیلات سنا سنا کر ان کا ذہن خراب کیا جائے اور یہ ایسی کونسی خبر ہے جس سے واقف ہونا اہلِ پاکستان کے لیے ناگزیر ہے؟ یا اگر کسی ایکٹر اور ایکٹریس

میں باہمی ناچاقی کے بعد کوئی سمجھوتا ہوگیا ہے تو پاکستان کی نوخیز نسل کے ذمہ کیا فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کی تمام تفصیلات سے باخبر ہو، لیکن ہمارے اخبارات ہیں کہ اس نوع کی خبروں کو چار دانگ عالم سے اکٹھا کر کے ان کا سڑا ہوا ملغوبہ ہمارے نوجوان نسل کے آگے اس طرح ڈالتے ہیں جیسے دنیا بھر میں اس سے اہم خبر کوئی نہیں۔"

(۳)

''صحافت کو محض ایک ذریعۂ تجارت بنالینا بجائے خود ایک مذموم حرکت ہے، لیکن ناپختہ ذہنوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر معاشی منافع حاصل کرنا تجارت کی بھی سب سے بدتر اور سب سے گھناؤنی قسم ہے، چہ جائیکہ صحافت جیسے مقدس کام کو اس سے ناپاک کیا جائے۔

اس صورتِ حال کی بہت بڑی ذمہ داری اخبارات کے قارئین پر بھی عائد ہوتی ہے۔ ابھی تک ان قارئین میں اکثریت ان حضرات کی ہے جو اخبارات کی اس روش سے نہ صرف یہ کہ خوش نہیں ہیں بلکہ اس سے بیزار ہیں، لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم سب اپنی بیزاری کے جذبات کو دل ہی دل میں گھونٹ کر رہ جاتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ انہیں اپنی نجی مجلسوں تک محدود رکھتے ہیں اور ان کا اظہار اخبارات کے منتظمین پر نہیں کرتے۔ مدیرانِ جرائد کو نہ شخصی ملاقاتوں کے ذریعے اس طرف توجہ دلائی جاتی ہے نہ ان کے پاس اس موضوع کا کوئی خط پہنچتا ہے اور نہ کسی اور طریقے سے انہیں اس طرزِ عمل پر متنبہ کیا جاتا ہے۔

ہماری گزارش یہ ہے کہ اگر آپ اخبارات کی اس روش کو برا سمجھتے ہیں، اگر آپ کے نزدیک صحافت کا یہ طرزِ عمل ہماری نوخیز نسل کو خراب کر رہا ہے اور آپ کو ان ناپختہ ذہنوں پر کوئی ترس آتا ہے تو اپنے ان جذبات کو اپنے تک محدود رکھنے کی بجائے صحافت کے اربابِ حل وعقد تک پہنچایئے۔ ان سے ملاقات کے لیے شہریوں کے وفود بنایئے۔ انہیں خطوط لکھیے اور ان سے مطالبہ کیجیے کہ وہ اس طرزِ عمل سے باز آئیں۔ اس کام کو صرف علماء اور دینی اداروں کے حوالے کر کے مطمئن ہو جانا کسی طرح آخرت کی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔'' (آمین)

(مدیران جرائد سے ایک گزارش: اداریہ ماہنامہ البلاغ، ماہِ صفر ۱۳۹۶ھ)

صاف لکھنا سیکھیے

فن تحریر سیکھنے کا آغاز "خوش نویسی" یا "خوب نویسی" سے ہونا چاہیے۔ "خوش نویسی" ایک محنت طلب کام ہے۔ اس میں عبور حاصل کرنے کے لیے دل جمعی اور مستقل مزاجی سے محنت کے علاوہ فطری مناسبت اور ہاتھ کے لوچ کا بھی کافی دخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ کافی محنت کے بعد بھی اپنا خط درست نہیں کر پاتے جبکہ کچھ قدرتی طور پر خوشخط ہوتے ہیں، ذرا سی توجہ ان کی تحریر میں نکھار اور حسن پیدا کر دیتی ہے۔ یہاں ہم کچھ باتیں ایسی ہیں جن کو اپنانے سے زیادہ محنت کیے بغیر خط کو قابل قبول بنایا جا سکتا ہے جسے ہم "خوب نویسی" کہہ سکتے ہیں۔ ان آداب کا خلاصہ یہ ہے:

اردو، عربی اور فارسی میں حروف تین میں سے کسی ایک رخ پر چلتے ہیں۔ ان تین رخوں کا امکانی حد تک خیال رکھا جائے تو بغیر محنتِ شاقہ کے "خوش نویس" نہ سہی "صاف نویس" بنا جا سکتا ہے۔ پھر یہ "صاف نویسی" رفتہ رفتہ "خوب نویسی" میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

(۱) عمودی رخ:

یعنی اوپر سے نیچے، جیسے: "ا، لا" اور "ل، گ" میں موجود الف۔ یا نیچے سے اوپر جیسے: "جا، کا، ما" کے اندر موجود الف۔ ان کو اوپر سے نیچے یا نیچے سے اوپر لے جاتے وقت الف کو بالکل سیدھا رکھا جائے نہ دائیں یا بائیں جھکا ہوا نہ ہو۔

(۲) افقی رخ:

دائیں سے بائیں، جیسے: "ب، ت، ف اور ک" یا بائیں سے دائیں، جیسے: "ے، تے، نے، گے" ان کو بھی دونوں سمتوں میں رخ دیتے وقت سطر کے لیے دی ہوئی لکیر پر بالکل سیدھا لکھا جائے۔ اوپر نیچے ہونے سے بدنما ہو جاتے ہیں۔

(۳) گول رخ:

یہ رخ ان حروف میں ہوتا ہے جن میں دائرے بنتے ہیں۔ یا تو سیدھے سیدھے، جیسے: ''س، ش، ص، ق، ل، ن'' کے دائرے؛ یا الٹے، جیسے: ''ج، ح، خ، ع اور غ'' کا دائرہ۔ ان میں پوری کوشش کی جائے کہ دائروں کی متناسب گولائی قائم رہے۔ دائرے بھنچے ہوئے ہوں، نہ پھیلے ہوئے اور نہ لٹکے ہوئے۔

اس کے علاوہ اس بات کا دھیان رکھا جائے کہ نقطے، دندانے اور شوشے واضح اور پورے ہوں۔ حروف کا درمیانی فاصلہ مناسب ہو، نہ زیادہ نہ کم۔

ان ہدایات پر عمل کر لینے سے کسی خاص محنت کے بغیر فنون لطیفہ سے مناسبت اور دستکاری کی فطری استعداد نہ رکھنے والا شخص بھی اپنے خط کو قابل قبول اور صاف ستھرا بنا سکتا ہے۔ شروع میں ایسا کرنے کے لیے ٹھہر ٹھہر کر لکھنا پڑتا ہے اور تحریر بھی سادہ سی ہو جاتی ہے، لیکن بعد میں حروف کی ساخت قابو میں آجاتی ہے اور ہاتھ دماغ کی ہدایت کو فوری قبول کر کے اس کے مطابق چلنے لگتا ہے۔ اگر اس کے ساتھ ساتھ خطاطی کے کسی استاد سے تھوڑی بہت مشق کر لی جائے تو سبحان اللہ! سونے پر سہاگہ کا مصداق ہو جاتا ہے۔

اچھا لکھنا سیکھیے

اچھی تحریر کے کچھ آداب ہیں۔ان کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے ان کی عادت ڈال لینے سے آپ کی تحریر عمدہ اور معیاری ہو سکتی ہے۔ذیل میں ان کو مختصراً درج کیا جاتا ہے۔

– صاف ستھرے کاغذ پر لکھیے خصوصاً دینی تحریروں کو، اور دونوں طرف مناسب حاشیہ چھوڑیے۔

– مرکزی عنوان سطر کے بیچ میں اور ذیلی عنوان سطر کے شروع میں واضح کر کے لکھیے۔

– مرکزی عنوان پر واوین، قوسین وغیرہ کچھ نہ لگائیں۔ذیلی عنوان کے بعد دو کھڑے نقطے لگائیں۔

– سیدھی سطروں میں لکھیے۔حروف سطر سے نیچے نہ جھکنے پائیں نہ اوپر چڑھے ہوئے ہوں۔

– الفاظ کی ساخت کا خیال رکھیے، جو لفظ ملتے جلتے ہیں ان کے فرق کو واضح کیجیے، مثلاً:

مختصر کو مختقر

واقع کو واقح

لکھنا غلط ہے۔

– حروف کے دندانوں اور شوشوں کا خیال رکھیے۔انہیں بلا وجہ بڑھایئے، نہ کم کیجیے، مثلاً:

فضول کو فنضول

صفائی کو صفسائی

لکھنا غلط ہے۔

اسی طرح سیب کو سیب اور ناشپاتی کو ناشپاتی لکھنا قاعدے کے خلاف ہے۔

– ہر حرف اور لفظ کی شکل صحیح اور دندانے اور شوشے پورے پورے بنایئے۔

– حروف کو کھینچ تان کر خوبصورت بنانے کی کوشش نہ کیجیے، مثلاً:

اکبر　　　کو　　　اکـبـر

اثر　　　کو　　　اثـر

لکھنا غلط ہے۔

۔ الفاظ کے درمیان مناسب فاصلہ چھوڑیے۔کہیں کم اور کہیں زیادہ نہ ہونا چاہیے۔

۔ پوری توجہ سے صاف اور ستھرا لکھیے۔

۔بند سازی (پیراگرافنگ) کا لحاظ نہ رکھنا اور رموزِ اوقاف نہ لگانا تحریر کو بھدا بناتا ہے، اس سے پرہیز کیجیے۔

۔اضافت کے زیر اور ہمزہ کا برمحل استعمال کیجیے۔اس سے عبارت اور اشعار کے مطالب ومفاہیم سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔زیر اور ہمزہ کا قاعدہ املا کے باب میں دیکھ لیجیے۔

۔ کسی لفظ کے صحیح پڑھنے میں التباس یا اشتباہ کا اندیشہ ہو تو حرکات وعلامات کے ذریعے اس کے صحیح تلفظ کی تعیین کردینی چاہیے، لیکن اس میں مبالغہ نہ کیا جائے، عندالضرورت بقدرِ ضرورت پر اکتفا کیا جائے۔

۔ بہت زیادہ باریک لکھنا، شکستہ یا بھدا لکھنا، یا لکھ کر بار بار مٹانا یا کاٹنا نہایت بری عادت ہے۔

۔اُردو عبارت کے دوران عربی عبارت کا حوالہ آجائے تو اسے عربی رسم الخط میں تحریر کیا جائے۔

یاد رکھنے کی باتیں:

۔ اردو زبان میں عربی کے بعض ایسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جن کے شروع میں حرف جار "ب" ہوتا ہے جیسے: بالفعل، بالفرض، بالواسطہ وغیرہ؛ ان میں ایک الف لکھا جائے گا۔ دو الف لکھنا (باالفعل، باالفرض، باالواسطہ) عقل کو گالی دینے کے مترادف ہے۔

۔ "را" جب دوسرے حروف کے ساتھ مل کر لکھی جائے تو بعض حروف میں اپنی اصلی شکل میں ہوتی ہے، جیسے: بر، جر، کر۔ اور بعض میں اسے باریک اور لمبی لکھتے ہیں، جیسے سر، صر، ہر، طر، عر، فر، مر۔ البتہ بعض حضرات اسے دونوں قسم کے حروف کے ساتھ اصل حالت میں لکھتے ہیں، لیکن فرق بہتر ہے۔

۔جب تین حرفی لفظ میں را سے پہلے "ب"، "ن" یا "ی" ہو تو ان کے لیے دندانہ نہ بنانا چاہیے، البتہ اسے باریک اور لمبا لکھا جائے، جیسے: ببر، خبر، غیر۔ یوں نہ لکھنا چاہیے: ببر، خبر، غیر۔

۔ہائے ہوز (ہ) ہائے مخلوط (ھ) اور حائے حطی (ح) کے استعمال میں احتیاط کیجیے۔ مثال کے طور پر:

.....ہے، ہیں، ہزار اور ہمارا وغیرہ میں "ہائے ہوز" (ہ) ہے۔ انہیں "ہائے مخلوط" (ھ) یا "حائے حطی" (ح) سے لکھنا غلط ہے۔

.....تھانیدار، پھوپھا، کھوٹ اور جھوٹ وغیرہ میں ہائے مخلوط التلفظ ہے۔ ایسے الفاظ کو "ہائے ہوز" یا "حائے حطی" سے لکھنا درست نہیں ہے۔

.....اسی طرح حاجی، حاکم، حکیم اور حبیب میں "ح" ہے۔ انہیں "ہ" یا "ھ" سے نہیں لکھنا چاہیے۔

۔ کچھ الفاظ دو لفظوں کا مجموعہ ہوتے ہیں، لیکن بکثرت یکجا استعمال سے ایک لفظ بن جاتے ہیں، جیسے: بالکل، بلکہ وغیرہ۔ ایسے الفاظ کو جدا کر کے اس طرح لکھنا غلط ہے: بل کل، بل کہ۔

۔ دو یا تین لفظوں کو خواہ مخواہ ملا کر لکھنے کی کوشش نہ کیجیے۔ مثال کے طور پر: آسماںپر، جہاںسے، دلمیں، جنکا وغیرہ۔

ایسے الفاظ کو ہمیشہ الگ الگ لکھنا چاہیے، جیسے: آسمان پر، جہاں سے، دل میں، جن کا۔

۔ سطروں کے خاتمے کے حوالے سے مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

۱۔ کوئی فعل، دو سطروں میں نہ تقسیم ہو جائے، یعنی ایسا نہ ہو کہ "جاؤں گا" "کرتا ہوں" "گیا تھا" وغیرہ کا ایک جز جاؤں، کرتا، گیا، پہلی سطر میں ہو اور گا، ہوں، تھا دوسری سطر میں۔

۲۔اسم کے حوالے سے بھی یہی احتیاط ملحوظ رہے، یعنی ہر کلمہ اکائی کے طور پر ایک ہی سطر میں لکھا جائے گا۔ یہ نہیں کہ گھبراہٹ، مانوس، توکل کے ابتدائی اجزا گھبرا، ما اور تو، ایک سطر میں ہوں اور آخری اجزا ہٹ، نوس اور کل دوسری میں۔

اس طرح کی فروگذاشت بظاہر بہت معمولی نظر آتی ہے، لیکن اول تو لفظ کی بے محل تقسیم سے عبارت کا روپ خراب ہو جاتا ہے، دوسرے کبھی کبھی اس سے پیدا ہونے والے معنی ذہن کو بڑی

الجھن میں ڈال دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر صفحہ کے آخری سطر کا آخری ٹکڑا ہو:

آج آپ کا بھائی مر......اور دوسرے صفحے کی پہلی سطر میں ......اد آباد گیا ہے، تو ایک لمحے کے لیے آپ چونک جائیں گے، اگرچہ دوسرے ہی لمحے آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ:

"آپ کا بھائی آج مرادآباد گیا ہے۔"

۳- ہندی، فارسی اور عربی مرکبات کو یکجا لکھنا چاہیے، مثلاً:

ہندی مرکبات: دودھ والا، اَن پڑھ، کام چور، جیب گھڑی، مزے دار وغیرہ.....اکٹھے لکھے جانے چاہییں۔

فارسی مرکبات: خواب آور، خیال افروز، ضمیر فروش، دل سوز، خورونوش، ہوش و گوش، خونِ جگر، غنچۂ دل، جواں سال، لبِ شیریں، مردِ ناداں وغیرہ.....کو بھی یکجا لکھنا چاہیے۔

عربی مرکبات: عنداللہ، ماشاءاللہ، سبحان اللہ، مابہ الامتیاز، قصص الانبیا، تذکرۃ الشعرا.....اور اس قسم کے دوسرے الفاظ کو بھی ایک ہی سطر میں لکھنا چاہیے۔

٤- اُردو کے بعض مرکبات کئی کئی لفظوں سے مل کر بنتے ہیں، لیکن معنوی حیثیت سے مفرد ہوتے ہیں، جیسے:

- دودھ بیچنے والا۔
- ٹھیکہ لینے والے صاحبان۔
- ہل چلانے والے بوڑھے کسان۔

اس طرح کے مرکبات کو بھی ایک ہی سطر میں جگہ پانا چاہیے۔

۵- کوشش یہ کرنی چاہیے کہ اگر، مگر، سو، تو، جو قسم کے کلمات پر سطر ختم نہ ہو۔

٦- حرف جار: سے، کو، میں، نے، پر وغیرہ ہمیشہ اپنے مجرور یعنی قبل آنے والے اسما کے ساتھ لکھے جانے چاہییں، جیسے:

- لاہور سے۔ - بچے کو۔ - دن میں۔

- اس نے۔ - دیوار پر۔

ان حروف کو مجرور سے الگ کر کے دوسری سطر میں لکھنا درست نہ ہوگا۔

۷- جب کسی فعل کی نفی کے لیے نہ یا نہیں اور نہی کے لیے نہ یا مت کے الفاظ استعمال کیے جائیں گے تو یہ کلمات فعل کے ساتھ ایک ہی سطر میں لکھے جائیں گے، مثلاً:

- نہ کر - مت جا - نہ آیا نہ گیا -نہیں سنا

اس قسم کے فقروں میں فعل کو کلماتِ نفی کے ساتھ یکجا لکھا جائے گا۔

-ذیل میں چند ایسے مشہور اصول لکھے جاتے ہیں جن کی عام طور پر خلاف ورزی کی جاتی ہے۔آپ انہیں ذہن نشین کر لیجیے اور لکھتے وقت ان کا دھیان رکھیے:

.....''بہ'' خواہ لفظ کے شروع میں آئے، یا درمیان میں، اس کو الگ لکھنا چاہیے، جیسے:

بہ خدا، بہ نظرِ اصلاح، بہ آسانی، بہ کارِ خاص، بہ رنگِ غالب، بہ خوبی، بہ صد ادب، دم بہ دم، جا بہ جا، تن بہ تقدیر، جاں بہ لب، نام بہ نام، رو بہ قبلہ، حرف بہ حرف، نو بہ نو، لب بہ لب، صدا بہ صحرا۔

البتہ بجز، بجائے، بفضلہٖ، بہم، بغیر، بعینہٖ ...... یہ لفظ مستثنیٰ الفاظ کی حیثیت رکھتے ہیں، کیونکہ یہ مفرد لفظوں کی طرح بن چکے ہیں۔ان کو اسی طرح لکھا جائے گا۔

.....''بے'' کو بھی اگلے لفظ سے ملا کر نہیں لکھنا چاہیے، جیسے:

بے دماغ، بے وفا، بے کلی، بے لگام، بے وجہ، بے وقت، بے ہوش، بے ہوشی، بے نوا، بے نیاز، بے نظیر، بے کراں، بے کس، بے کسی، بے لاگ، بے مروّت، بے فائدہ، بے فکرا، بے طرح، بے قابو، بے قاعدہ، بے شرم، بے شمار، بے ڈھب، بے تاب، بے تابی، بے بس، بے باک، بے باکی، بے باق، بے جُرم، بے درد۔

.....''نہ'' کو بھی ملا کر نہیں لکھنا چاہیے، جیسے:

نہ کرو، نہ لکھو، نہ دیکھیں گے، نہ پوچھوں، نہ کہو، نہ جائے۔

.....اُن کو، اِس کو، مجھ کو، تجھ کو، اُس کو، مجھ سے، تجھ سے، اِن سے، ہم نے، اُنہوں نے، جب تک، کب تک، اب تک، ہم پر، اُس کو، اُس کا، اِن کا، کِس کا وغیرہ کو الگ الگ لکھا جائے گا۔

.....جو کلمے سابقوں یا لاحقوں کے طور پر کلمے کے شروع یا آخر میں آتے ہیں، اُن کو ملا کر نہیں لکھنا چاہیے، جیسے:

بیش تر، کم تر، خوش تر، (البتہ ''بہتر'' کو اسی طرح لکھا جائے گا) فن کار، قلم کار، دست کار، غارت

گر، ستم گر، کاری گر، بازی گر، طلب گار، خواست گار، کام گار، خدمت گار، نیل گوں، گل گوں، مدیگ زار، طرب زار، زعفران زار، باغ بان، فیل بان، گاڑی بان، نگہ بان، پری وش، ماہ وش، نام ور، طالع ور، سخن ور، خوف ناک، ہیبت ناک، نم ناک، تاب ناک، شرم ناک، رزم گاہ، تخت گاہ، عبادت گاہ، غم کدہ، بت کدہ، آتش کدہ، صنم کدہ، توپ خانہ، مے خانہ، بت خانہ، خم خانہ، شراب خانہ، ڈاک خانہ، مہمان خانہ، خاص دان، قلم دان، پان دان، روشن دان، دانش مند، عقل مند، حاجت مند، دولت مند، ان جان، ان پڑھ، ان داتا، ان ہونی، شاہ کار، شاہ راہ، شاہ باز، شاہ خرچ، شاہ رگ۔

.....درج ذیل کلمات بھی الگ لکھے جاتے ہیں۔ ان کو ملا کر نہ لکھنا چاہیے:

گل بدن، گل فام، گل رنگ، گل رخ، گل قند، نیم خواب، نیم باز، یک مشت، یک دل، غلط نامہ، سال نامہ، فال نامہ، اہل کار، آب دیدہ، خوب صورت، خوب رو، خوش حال، خوش بو، خوش خبری، دھرم شالا، دل دادہ، دل کش، دل گیر، دل پذیر، دل دہی، ذی روح، ذی شان، زبان داں، زیاں کار، شب خون، شب چراغ، صاحب دل، صاحب قرآن، صبح دم، طالب علم، عالی جناب، خوش خط، رس گلا، راج دلارا، راج کمار، کان پور، جون پور، غازی پور، سکھ پال، سنگ دل، سال گرہ وغیرہ۔

– جو کچھ لکھیے اس پر آخر میں نظر ثانی ضرور کر لیجیے۔ اس سے جہاں بہت سی اغلاط کا ازالہ ہو جاتا ہے اور تحریر بہتر سے بہتر ہو جاتی ہے وہیں بسا اوقات آدمی ندامت اور پشیمانی سے بھی بچ جاتا ہے۔

مشق

۱- پانچ سطر میں تحریر کے سب سے پہلے ادب "خوش نویسی" کی اہمیت ذکر کریں۔

۲- حروف تہجی لکھنے کے تین رخوں کی وضاحت اور ہر ایک کا بنیادی ضابطہ ذکر کریں۔

۳- دندانے، شوشے اور نقطے کی وضاحت مع ضابطہ ذکر کریں۔

٤- لفظوں کے جوڑ توڑ سے متعلق ضوابط کا خلاصہ چند سطروں میں لکھیے۔

۵- ان دو اسباق میں ذاتی طور آپ کی جن اغلاط کی اصلاح ہوئی ان میں تحریر کیجیے۔

تحریر کے مقاصد

تحریر لکھنے کے لیے کوئی محرک یا وجہ ہوتی ہے اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ مقصد کے بغیر لکھی گئی تحریر اس جسم کی مانند ہوتی ہے جس میں روح نہ ہو۔ اس لیے تحریر لکھنے سے پہلے مقصد کا تعین کر لینا چاہیے۔ اس سے نہ صرف تحریر جاندار بن جاتی ہے بلکہ لکھاری کے خیالات و افکار پوری تاثیر کے ساتھ قارئین تک رسائی پاتے ہیں۔ سب سے پہلا اور بنیادی مقصد اللہ کی رضا، اپنی اور قارئین کی اصلاح اور عامۃ الناس تک دین کی دعوت پہنچانا ہے۔ اس مقصد کو ذہن نشین کر لیجیے۔ دل کی دھڑکنوں میں اتار لیجیے۔ اس کے بعد ذیل میں چند سوال دیے جا رہے ہیں جن کے سہارے لکھاری اپنے مقاصد کے تعین میں مدد لے سکتا ہے:

— آپ کس مقصد کے لیے لکھنا چاہتے ہیں؟

— جن افراد یا معاشرے کے لیے آپ تحریر لکھنے جا رہے ہیں، ان کی ذہنی استعداد اور نقطۂ نظر کیا ہے؟

— آپ جس مقصد کا تعین کر چکے ہیں، کیا وہ واضح ہے اور دوسرے اسے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں؟

— آپ جس مقصد کے لیے لکھ رہے ہیں، وہ قابلِ عمل یا قابلِ حصول ہے؟

ان سوالات کی مدد سے ایک نو آموز لکھاری تحریر کے مقاصد کا تعین از خود کر سکتا ہے۔ اس کی تھوڑی سی مدد ہم بھی کیے دیتے ہیں۔ غور سے سنیے!

تحریر کے تین مقاصد:

عام طور پر تحریر کے تین مقاصد بیان کیے جاتے ہیں:

۱۔ معلومات فراہم کرنا۔ ۲۔ دعوت و تبلیغ۔ ۳۔ تفریح مہیا کرنا۔

در اصل ان میں سے مقصد کا لفظ صرف پہلے دو پر صادق آتا ہے۔ تیسری چیز بذاتِ خود مقصود نہیں، یہ پہلے دو مقاصد کی تکمیل اور حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ تحریر میں شگفتہ مزاح اور سنجیدہ ہو یا سچی

طنز ہو تو اس کے ضمن میں کام کی بات بہت خوبی سے کہی جا سکتی اور بہت آسانی سے قاری کے دل میں اتاری جا سکتی ہے۔

یہ تینوں مقاصد آپس میں متباین نہیں کہ جہاں ایک ہو، دوسرے کا گزر نہ ہو سکے۔ یہ تینوں کسی تحریر میں بیک وقت اکٹھے بھی ہو سکتے ہیں۔ جیسے اعداد و شمار اور حقائق و واقعات پر مشتمل ایک مستند معلوماتی تحریر جس میں کہیں کہیں طنز و مزاح کی چاشنی بھی ہو، دعوت و ترغیب کا بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔ ایسی تحریر بیک وقت ان تینوں مقاصد کی حامل ہوگی اور معیاری اور مقبول تحریر قرار پائے گی۔ لہٰذا لکھاری کو چاہیے کہ:

- اپنی نیت صاف، مقصد بلند اور عزم کو پختہ رکھے۔
- ادبی محاسن اور شگفتہ اسلوبِ تحریر سیکھنے کے لیے جان توڑ محنت کرے۔
- اپنی تحریر میں مستند معلومات کی فراہمی کے ذریعے عوام الناس کی ذہن سازی اور نظریاتی تربیت کو مدنظر رکھے۔ سفلی مقاصد اور عامیانہ جذبات سے خود کو پاک اور قلم کو محفوظ رکھے۔

یہ چیزیں دنیوی و اخروی کامیابی کی ضمانت ہیں۔

تحریر کے عناصر

آسان الفاظ، مختصر جملے، مربوط پیرے

کسی بھی چیز کا ''عنصر'' اس کے وہ بنیادی اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں جن کے باہمی ارتباط سے وہ چیز وجود پاتی ہے۔ اب آگے بڑھنے سے پہلے ہم آپ کو تحریر کے تین عناصر کے بارے میں رہنمائی دیتے چلتے ہیں۔ تحریر کے تین عناصر یہ ہیں: (۱) الفاظ، (۲) جملے، (۳) پیراگراف۔

آپ کو ان تین کے حوالے سے یہ چار باتیں معلوم ہونی چاہییں:

– الفاظ کس طرح منتخب کرنے چاہییں؟
– جملوں میں الفاظ کی ترتیب کیسی ہونی چاہیے؟
– جملوں سے پیراگراف کیسے بنیں گے؟
– ان تینوں کو ملا کر تشکیل دیتے وقت کون سا اسلوب اپنایا جائے گا؟

ذیل میں کچھ تجاویز پیش کی جاتی ہیں جو مذکورہ بالا تین امور کو واضح کرنے میں معاون ثابت ہوں گی:

الفاظ:

طالب علم جس زبان میں تحریر لکھ رہا ہے، اس کے پاس اس زبان کا ذخیرۂ الفاظ اتنا وسیع ہونا چاہیے کہ جب بھی اس کے دل میں کوئی معنی یا نکتہ آئے تو اس کو تحریر کے دائرے میں لانے کے لیے مناسب الفاظ مل سکیں۔ پھر اگر یہی معنی بار بار آ رہا ہے تو اس کا حافظہ اس کے لیے کئی مترادف الفاظ بھی فراہم کر سکے۔

قدیم اور نئے وجود پذیر الفاظ کے بجائے رائج الوقت واضح الفاظ استعمال کرنے چاہییں۔ طالب علم کو یہ جان لینا چاہیے کہ لفظی تعقیدات اور نامانوس الفاظ کا استعمال تحریر کو خشک و بے جان

بنانے اور قارئین کو ذہنی مشقت میں ڈالنے کا سبب بنتے ہیں اور ہموار راستے میں پڑے ہوئے ایسے پتھر کی طرح ہوتے ہیں جن کی وجہ سے تحریر نگار کے ساتھ چلنے والا بہت جلد تھک جاتا ہے۔اس لیے تحریر نگار کو یہ بات پلّے باندھ لینی چاہیے کہ نامانوس الفاظ اور پیچیدہ تراکیب استعمال نہ کرے۔

جملے:

جملے کو کم سے کم الفاظ میں لکھنا چاہیے۔مختصر جملوں میں جو کاٹ ہے، وہ طویل جملے میں نہیں ہوسکتی۔اگر کوئی معنی آٹھ لفظوں میں سمویا جاسکے تو اسے دس الفاظ میں نہیں لکھنا چاہیے۔

طالب علم جس جملے کو لکھ رہا ہے، اُس کی پہلے جملوں کے ساتھ مطابقت کا خیال رکھے۔فعل اور فاعل یا مبتدا اور خبر کے درمیان فاصلہ بہت کم ہونا چاہیے تاکہ قارئین جملے کے دونوں اجزا یا لفظ اور اس کے متعلقات کے درمیانی ربط کو بآسانی سمجھ سکیں۔خلاصہ یہ کہ چھوٹے جملے عموماً لمبے جملوں سے بہتر اور زیادہ جاندار و کاٹ دار ہوتے ہیں۔

پیراگراف:

پیراگراف ایک ایسی مستقل تحریر ہے جس کے لیے عنوان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر یہ پیراگراف دوسرے چند پیراگرافوں سے مل کر ''مضمون'' بنتا ہے جس کا الگ عنوان ہوتا ہے اور چند ''مضامین'' مل کر ''کتاب'' بن جاتے ہیں۔

پیراگراف ایک ہی مفہوم یا حقیقت کو ظاہر کرنے یا ایک ہی نکتے یا معنی کی تشریح کے لیے چند جملوں پر مشتمل ایک ایسا مجموعہ ہوتا ہے جن کے درمیان مضبوط تعلق اور واضح ربط ہوتا ہے۔

پیراگراف میں ایسی وحدت اور استقلال ہونا چاہیے جس کی وجہ سے اسے ایک چھوٹا سا مضمون یا ''مضمون کے اندر مضمون'' کہا جاسکے، لہٰذا اس میں استقلال کے تمام عناصر موجود ہونے چاہییں۔یعنی وہ ایک متعین نکتے کی وضاحت کرتا ہو اور ایک واضح نتیجہ دے سکتا ہو۔

پیراگراف کی طوالت متوسط ہونی چاہیے۔بہت زیادہ لمبا یا بہت چھوٹا نہیں ہونا چاہیے۔البتہ عام طور پر اس کے لمبے ہونے سے اس کا چھوٹا ہونا ہی بہتر ہوتا ہے۔

پیراگراف کی ترتیب تسلسل پر مشتمل اور منطقی ہونی چاہیے۔مطلوبہ مقصد کو بیان کرنے کے

لیے ہر جملہ اپنے سے پہلے جملے پر مبنی اور اگلے جملے کے لیے تمہید ہو۔

اسی طرح ہر دو پیراگرافوں کے درمیان بھی ایسا ربط ہونا چاہیے کہ ہر پیرے کا پچھلے پیرے سے کوئی نہ کوئی تعلق ہو، کیونکہ تمام پیراگراف ایک ہی ''مرکزی عنوان'' کی تشریح اور توضیح کے لیے ہوتے ہیں۔

اسلوب:

''اسلوب'' کا لفظ عموماً ''عبارت کی روانی، تسلسل اور اس میں تعقید نہ ہونے'' کے لیے استعمال ہوتا ہے...... لیکن ''اسلوب'' کا ایک اور عام معنی بھی ہے جس میں تحریر کا اچھا خاکہ بنانا، مواد کو اچھے انداز میں پیش کرنا، تحریر کے نتائج کا واضح ہونا اور ہر وہ چیز جو تحریر کا معیار بلند کرنے میں مؤثر ہو، وغیرہ چیزیں شامل ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے اسلوب میں درج ذیل امور کا خیال رکھنا ضروری ہے:

- قافیہ بندی اگر بے تکلف ہو اور وقفے وقفے سے ہو تو بہت اچھا رہتا ہے۔ اسی طرح جڑواں جملے بھی اچھے لگتے ہیں۔

- یہ بھی خیال رہنا چاہیے کہ معانی کا تکرار اور ایک ہی نکتے کے بارے میں ایک سے زائد جگہ پر گفتگو کرنا انتہائی درجے کا عیب سمجھا جاتا ہے۔

- بہترین اور عمدہ اسلوب کی ایک علامت یہ ہے کہ جملوں کے درمیان ایسا ربط ہو کہ ان میں سے ہر جملہ اگلے جملے کے ساتھ پیوست اور مربوط ہو۔

- ایک علامت یہ ہے اس میں ایسا اختصار ہو قارئین جتنا پڑھتے رہیں، انہیں اتنی ہی نئی نئی چیزیں ملتی رہیں۔ تحریر نگار جس نکتے کی تشریح کر رہا ہے، اس کے واضح ہو جانے کے بعد ایک سطر بھی مزید نہیں لکھنی چاہیے، بلکہ اسے چاہیے کہ اگلی بات شروع کر کے قارئین کی توجہ دوسرے نکتے کی طرف پھیر دے۔

جب بھی آپ کوئی تحریر لکھ کر فارغ ہو جائیں تو آپ کو چاہیے کہ اس کا اسلوب جانچنے کے لیے اسے بلند آواز سے پڑھیں تاکہ جملوں کے درمیان مناسبت دیکھ سکیں اور الفاظ وتراکیب کی آپس میں ہم آہنگی اور جملوں کے ربط وتسلسل سے مطمئن ہو جائیں۔

مشق

۱-تحریر اور مقصدیت پر مختصر نوٹ لکھیں۔
۲-تحریر کے تین مقاصد مختصر وضاحت کے ہمراہ لکھیں۔
۳-تحریر لکھتے ہوئے سفلی اور عامیانہ مقاصد کیا ہو سکتے ہیں؟
٤-تحریر کے تین عناصر مختصراً لکھیں۔
۵-اسلوب کیا ہے؟ اور کیسے حاصل ہوتا ہے؟

پہلا باب

لکھنے سے پہلے

(مبادیات، لوازمات، انتباہات)

تحریر کے مراحل

- ......لکھنے سے پہلے
- ......لکھنے کے دوران
- ......لکھنے کے بعد
- ......اشاعت سے پہلے اور بعد
- ......تحریر کا مواد حاصل کرنے کے ذرائع
- ......مواد محفوظ کرنے کے ذرائع
- ......تحریر کی ظاہری خوبیاں

اردو املا

چند متفرق قواعد

اردو کے رموز واوقاف

- ......بند سازی
- ......تحریر کی معنوی خوبیاں

تحریر کے مراحل

جب کوئی تحریر لکھی جاتی ہے تو لکھنے کے عمل کے آغاز سے اختتام تک چند مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ تحریر کا معیار، افادیت اور قبولیت ان مراحل سے خوش اسلوبی سے گزر جانے پر موقوف ہوتی ہے۔ یہ مراحل فطری اور عقلی و منطقی ترتیب کے اعتبار سے بالترتیب یہ ہیں:

(۱) لکھنے سے پہلے (۲) لکھنے کے دوران (۳) لکھنے کے بعد۔

پہلے مرحلے میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ "کیا لکھا جائے؟"

دوسرے میں یہ طے پاتا ہے کہ "کیسے لکھا جائے؟"

تیسرے میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ "لکھے ہوئے کو بہتر سے بہتر کیسے بنایا جائے؟"

ذیل میں تینوں مدارج سے متعلق کارآمد تجاویز، تکنیکی ضروریات اور عملی اقدامات کو بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ لکھنے سے پہلے

تحریر سے پہلے تحریر نگار کو دو فیصلے کرنے پڑتے ہیں:

ایک تو "صنفِ تحریر کے انتخاب" کا فیصلہ کہ تحریر نگار کا مزاج اور مذاق تحریر کی کس صنف کی طرف طبعی رجحان اور میلان رکھتا ہے؟ اسے تحقیقی مضامین و مقالات پسند ہیں یا اخباری کالم؟ کہانی لکھنے میں اس کا دل لگتا ہے یا قصہ و افسانہ و ناول میں اس کی طبیعت رواں ہوتی ہے؟

دوسرے "موضوع کے انتخاب" کا فیصلہ کہ متعلقہ صنف کے منتشر موضوعات میں سے کون سا موضوع اسے اپنے فطری رجحانات اور طبعی میلانات سے قریب محسوس ہوتا ہے؟

یہ دو فیصلے کرنے کے بعد عملی کام شروع کرنے سے پہلے اسے دو ذہنی حصوں سے گزرنا پڑتا ہے: سوچ و بچار اور ذہنی تیاری۔ تو آئیے! ان دو فیصلوں کو کرنے اور دو ذہنی حصوں کو نبھانے کا طریق کار سیکھتے ہیں۔

دو اہم فیصلے

۱-صنفِ تحریر کا فیصلہ:

انسان حیوان ناطق ہے۔ وہ اپنے خیالات وجذبات کا اظہار لفظوں کے ذریعے، بول کے یا لکھ کر کرتا ہے تاکہ دوسرے اس کا مفہوم پوری طرح سے سمجھ لیں۔ الفاظ کے ذریعے اظہار کی دو صورتیں ہیں۔ ایسا اظہار جس میں الفاظ کی ترتیب میں کوئی توازن، ہم آہنگی یا ردھم موجود ہو ''نظم'' کہلاتا ہے اور الفاظ کی ایسی ترتیب جس میں توازن، ہم آہنگی یا ردھم جیسا وصف نہ پایا جائے ''نثر'' کہلاتا ہے۔ اصنافِ نثر کو دو اہم حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ادبی اصنافِ نثر: جس میں انشائیہ مضمون، مقالہ، خاکہ، سوانح نگاری، آپ بیتی، داستان، ناول، افسانہ اور تنقید وتحقیق وغیرہ شامل ہیں۔

صحافتی اصنافِ نثر: اس میں خبر، اداریہ، کالم، فیچر، ترجمہ اور تبصرہ وتلخیص وغیرہ آتے ہیں۔

مندرجہ بالا اصنافِ نثر اپنی ساخت، ہیئت اور تکنیک کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ ہر صنف اپنی مخصوص تکنیک رکھتی ہے۔ لکھاری جس صنف تحریر میں لکھنا چاہتا ہے، اس کے بارے میں اسے علم ہونا چاہیے کہ اس صنف کی ساخت، ہیئت اور تکنیک کیا ہے؟ کون سی صنف اس کے مقصد اور موضوع سے فطری میلان رکھتی ہے؟ کس صنف میں وہ اپنی معلومات کو بہترین انداز میں پیش کرسکتا ہے؟ یہ اس کے علم میں ہونا ضروری ہے، تاکہ اس کے جذبات، احساسات اور معلومات کی ترسیل جامع، مدلّل اور مؤثر انداز میں ہو۔ اصنافِ تحریر کی ساخت، ہیئت اور تکنیک سے متعلق محترم اساتذہ کرام نے اپنی مختلف کتب میں ہر صنف کے بارے میں تفصیل سے بیان کردیا ہے۔ لکھاری ان کتب سے استفادہ کرکے اپنی پسندیدہ صنف میں مہارت پیدا کرسکتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب کے اصل مآخذ ''لکھنا سیکھیے'' نامی کتاب میں بھی نثر کی اہم اصناف کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ کالم ومضمون نویسی کی ساخت وہیئت اور اصول وآداب آگے تفصیل سے آرہے ہیں۔ ان کا لحاظ رکھ کر مشق کی جائے ان شاء اللہ آپ بھی اچھے لکھاری

اور بہترین داعی بن سکتے ہیں۔

۲-ذہنی تیاری:

کوئی بھی تحریر لکھنے سے پہلے ذہنی طور پر تیار ہونا ہی دراصل بہترین تحریر کی ضمانت ہے۔اگر ذہن منتشر ہوگا، خیالات مبہم اور سوچ میں شکوک وشبہات ہوں گے تو ایسی ذہنی حالت کی جھلک تحریر میں در آئے گی۔ چونکہ تحریر لکھنے والے کی ذہنی حالت کی عکاس ہوتی ہے،اس لیے لکھنے سے پہلے تمام تر انتشار، ابہام اور شکوک وشبہات کو ختم کر کے یقین، اعتماد، توکل علی اللہ اور تفویض الی اللہ کی پختگی حاصل کر لی جائے، تاکہ تحریر مؤثر، مدلّل اور واضح ہو۔ منتشر اور بے سکون ذہن میں خیالات بھی انتشار زدہ ہوتے ہیں، جبکہ پُرسکون ذہن میں خیالات نہ صرف منظم اور خوبصورت ہوتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے تحریر نگاری کے شروعات میں آپ کے اندر کا خوف کئی صورتوں میں سامنے آئے۔ مثلاً: میں یہ کام نہیں کرسکتا، مجھ میں صلاحیت نہیں ہے، میں ذہنی طور پر کمزور ہوں، یہ کام میرے بس کا نہیں، وغیرہ وغیرہ۔ ان سارے اعتراضات کا بھرپور جائزہ لیں۔ چونکہ اللہ کے فضل وکرم سے ایسا کچھ نہیں ہے۔ آپ دین کی دعوت جیسے عظیم مقصد کے لیے ایک مفید فن سیکھنا چاہتے ہیں اور دین کے داعی کے ساتھ اللہ رب العالمین کی مدد ہوتی ہے، اس لیے ان وسوسوں کو اپنے من سے حرف غلط کی طرح مٹادیں اور پرسکون ہوکر دل کی گہرائیوں سے اللہ کی طرف رجوع کر کے خلوص نیت کے ساتھ قلم کاری کی شروعات کریں۔ اپنے اکابرین کا یہ مقولہ ایسا ذہن نشین کرلیں کہ مزاج اور طبیعت بن جائے:

''ہرکام کے شروع میں ''رُجوع الی اللہ'' کا بطورِ خاص اہتمام کرو، کام کے درمیان میں اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے رہا کرو اور کام کے اختتام پر شکر کی عادت ڈالو جس کی بہترین شکل استغفار ہے۔''

آپ یہ عادت بنالیں کہ کام کے شروع میں ''تصحیح نیت'' اور درمیان میں ''طلبِ نصرت'' کرتے رہا کریں۔ آخر میں شکر واستغفار سے بھی غافل نہ ہوں۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کے کاموں میں غیبی برکت ونصرت شامل حال ہوگی اور مشکلات ورکاوٹوں میں اللہ آپ کا حامی وناصر ہوگا۔

دو ذہنی مشقیں

۱-سوچ و بچار:

تحریر دراصل اس سوچ وفکر کے لفظی اظہار کا نام ہے جو قلم کار کے ذہن کے نہاں خانوں سے ابھرتی اور قلم کی نب سے گزر کر صفحات پر نقوش بکھیرتی ہے۔ فکر کی بلند پروازی اور نظر کی وسعت وعمق وہ چیز ہے جس کی بنا پر کسی تحریر میں معلومات اور نظریات نمو پاتے ہیں اور اس کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں، لہٰذا جس قدر سوچ و بچار میں گہرائی اور گیرائی ہوگی، تحریر فکری ونظری اعتبار سے اسی قدر بلند پایہ قرار پائے گی۔ سوچ و بچار کے عمل سے تحریر کا ''مرکزی خیال'' اور اس کے ''معاون خیالات'' یا دلائل وشواہد ڈھونڈے جاتے ہیں۔ قلم ہاتھ میں لینے اور کاغذ سامنے رکھنے سے پہلے گہرے غور وفکر کے عمل کے ذریعے موضوع اور مرکزی ومعاون خیالات کا تعین کر لینا ضروری ہے۔

۲-موضوع کا انتخاب:

تحریر نگار کے لیے موضوع کی تلاش سب سے اہم مسئلہ ہوتا ہے۔ کیونکہ موضوع ہی وہ بنیاد ہے جس پر تحریر کی عمارت اٹھائی جاتی ہے اور پھر اسی عمارت کی تزیین و آرائش ہوتی ہے۔ اگر چہ نو آموز لکھاری کے لیے یہ سب سے مشکل مرحلہ ہوتا ہے، لیکن یہ جس قدر مشکل معلوم ہوتا ہے اسی قدر آسان بھی ہے۔ لکھاری اگر دو کام کر لیتا ہے تو وہ اس مشکل گھاٹی کو آسانی سے عبور کر لے گا۔

سب سے پہلے اپنے اندر کی نیت، تحریک اور مقاصد کا تعین کر لے۔

اس کے بعد وہ موضوع تلاش کرنے کے چار گُروں (مطالعہ، مشاہدہ، مکالمہ، سماعت) کی عادت بنا لے جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔ ان چاروں کو اپنے معمولاتِ یومیہ میں شامل کرے اور اپنے بیشتر اوقات کو ان چاروں کاموں میں صرف کرے۔

ایسا کرنے سے نہ صرف یہ کہ موضوع کا انتخاب مشکل نہیں رہ جاتا بلکہ تحریر کے لیے درکار مواد کی فراہمی بھی کوئی مسئلہ نہیں رہتی۔صرف ایک جھجک سی رہ جاتی ہے جس کو دور کرنے کے لیے ہم نئے سیکھنے والوں کے لیے موضوع کے انتخاب کے چند طریقے بیان کرتے ہیں۔ان طریقوں کے مطابق سوچ و بچار کرنے.....اور کرتے رہنے.....سے ان شاءاللہ بے شمار موضوع ہاتھ آتے جائیں گے۔

پہلا طریقہ:

ایک آسان طریقہ جس سے موضوع کی تلاش میں مدد مل سکتی ہے، یہ ہے کہ لکھاری اپنے آپ سے یہ سوال کرے:

- میرے پاس کس موضوع پر ایسی کون سی معلومات ہیں جو مجھے دوسروں کو بتانی چاہییں؟
- میرے سامنے کوئی ایسا واقعہ یا حادثہ ہوا جس نے مجھے بے حد متاثر کیا؟
- آخر اس واقعے میں ایسا کیا تھا جس نے مجھے متاثر کیا اور وہ دوسروں کو متاثر کر سکتا ہے؟
- کیا مجھے محض معلومات کا پلندہ ہی لوگوں تک پہنچانا ہے یا کوئی خاص تخیل، سوچ یا تصور کا اظہار بھی کرنا ہے؟
- مجھے کوئی بامقصد تحریر لکھنا ہے یا محض تفریح طبع کے لیے نوک قلم کو کاغذ کی سطح پر گھسیٹے دیے جا رہے ہیں۔

ان چند سوالوں کے جواب میں کوئی نہ کوئی مفید عنوان سامنے آ جائے گا اور اسی سے ہی ایک اچھا موضوع دستیاب ہو جائے گا۔

دوسرا طریقہ:

آپ اگر اپنے آس پاس دیکھیں تو زندگی کے ان گنت پہلو دیکھنے کو ملیں گے۔ان کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔بعض پہلو ایسے ہوتے ہیں جن سے انسان بے حد لگاؤ رکھتا ہے، بعض ایسے ہوتے ہیں جن سے کسی حد تک دلچسپی ہوتی ہے اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو پسندیدگی کے زمرے ہی میں نہیں آتے۔فرض کریں یہ چند موضوعات ہیں:

-سیرت-تاریخ-سیاست-تاریخی آثار-سائنسی تحقیقات-معیشت-معاشرت-نفسیات

-ثقافت-سیاحت-علوم وفنون-اصلاحِ معاشرہ-روحانی واخلاقی بیماریاں-نت نئے فتنے۔

جب آپ ان پر غور کریں گے تو ان میں سے کوئی ایک موضوع آپ کو اپنے دل ودماغ سے زیادہ قریب محسوس ہوگا۔ پھر اس پسندیدہ پہلو پر مزید غور کریں گے تو کئی ضمنی سوال اور شقیں آپ کے سامنے آجائیں گی۔ مثال کے طور پر معاصر عالمِ اسلام کے حالات یا اسلامی آثارِ قدیمہ سے متعلق تحقیقات آپ کا پسندیدہ موضوع ہے۔ جب آپ اس پر سوچیں گے تو ان دونوں موضوعات پر مندرجہ ذیل سوال سامنے آجائیں گے:

۞ عالم اسلام کی حدود کیا ہیں؟ اس برادری میں کون کون سے ملک شامل ہیں؟ ان ممالک میں کون کون سے ترقی یافتہ، کون سے ترقی پذیر اور کون سے پسماندہ ہیں؟ ان خوشحال ممالک کے وسائل کیا ہیں اور وہ ترقی پذیر یا پسماندہ مسلم ممالک کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے میں کس طرح تعاون کر سکتے ہیں؟ پسماندہ ممالک کی بدحالی کے اسباب کیا ہیں اور ان کا حل کیسے نکالا جاسکتا ہے؟ انہیں کب آزادی ملی؟ ان میں کسی پر کوئی عالمی وجبری طاقت اثر انداز ہے؟ اس کے مقابلے میں کون سی شخصیت یا جماعت قربانیاں دے رہی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

۞ اب تک کتنی قسم کی اثری تحقیقات ہو چکی ہیں؟ ان تحقیقات کے نتیجے میں کیا انکشافات سامنے آئے؟ تاریخ شناسی وسبق آموزی کے لیے ان کی ضرورت واہمیت کس قدر ہے؟ ان تحقیقات سے ماضی قدیم کے انسان کی کون سی خوبی اور کمزوری سامنے آئی؟ ہمارے ملک میں کن آثار پر تحقیق ہو رہی ہے؟ یہ تحقیقات کس نوعیت کی ہیں؟ اثری تحقیقات کا طریقِ کار کیا ہے؟ ان کی وسعت کس قدر ہے؟ ان پر آنے والے اخراجات کی مد کتنی ہے؟ وغیرہ وغیرہ ایسے سوال ہیں کہ ہر سوال سے اگلا سوال جنم لے گا اور سوالات کا سلسلہ پھیلتا چلا جائے گا۔ یہی سوالات دراصل موضوع کا خاکہ اور اس کے اصل خدوخال ہیں، بلکہ موضوع ہی ہیں۔

تیسرا طریقہ:

ذیل میں موضوع کی تلاش کے لیے چند اشارے دیے جا رہے ہیں جن سے کوئی بھی نوآموز لکھاری استفادہ کر سکتا ہے:

● قومی اور بین الاقوامی خبریں ● ادبی، سیاسی، ثقافتی اور سماجی تقریبات
● اہم شخصیات یا قومی سطح کے مذہبی و سیاسی رہنماؤں کے معاملات و معمولات
● جرائم اور معاشرتی برائیاں: نقصانات و تجاویز ● حادثات و تصادم: اسباب و علاج
● دنیا کے مختلف حصوں میں جنگیں ● قومی مسائل اور ان کا حل
● غربت، مہنگائی اور بے روزگاری کا خاتمہ کیسے؟ ● ایجادات، دریافتیں اور اہم انکشافات
● خلائی تحقیق ● علاقائی و عالمی امن وامان کے لیے کوششیں ● اسلحہ کی دوڑ
● مشرق و مغرب کے درمیان کشمکش ● حق و باطل کے درمیان معرکہ آرائی
● دنیا کے مختلف خطوں کے مسائل اور بحران ● عالمی سیاست برائے اقتصادی و عسکری غلبہ
● بین الاقوامی اور علاقائی معاہدے ● دنیا کی عالمی تنظیمیں اور ان کی کارکردگی
● مختلف ممالک کے وفودی تبادلے اور ان کے اثرات ● سفارتی تعلقات
● خارجہ پالیسی کے خدوخال ● علاقائی بالادستی کے رجحانات ● نسل پرست عالمی استعمار
● موسم، زلزلے، طوفان اور وبائیں ● غار اور چوٹیاں سر کرنے کے لیے مہم جوئی
● سیر و سیاحت ● عوامی مسائل ● ملکی بجٹ ● فوجی اور سیاسی انقلاب
● خانہ جنگی ● تیسری عالمی جنگ کے ممکنہ خطرات ● جاسوس ادارے اور ان کی سرگرمیاں
● اقوامِ متحدہ کی قلابازیاں ● این جی اوز کی حشر سامانیاں ● عیسائی مشنریوں کی چیرہ دستیاں
● یہودی تنظیموں کی کارستانیاں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح کے ایسے بے شمار موضوعات ہیں جن پر طبع آزمائی کی جاسکتی ہے۔ آپ جب اخبارات کے ادارتی صفحے پر کوئی کالم یا رسائل و جرائد میں کوئی مضمون پڑھیں تو غور کریں وہ درجِ بالا موضوعات میں سے کسی ایک سے تعلق رکھتا ہوگا۔ لکھنے والے اپنے اپنے طبعی رجحان کے مطابق ان میں سے ہی کسی ایک موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔ جب دوسرے لوگ اپنے فانی مقاصد کے لیے ان موضوعات پر خامہ فرسائی کر کے سفلی اہداف (پیٹ پالنا، شہرت کمانا، اپنا آپ دکھانا یا عادت پوری کرنا) حاصل کرنے کی جدوجہد کر سکتے ہیں تو آپ ایک اعلیٰ ترین مقصد کے لیے ضرور ایسا کر سکتے ہیں۔ بس ضرورت اچھی نیت اور بلند ہمت کی ہے۔

چوتھا طریقہ:

تحریر کے مختلف دائرہ کار اور حدود ہوتی ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے سے موضوع کی کھوج لگائی جاسکتی ہے۔ مثلاً:

۱- آپ موضوعات کو علاقائی، قومی اور عالمی سطح میں تقسیم کرکے ان تینوں میں سے اپنی پسند کے دائرہ کار کو تحریر کے لیے منتخب کر سکتے ہیں۔

۲- انسانی زندگی کے چار طبقات ہوتے ہیں: بچے، خواتین، نوجوان اور عام لوگ۔ ان چاروں کی دلچسپی کے موضوعات کیا ہیں؟ آپ ان میں سے کسی ایک پر طبع آزمائی کر سکتے ہیں۔

۳- حبِ اسلام اور حبِ وطن دو نہایت قابل قدر جذبے ہیں۔ ان پر لکھی گئی تحریر اگر فنی تقاضوں پر پوری اترے تو قارئین میں نہایت مقبول ہوتی ہے۔ آپ بھی یہ دو موضوع آزما سکتے ہیں۔ مثلاً آپ سوچیے کہ اسلام کی تبلیغ، دشمنانِ اسلام کے اعتراضات اور پھیلائے گئے فرسودہ نظریات کے جواب میں آپ کیا کر سکتے ہیں؟ وطن کے تحفظ کے تقاضے کیا ہیں؟ دشمنانِ وطن کے منصوبوں سے قارئین کو کیسے آگاہی دی جاسکتی ہے؟ اس سلسلے میں حکمران، انتظامیہ، عدلیہ، عوام اور قارئین کیا کر سکتے ہیں؟ ان سوالوں کے جوابات سے ایک اچھی تحریر وجود میں آسکتی ہے۔

پانچواں طریقہ:

آج کل ایسے لکھاریوں کی کمی ہے جو عالمِ اسلام کی مشترکہ زبان عربی جانتے ہوں اور مختلف بین الاقوامی ویب سائٹس پر عربی میں دیے گئے مضامین، مقالات، تجزیے اور تجاویز کی مدد سے کالم لکھ کر عالمِ اسلام کو قریب لانے، ایک دوسرے کے مسائل سمجھنے اور انہیں حل کرنے میں مدد دینے کا فریضہ انجام دے سکیں۔ آپ قدیم اور اصل عربی میں رسوخ پیدا کیجیے اور جدید عربی سے بھی خاطر خواہ واقفیت حاصل کرکے اس کے مطالعے کا معمول بنائیے۔ ''ترجمہ وتعریب'' یعنی عربی سے اردو اور اردو سے عربی ترجمے میں مہارت حاصل کیجیے۔ اس کے بعد عربی کی ویب سائٹس دیکھتے رہیے۔ آپ کو کبھی بھی اجتماعی، ملی، اور اصلاحی موضوعات اور ان کے لیے درکار مواد کی کمی کا شکوہ درپیش نہ ہوگا۔

مشق

۱-قبل از تحریر امور میں ذہنی تیاری کو کیا دخل ہے؟
۲-ذہنی تیاری سے متعلق متفرق باتوں کی تلخیص نکتہ وار کریں۔
۳-موضوع کا انتخاب کیسے کیا جاتا ہے؟ مختصرا لکھیں۔
٤-تحریر میں تصحیح نیت اور طلب نصرت کی اہمیت لکھیں۔
۵-انٹرنیٹ بحیثیت ذریعہ مواد پر مختصر نوٹ لکھیں۔

۲۔ لکھنے کے دوران

لکھاری کو دورانِ تحریر ان مدارج سے سابقہ پڑتا ہے:

پیشِ تحریر(Pre-writing,Manuscrip):

پیشِ تحریر جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، تحریر سے پہلے کا قدم ہے جس میں تحریر کی ''خاکہ سازی'' اور ''منصوبہ بندی'' کی جاتی ہے۔ آپ کے ذہن میں جو اچھوتا خیال آیا ہے اور آپ اسے تحریر کرنا چاہ رہے ہیں، پیشِ تحریر اس خام خیال (یا خیالات) کو منضبط اور مرتب کا نام ہے۔ اس میں ذہنی برانگیخت (برین اسٹیرنگ) کی تکنیک کے ذریعے ذہن کو متعلقہ خیال یا موضوع پر مرکوز کرتے ہوئے ذہن میں آنے والے مزید خیالات کی فہرست بنائی جاتی ہے۔ ان کو ترتیب دیا جاتا ہے۔ کم اہم یا غیر متعلقہ خیالات کو الگ کیا جاتا ہے۔ اس مرحلے میں مصنف یا قلم کار تحریر کا عنوان، موضوع، غرض وغایت، پیغام اور آغاز واختتام کا انداز متعین کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ متعلقہ معلومات جمع کرتا ہے۔ حوالہ جات، اعداد وشمار یا حقائق وواقعات اکٹھے کرتا ہے اور ان سب چیزوں کو ترتیب دے کر ''تحریر کا خاکہ'' تشکیل دینے کی کوشش کرتا ہے۔ ○

تدوین(writing):

اس مرحلے سے حروف والفاظ کا معرکہ شروع ہوتا ہے۔ اس میں کامیابی کا دارومدار منتخب الفاظ کو جوڑ کر خوبصورت جملے اور جملوں کو ترتیب دے کر بامعنی پیراگراف وجود میں لانے پر ہوتا ہے۔ ''پیشِ تحریر'' میں جو خاکہ تیار ہوا ہے اس میں مشاقی سے رنگ بھرنا اور ان رنگوں کو اس انداز میں سجانا کہ قوسِ قزح کا منظر پیش کریں، اسی مرحلے کا خاصہ ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مصنف یا مضمون نگار کے پاس:

- عمدہ الفاظ اور بامعنی تراکیب کا خاطر خواہ ذخیرہ ہو۔

- محاورات اور ضرب الامثال کے صحیح اور برمحل استعمال سے واقف ہو۔

- املا و انشا کے قواعد کا لحاظ رکھے۔

- مختصر، آسان اور مؤثر الفاظ میں موضوع کو سمیٹے۔

- موضوع سے وابستگی اور پیراگرافوں میں تسلسل، ربط اور وحدت کا خیال رکھے۔

اس کے بعد اس کے سامنے تین سوال ہوتے ہیں:

- ابتدا کیسے کروں؟

- لکھنے کے دوران خیالات کا تسلسل کیسے برقرار رہے؟

- اختتام کس نکتے پر ہو؟

آیئے! ان تینوں سوالات کے جواب کے لیے چند ہدایات کا مطالعہ کرتے ہیں:

۱- ابتدا کیسے کی جائے؟

''ابتدائیہ'' تحریر کا انتہائی اہم مرحلہ ہوتا ہے۔ کسی بھی تحریر کا ابتدائیہ اور ابتدائیے میں پہلا فقرہ دراصل قاری کی توجہ کا فیصلہ کرتا ہے کہ وہ تحریر پڑھے یا نہ پڑھے۔ قاری اپنے ذوق کا تابع ہوتا ہے۔ اس کے لیے اس کا اپنا ذوق مقدم ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد ہی وہ کسی لکھاری سے متاثر ہوتا ہے۔ قارئین میں ایک ایسا طبقہ بھی موجود ہے جو لکھاری کا نام نہیں دیکھتے، لیکن انہیں تحریر سے غرض ہوتی ہے۔ ابتدائیہ یا ابتدائیے کا پہلا فقرہ جس قدر دلچسپ، پرکشش اور جاندار ہوگا، وہ قاری کی اتنی ہی توجہ کا مستحق قرار پائے گا۔ اس کے برعکس اگر لکھاری کے پاس بہت دلچسپ اور معیاری مواد ہو، لیکن اگر وہ شروع میں قارئین کی توجہ حاصل نہیں کر پایا تو وہ تحریر ضائع ہو جانے کے مترادف ہوتی ہے۔

کالم، مضمون یا اس سے مشابہت رکھنے والی تحریروں میں ابتدائیے کا فیصلہ کرنا قدرے آسان ہوتا ہے، لیکن کہانی یا سفرنامہ وغیرہ جیسی تحریروں میں قدرے مشکل ہوتا ہے، کیونکہ ان تحریروں میں ابتدائیے پوری تحریر کی جان ہوتے ہیں۔ لکھاری ان کے ابتدائیے میں انوکھا پن دے تو یہ مشکل

نہیں رہتی۔

دلچسپ، پُرکشش اور انوکھے ابتدائیے کی مشق کے لیے درجِ ذیل تکنیک اختیار کی جائے:

۔خاکہ سازی کے بعد تحریر نگار یہ فیصلہ کرے کہ اس کے پاس ابتدائیے کے لیے سب سے دلچسپ، پرکشش اور انوکھا پہلو کون سا ہے؟

۔تحریر نگار اگر لکھنے سے پہلے مواد کی ترتیب صحیح طرح سے کر لیتا ہے تو ابتدائیے کا مرحلہ اتنا پریشان کن نہیں رہتا۔ مواد کی ترتیب ہی سے وہ یہ طے کر لیتا ہے کہ اسے شروع میں کیا کہنا ہے، آگے کیسے چلنا ہے اور اس کے بعد آخر میں کیا بات آئے گی؟

۔ابتدائیے کو سمجھنے کے لیے نامور ادیبوں اور قلم کاروں کی تحریروں کے ابتدائیے پڑھتے رہنا چاہیے۔ اس سے شعور کی تربیت ہوتی ہے اور ابتدائیے کے انوکھے پن کی سمجھ آجاتی ہے۔ ابتدائیے عموماً دس میں سے کسی ایک قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اقسام آگے ''کالم نگاری'' والے مضمون میں بیان ہو رہی ہیں۔ مشہور لکھنے والوں کے ابتدائیوں کا تجزیہ کر کے اور ان کی نوعیت کو پہچاننے کی کوشش کرنے سے ابتدائیے کی مشق ہو جاتی ہے اور نوآموز کے لیے یہ مرحلہ عبور کرنا مشکل نہیں رہتا۔ ابتدائیہ شناسی دراصل ایک وجدانی کیفیت سے پھوٹتی ہے۔ اس مشق سے لکھاری میں اس وجدانی کیفیت کے خدوخال نکھرنا شروع ہو جاتے ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ مزید سنورتے جاتے ہیں۔

۲-خیالات کا تسلسل کیسے برقرار رکھا جائے؟

لکھاری جب لکھنا شروع کرتا ہے تو بات سے بات نکلتی ہے اور ایک خیال سے دوسرا خیال جنم لیتا ہے۔ خیالات دریا میں پانی کے بہاؤ کی طرح بہتے چلے آتے ہیں۔ اپنے خیالات کو صفحۂ قرطاس پر لفظوں کا رُوپ دیتے ہوئے خیالات کے بہاؤ پر بے جا پابندیاں نہ لگائیں۔ اس طرح خیالات کے بہاؤ کے سامنے رکاوٹیں کھڑی ہو جائیں گی جو بلاشبہ خلل کا باعث بنے گا۔ لکھنے کے دوران لکھاری کے اندر موجود وجدانی کیفیت اسے جو عطا کر رہی ہے، اسے قبول کرے اور بس لکھتا چلا جائے۔

اس دوران پختہ خیالات کے ساتھ اِدھر اُدھر کے مبہم اور ناپختہ خیالات بھی آئیں گے۔ اعلیٰ خیالات کے ساتھ معمولی نکات بھی ذہن کے پردے پر جھما کے کریں گے۔ بعض مناسب الفاظ

نہیں سوجھیں گے۔ متبادل الفاظ ذہن سے محو ہو جائیں گے۔ فقروں کی بناوٹ سے اطمینان نہیں ہوگا۔ کمزور دلائل سے پریشانی لاحق ہوسکتی ہے۔ ایسے میں لکھنے والا ان ضمنی معاملات میں کھو کر نہ رہ جائے۔ لکھنے کے دوران ان ضمنی معاملات کو ایک طرف رکھ کر بس تحریر پر توجہ دیں اور لکھتے چلے جائیں۔ بقیہ سارے کام بعد کے ہیں۔

دورانِ تحریر لکھاری کو اپنے خیالات پر توجہ دینی چاہیے۔ غیب سے جو مضامین وجدان میں آرہے ہیں، ان سے رابطہ کی مضبوطی ہی دراصل لکھاری کی صلاحیتوں کی پختگی کا باعث بنتا ہے۔ خود کو ''کھلا'' چھوڑ کر لکھنے کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی اصیل گھوڑا دوڑ کے میدان میں اپنی پوری طاقت لگا کر ہواؤں سے باتیں کرتا ہے یا جیسے کوئی پرندہ آزاد فضاؤں میں اپنی پوری قوت سے اُڑانیں بھرتا ہے۔ اس آزاد اُڑان کی لذت صرف وہی جانتا ہے جس نے ان کھلے میدانوں اور آزاد فضاؤں میں اُڑانیں بھری ہوں اور بے جا پابندیاں اس کی اُڑان میں رکاوٹ نہ بنی ہوں۔

لکھنے کے دوران ذہن جس سمت میں رہنمائی کرے یا خیالات کے گھوڑے جس طرف بھی سرپٹ دوڑیں، ان کی لگامیں ڈھیلی کر دیں۔ عمدہ اور منفرد جملے، سرخیاں، ذیلی سرخیاں، ہائی لائٹس وغیرہ سوچنے کی زحمت نہ کریں۔ خیالات کا بہاؤ ہی نئے خیالات لاتا ہے۔ یوں بات سے بات نکلتی ہے۔ یاد رہے کہ یہ سارے خیالات لکھاری کے اندر ہی سے برآمد ہو رہے ہیں جو وہ تحریر کی صورت میں لکھ رہا ہے۔ ان خیالات کی راہ میں رکاوٹ ذہنی قوت کو محدود کر دینے کے مترادف ہوتی ہے۔ اس سے بچیں۔ بے جا پابندیوں سے بچ کر خود کو کھلا چھوڑ کر لکھیں گے تو شعور، لاشعور اور تحت الشعور میں دبی ہوئی وہ باتیں بھی سامنے آجائیں گی جنہیں لکھاری نے کبھی سوچا تھا اور وہ باتیں منتظر تھیں کہ کسی اچھے وقت خود کو ظاہر کر دیں۔

۳- اچھا اختتام کیسے ہو؟

جس طرح تحریر کا جاندار آغاز کسی بھی تحریر کے لیے نہایت اہم ہوتا ہے، بالکل اسی طرح عمدہ اختتام بھی تحریر کی جان ہوا کرتا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ اگر مسافر اپنی منزل سے متعلق جانتا ہے تو وہ منزل تک پہنچنے کے لیے محفوظ، سہل اور آرام دہ راستہ اپنائے گا۔ لکھاری اگر جاندار آغاز

کے ساتھ عمدہ اختتامیہ بھی اپنے ذہن میں رکھتا ہے تو وہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت نہایت مؤثر اور دلکش انداز سے کر سکے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ ایک نکتہ کی وضاحت کر لیتا ہے تب ہی دوسرے نکتے کی جانب بڑھے گا اور اپنے موضوع کی حدود میں رہتے ہوئے بڑی آسانی کے ساتھ اس انجام تک پہنچ جائے گا جس تک وہ پہنچنا یا قاری کو پہنچانا چاہتا ہے۔ کسی بھی تحریر کا عمدہ انجام یا اختتامیہ، قاری پر غیر معمولی اور نتیجہ خیز اثرات مرتب کر سکتا ہے کیونکہ یہی تحریر کا نچوڑ ہوتا ہے۔

۳۔ لکھنے کے بعد

نظرِ اوّل:

نئے لکھنے والوں میں یہ غلط فہمی عام طور پر پائی جاتی ہے کہ مؤثر تحریر کا عمل بس ایک ہی بار میں تکمیل پا جاتا ہے۔ گویا وہ سمجھتے ہیں کہ بڑے ادیب جو کچھ لکھتے ہیں اس کا حتمی مسوّدہ پہلی ہی بار میں خامیوں سے پاک اور معیاری ہوتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ایک اچھا اور معیاری مسوّدہ کئی بار نظر ڈالنے اور اس میں اصلاح کرنے کے بعد وجود میں آتا ہے۔ اگرچہ اتنا ضرور ہے کہ لکھاری جوں جوں تجربہ کار ہوتا جاتا ہے، اصلاح و تصحیح کا عمل کم سے کم ہوتا رہتا ہے۔

پیشہ ور قلم کاروں کے لیے جو کسی اخبار یا ہفت روزہ کے لیے لکھ رہے ہیں، ایک محدود وقت میں اپنے مسوّدے کو حتمی شکل دینا ضروری ہوتا ہے...... لیکن اگر آپ کوئی کتاب لکھ رہے ہیں جس میں وقت کی قید نہیں، تب آپ کو زیادہ سے زیادہ مرتبہ اپنے مسوّدے پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔ اس سے کتاب کا معیار بڑھے گا اور اس کی قدر میں اضافہ ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ اچھی، معیاری اور مؤثر تحریر کے لیے وقت، محنت، یکسوئی اور صبر کی ضرورت ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ لکھنے کے بعد اس کو قاری کی نظر سے پڑھا جائے اور ناقد کی حیثیت سے اس پر نظر ڈالی جاتی رہے۔ یہ عمل تحریر کو بہتر سے بہتر کرنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے اور اس سے مراد محض لفظی تصحیح نہیں، بلکہ اس میں لفظوں کی عدالت میں پیش ہو کر بہت سے کام کیے جاتے ہیں۔ مثلاً:

- الفاظ کی نوک پلک، نشست و برخاست اور استعمال کی درستی۔
- ہجوں اور شوشوں پر توجہ، املاء و انشاء کے قواعد اور رموزِ اوقاف کا لحاظ۔
- اضافی باتوں اور غیر متعلقہ تفصیلات و معلومات کا اخراج تاکہ تحریر میں ربط اور وحدت پیدا ہو سکے۔

نظرِ اول یعنی اصلاح و تصحیح بقلمِ خود بھی ہوتی ہے اور کسی استادِ فن کو دکھا کر بھی۔ دونوں کا طریقہ سمجھ لیجیے:

۞ انسان کا ذہن اگر کسی حادثے کا شکار نہ ہو تو چونکہ وہ ہر لمحے ارتقا پذیر ہے اس لیے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے کام کا معیار قدرتی طور پر ارتقائی مراحل طے کر لیتا ہے اور بہتر ہو جاتا ہے، اس لیے مشہور ہے کہ اصلاح و تصحیح کا عمل جتنی زیادہ مدت کے بعد کیا جائے گا اتنا ہی موثر اور مفید ہو گا۔ بعض مشہور ادیب تحریر لکھنے کے بعد اسے رکھ کر بھول جاتے ہیں اور پھر ایک مناسب وقفے کے بعد دوبارہ اسے ایک ناقد کی نظر سے دیکھ کر تراش خراش کرتے اور سنوارتے سجاتے ہیں۔

۞ استادِ محترم یا ماہرِ فن کی طرف سے دی گئی اصلاح و ادارت (ایڈیٹنگ) نو آموز کے لیے نعمتِ عظمیٰ ہے۔ ناپختہ ذہن کا نو آموز تو محض قلم کار ہوتا ہے، مشق و تجربے کے طویل اور جاں گسل مراحل سے گزرنے کے بعد اصلاح و ادارت کا مقام آتا ہے۔ مصلح یا مدیر کا درجہ مصنف یا قلم کار سے بہت آگے کا ہے۔ فن پر اس کی گرفت اور معلومات کی وسعت اسے یہ استحقاق دیتی ہے کہ وہ اصلاح کے لیے آئی ہوئی تحریروں میں حسبِ منشا کاٹ چھانٹ، قطع و برید، اصلاح و ترمیم اور کمی بیشی کرے۔ نئے لکھنے والے پر یہ اس کا احسان ہے جس پر (حلق کڑوا کرنے یا خدانخواستہ ناک بھوں چڑھانے کے بجائے) اپنے مربی و محسن کا دل سے شکرگزار ہونا چاہیے۔

نظرِ ثانی:

نیا لکھنے والا نظرِ اول کے بعد بھی اپنی تحریر کو حتمی یا قطعی خیال مت کرے، کیونکہ ابھی اس میں مزید بہتری کی گنجائش موجود ہے۔ اس لیے تحریر پر نظرِ ثانی بھی کی جائے۔ نظرِ ثانی کے تین مدارج ہوتے ہیں:

۱- تحریر لکھ لینے کے بعد تھوڑے دنوں کے لیے ایک طرف رکھ دی جائے۔ تحریر نگار ہفتے عشرے کے بعد جب اسے دوبارہ دیکھے گا تو اپنی تحریر میں کئی ساری تبدیلیاں کرنا چاہے گا۔ مثلاً: کچھ باتیں غیر ضروری لگیں گی۔ نئی معلومات کا اضافہ مفید محسوس ہو گا۔ کچھ دلائل اسے کمزور لگیں گے جنہیں وہ دوبارہ لکھنا چاہے گا۔ الغرض! لکھنے والا جب تھوڑے سے وقفے کے بعد اپنی تحریر پڑھتا ہے تو اس پر نہ صرف اپنی تحریر کی خامیاں عیاں ہوتی ہیں بلکہ خوبیاں بھی واضح ہو جاتی ہیں۔

خامیاں سامنے آنے پر وہ خود حیران رہ جاتا ہے کہ یہ میں ہوں جس نے ایسا لکھ دیا؟ خوبیوں سے واقف ہونے پر اس کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے جو سچے رب کی شکرگزاری کا باعث ہوتی ہے۔

۲- لکھاری اپنی نظرِ ثانی شدہ تحریر کو صاف، واضح اور خوش خط کر کے دوبارہ لکھنے سے پہلے مندرجہ ذیل باتوں کا اطمینان کرے:

- کیا تحریر کا عنوان تجویز کر لیا ہے اور عنوان متن سے مطابقت رکھتا ہے؟
- جس صنفِ تحریر میں لکھا ہے، اس کی تکنیک صحیح طور پر استعمال کی ہے؟
- کوئی لفظ غلط تو نہیں لکھا گیا ہے؟ یعنی املا کی غلطی، کوئی زائد، بے جوڑ یا بے معنی لفظ یا فقرہ۔
- رموزِ اوقاف کی جہاں ضرورت تھی، وہ وہاں موجود ہیں؟
- ایسا لفظ، جملہ یا اصطلاح تو نہیں لکھ دی جو نامانوس ہو یا ذہنی کوفت کا باعث بنے؟
- نکات کی وضاحت میں کہیں اپنے خیالات دوبارہ تو نہیں لکھ دیے؟
- کیا ابھی نئی معلومات، نکات یا وضاحت کی ضرورت ہے؟
- جس مقصد کے لیے تحریر لکھی گئی ہے وہ پورا ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے؟

جب تحریر دوبارہ لکھ لی جائے تو اسے کسی ایسی شخصیت کو پیش کیا جائے جو فنِ تحریر کے بارے میں آگہی رکھتی ہو۔ ایسی شخصیات والدین، اساتذہ، دوست یا ادیب و شاعروں میں سے ہو سکتی ہیں۔ تحریر دکھاتے ہوئے لکھاری اپنے ذہن میں جہاں حوصلہ افزائی کی خواہش رکھتا ہے وہاں حوصلہ شکنی کی گنجائش بھی رکھے۔ وہ لکھاری کی تحریر میں پیش کردہ خیالات، احساسات اور نظریات سے متفق بھی ہو سکتے ہیں اور مخالفت بھی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ ناقدین ہیں۔ ایسا کرنے سے ابتدائی مرحلے ہی میں تحریر کا ردِعمل لکھاری کے سامنے آجائے گا اور ڈھیر سارے مشورے بھی ملیں گے۔ اسے چاہیے کہ وہ ٹھنڈے دل و دماغ سے ابتدائی ردِعمل اور مشوروں پر غور کرے پھر جو بھی فیصلہ ہو اس کے مطابق عمل کرے۔ مطلب یہ ہے کہ یا تو تحریر دوبارہ لکھی جائے گی یا پھر اشاعت کے لیے تیار ہو گی۔

حتمی مسوّدہ(Final Proof):

تحریر کی آخری ترمیم شدہ شکل ''حتمی مسوّدہ'' کہلاتی ہے۔ چونکہ انسانی کاوشوں میں اصلاح، بہتری اور عمدہ سے عمدہ تر ہونے کی گنجائش ہر وقت موجود ہوتی ہے، اس لیے اپنے فرض سے شغف اور کام سے لگن رکھنے والے اہلِ قلم کار شائع ہونے سے قبل بھی اس پر وقتاً فوقتاً نظر ڈالتے رہتے ہیں اور شائع ہونے کے بعد بھی اس کا جائزہ لیتے اور اپنی کوتاہی کا کھلے بندوں اعتراف کرتے ہوئے اس میں اضافہ وترمیم کرتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد کہیں جا کر وہ ''حتمی مسوّدہ'' کی شکل اختیار کرتی ہے۔

اشاعت سے پہلے اور بعد

تحریر لکھ لینے کے بعد لکھنے والے کی یہ قدرتی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی لکھی ہوئی تحریر کہیں نہ کہیں شائع ہوجائے تاکہ جس مقصد کے لیے اس نے تحریر لکھی ہے وہ پورا ہوجائے۔

لکھاری اپنی تحریر، اشاعت کے لیے کہاں بھجوائے؟ یا اس کی تحریر کس جریدے میں شائع ہو؟ اس کا انحصار تحریر پر ہے کہ وہ کس نوعیت ہے اور اس کا مزاج کس جریدے کے مزاج سے مطابقت رکھتا ہے؟ جریدے کے مزاج ومعیار سے واقف ومطمئن ہوجانے کے بعد لکھاری اس جریدہ کے مدیر سے رابطہ کرے۔ بلاشبہ ایک اچھا مدیر، اچھی تحریروں کی نہ صرف قدر کرتا ہے بلکہ نوآموز لکھاریوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے۔

جب کوئی تحریر کسی اخبار یا جریدے کو ارسال کی جائے تو دو میں سے ایک نتیجہ برآمد ہوگا، یعنی:

۱- وہ تحریر ناقابلِ اشاعت ٹھہرے گی۔

تحریر کے ناقابلِ اشاعت ہونے کی متعدد وجوہ ہوسکتی ہیں۔ مایوس ہونے کے بجائے اپنی اصلاح اور تعمیر وتربیت کی فکر کرنی چاہیے۔ ایک دن ضرور ایسا آئے گا جب ان وجوہ کا تدارک ہوجائے گا اور آپ کی تحریر شائع ہونا شروع ہوجائے گی۔ وہ وجوہ درج ذیل ہیں:

- تحریر جریدے کے مزاج ومعیار پر پوری نہ اُترتی ہو۔
- اس موضوع پر پہلے بھی کوئی تحریر شائع ہوچکی ہو۔
- تحریر میں منطقی واستدلالی طرز اور مستند اعداد وشمار نہ ہوں جو ایک مؤثر تحریر کا خاصہ ہوتے ہیں۔

-تحریر میں موجود معلومات وافکار پرانے یا گھسے پٹے ہوں۔
-تحریر میں تحریری لوازم کی خامیاں ہوں۔ ظاہری یا باطنی خوبیوں کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو۔
بہت کچھ ممکن ہوسکتا ہے......مگر کیا ایک تحریر کے ضائع ہوجانے یا اشاعت پذیر نہ ہونے پر لکھاری، لکھنے سے ہاتھ کھینچ لے گا؟؟؟ نہیں! ہرگز نہیں! باہمت اور حوصلہ مند لوگ ایسا نہیں کرتے۔ وہ اپنی غلطیوں کی اصلاح کرتے اور خامیوں کو دور کرتے کرتے آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ مایوس اور کم ہمت لوگوں کے لیے یہ اشعار پیش خدمت ہیں ۔

ناکام ہے تو کیا ہے، کچھ کام پھر بھی کرجا
مردانہ وار جی، مردانہ وار مرجا
اس بحر بیکراں میں ساحل کی جستجو کیا
کشتی کی آرزو کیا، ڈوب اور پار کرجا •

۲- وہ تحریر شائع ہوجائے گی۔ پھر قارئین، مبصرین اور ناقدین اس کے مقام کے بارے میں تعین کریں گے۔ مبصرین کا رویہ حوصلہ افزائی پر بھی مشتمل ہوسکتا ہے اور جارحانہ تنقید پر بھی۔ تحریر نگار دکھ محسوس کرے گا یا پھر ڈھیر ساری خوشی پائے گا۔ ستائش کی حلاوت اور فہمائش کی کڑواہٹ سے قطع نظر لکھاری کو ہر حال میں مستقل مزاج رہنا چاہیے۔ ایک دو یا چند تحریروں کے ناقابلِ اشاعت ہوجانے سے وہ گمان کرلے کہ وہ لکھ نہیں سکتا اور لکھنا چھوڑ دے یا پھر چند تحریروں کی اشاعت کے بعد وہ سمجھنے لگے کہ وہ بڑا لکھاری بن چکا ہے۔ یہ دونوں باتیں افراط وتفریط پر مشتمل اور اعتدال کے خلاف ہیں۔ لہٰذا دو نصیحتیں یاد رکھیے:
- عاجزی اور انکساری انسانیت کے جوہر ہیں۔ ممکن ہے ایک اچھا انسان اچھا لکھاری نہ ہو، مگر ایک اچھا لکھاری بہرحال ایک اچھا انسان ضرور ہوتا ہے۔ آپ اچھے متواضع انسان بننے کی کوشش کریں۔ انشاء اللہ اچھے لکھاری بھی بن جائیں گے۔
- مستقل مزاجی اچھا دن ضرور دکھاتی ہے۔ جب بھی کوئی گہرے سمندر میں غوطہ لگاتا ہے تو اسے پہلی مرتبہ نہ سہی، اگلی مرتبہ قیمتی اور نایاب موتی ضرور ملتے ہیں۔ تاہم غوطہ وہی لگاتے ہیں جو باہمت اور باحوصلہ ہوتے ہیں۔ یہی لوگ زندگی کی تلخ حقیقتوں کا ہنستے کھیلتے سامنا کرتے اور ترقی کی منازل طے کرتے جاتے ہیں۔

مشق

۱ - دورانِ تحریر خیالات کو آزاد چھوڑ کر لکھا جائے؟ اس پر مختصر نوٹ لکھیں۔

۲ - بار بار نظرِ ثانی کی اہمیت ذکر کریں۔

۳ - اساتذہ فن سے اصلاح لینے کی اہمیت تحریر کریں۔

٤ - تحریر کی اشاعت یا عدمِ اشاعت کی صورت میں ایک نو آموز کو کیا سوچنا چاہیے؟

۵ - ''تحریر کا عمل ایک مسلسل عمل ہے، جس کے لیے مستقل مزاجی نہایت ضروری ہے۔'' اس کی مختصر وضاحت کریں۔

تحریر کا مواد حاصل کرنے کے ذرائع

تحریر کا موضوع، مرکزی خیال اور اس کے معاون خیالات (آئیڈیاز) کس طرح تلاش کیے جاتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ چار ذرائع سے: (۱) مشاہدہ (۲) مطالعہ (۳) مکالمہ (٤) سماعت۔

قلم کار صبح سے شام تک، گھر سے دفتر تک اور انتظار گاہ سے سیر گاہ تک بیسیوں چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس رنگا رنگ دنیا کی ہر چیز اسے کچھ نہ کچھ کہتی اور سرگوشیوں میں اپنا حال سناتی ہے۔ اگر فطرت کی ان سرگوشیوں کو سننے کی صلاحیت پیدا کر کے انہیں حروف کی زبان عطا کرنے کا سلیقہ پیدا کر لیا جائے تو کالموں کی قطار وجود میں آجائے۔ پھر جس طرح اہل علم وادب اور اہل فکر ودانش کی تحریریں انسان کی سوچ کو نئے زاویے عطا کرتی اور تحریر کا موضوع سجھاتی ہیں، اسی طرح اہل علم کی صحبتوں میں بیٹھنے سے یا ان سے گفتگو کرنے سے انسان کو ایسے ملفوظات اور خیالات سننے کو ملتے ہیں جن کے سماعت سے ٹکراتے ہی اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوتا ہے اور کوئی ایسا نکتہ ذہن میں آجاتا ہے جو ایک اچھے کالم کا مرکزی خیال بن سکتا ہے۔ اس کے بعد نکتہ در نکتہ اور سخن در سخن کا ایک سلسلہ چل پڑتا ہے۔ بقول غالب:

"آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں"

آدمی اگر بیدار مغز اور حاضر دماغ رہے تو مشاہدہ، مطالعہ، مکالمہ اور سماعت چار ایسے ذرائع ہیں جو اسے نت نئے خیالات وافکار سے آگاہ کرتے اور ایسے فوائد ونکات کا جہان کھولتے ہیں جو کامیاب تحریر کی بنیاد بن جاتے ہیں۔ ذیل میں چاروں پر کچھ روشنی ڈالی جاتی ہے۔

تحریر کا مواد حاصل کرنے کے چار ذرائع

۱- مطالعہ:

اخبارات و رسائل اور کتابوں کے مطالعے سے نت نئے خیالات اور نکات سامنے آتے ہیں۔ لکھنے والے نے جو بات سوچی بھی نہ ہوگی وہ قاری کی سمجھ میں آ جاتی اور ایک نئے مضمون کی بنیاد بن جاتی ہے۔ جب مضمون کا مرکزی خیال ہاتھ آ جائے تو مزید ایسا مواد پڑھنا چاہیے جس سے لکھاری اپنے موضوع سے متعلق معلومات حاصل کر سکے۔ لکھاری اپنے مطالعے کے لیے کتابیں، انسائیکلوپیڈیا، اخبارات، جرائد و رسائل یا غیر شائع شدہ مواد پڑھتا ہے یا انٹرنیٹ وسی ڈیز سے استفادہ کرتا ہے۔ پھر وہاں سے اخذ کی گئی باتوں کو اپنے انداز و اسلوب میں احاطۂ تحریر میں لاتا ہے۔ مثال کے طور پر لکھنے والا: ''امام غزالی: تصوف اور فلسفہ'' کے موضوع پر لکھنا چاہتا ہے۔ تب وہ لازمی طور پر امام غزالی کی کتب سے ان مقامات کو پڑھے گا جن میں تصوف کی تائید وتشریح اور قدیم یونانی فلسفہ کا ابطال و تردید کا ذکر ہے۔ پھر ان کتب، مضامین وغیرہ سے استفادہ کرے گا جو امام غزالی کے اس نظریے کے بارے میں مزید معلومات دے سکیں۔ ان کے افکار کی وضاحت ہو سکے اور ان کے فلسفہ کی تشریح ہو۔ اس طرح کا سارا مواد اکٹھا کر کے جب اسے ترتیب دی جائے گی تو تحریر لکھنے کے لیے معلومات دستیاب ہو جائیں گی۔

۲- مشاہدہ:

اس دنیا کی ہر چیز، فطرت کا ہر رنگ اور کائنات کے کینوس پر بکھری ہر تصویر انسان سے کچھ نہ کچھ کہتی ہے۔ اس کے پیغام کو ''مشاہدہ'' کے کانوں سے سنا جا سکتا ہے۔ مشاہدہ سے مراد ہے اپنے ماحول اور حالات کا جائزہ لینا اور لیتے رہنا، جہاں نت نئی جہات، نت نئی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو رہی ہیں۔ ان تبدیلیوں کے باعث جو نتائج سامنے آ رہے ہیں ان سے زندگی کس قدر متاثر ہو رہی ہے؟ حقائق اور حالات سے براہِ راست واقفیت حاصل کرنا انسان کی قوتِ تخیل میں ہلچل پیدا کر دیتا ہے۔ اس سے تصورات کے نئے نئے سوتے پھوٹتے ہیں اور نئے نئے

موضوعات وخیالات سامنے آتے ہیں۔مثال کے طور پر تحریر کا موضوع ہے:''عشاق کا عمرہ'' یا ''دیہاتی باشندوں کا سفرِ حج''، اس کے لیے لکھاری دور دراز دیہاتوں سے پہلی مرتبہ عمرہ وحج پر جانے والوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ان کے احساسات وجذبات کو محسوس کرے گا۔ان کے مسائل سنے گا تب ہی اس کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔مشاہدہ جس قدر گہرائی اور دلچسپی سے کیا جائے گا اتنی زیادہ معلومات دستیاب ہوں گی۔

عملی مشاہدہ (یعنی از خود دیکھنا) بہترین تحریر کی ضمانت ہوتا ہے۔ایک اچھے قلم کار کو اچھا مشاہدہ کرنے والا ہونا چاہیے۔آپ اپنے اردگرد کے ماحول، حالات اور مظاہرِ فطرت کا مطالعہ و مشاہدہ جتنی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ کرسکیں گے، آپ کے لیے اتنے ہی متنوع موضوعات کاغذ پر منتقل کرنے کے لیے موجود ہوں گے۔آپ خاص طور پر سفرنامے اور آپ بیتیاں پڑھ کر دیکھیے۔ جس سفرنامے، آپ بیتی یا جگ بیتی میں ماحول اور گردوپیش کی منظرکشی جس قدر دلچسپ انداز میں اور تفصیل سے کی گئی ہوگی، وہ اتنا ہی جان دار محسوس ہوگا۔اس سے آپ کو تحریر نگار کی مشاہدہ کرنے کی صلاحیت وقابلیت کا بھی اندازہ ہوگا کہ کتنی باریک اور معمولی چیزوں پر بھی اس کی نظر ہے۔کسی بھی نوعیت کی تحریر پڑھیں، اس میں غور کیجیے کہ تحریر نگار نے کس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے اور کتنی باریکی سے منظرکشی کی ہے۔

۳- مکالمہ (غیر رسمی انٹرویو):

مکالمہ سے مراد بات چیت یا گفتگو ہے۔اچھی تحریر لکھنے کے لیے اچھی معلومات جمع کرنے کا ایک گُر یہ ہے کہ لکھاری کو لوگوں سے کرید کرید کر سوالات کرنے اور کام کی باتیں اگلوانے کا فن آتا ہو۔لکھاری ان لوگوں سے بات کرے جن سے متعلقہ موضوع سے متعلق معلومات دستیاب ہوسکتی ہیں۔مثال کے طور پر تحریر نگار:''عمرہ پر جانے والوں کے مسائل'' پر لکھنا چاہتا ہے۔اس موضوع کے متعلق مواد حاصل کرنے کیلئے اسے اپنی مسجد یا محلے میں عمرہ/حج پر جانے والوں، ٹریول ایجنٹس اور سعودی سفارتخانے کے اہلکاروں سے ملاقاتیں کرنا ہوں گی۔ان سے بات چیت کے ذریعے مسائل ومشکلات کی فہرست بنانا ہوگی اور پھر اس پر فریقین کا موقف معلوم کرکے مسائل کے حل

کے لیے اپنی تجاویز دینی ہوں گی۔اسی طرح ’’اسکول جانے والے طلبہ وطالبات کے مسائل‘‘ پر مواد کے حصول کے لیے فطری طور پر ان طلبہ وطالبات سے گفتگو کرنی ہوگی جن سے اس موضوع کا تعلق ہے۔یعنی وہ طلبہ وطالبات جو صبح سویرے اسکول جاتے ہیں وہ کن مسائل سے دوچار ہیں؟ کیا ان کے والدین اور اہلِ خانہ بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں؟ کس طرح کے ماحول میں کس طالب علم کو کیسا مسئلہ درپیش ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔یہاں لکھاری کو معلوم ہوگا کہ ان مسائل کی نوعیت کیا ہے؟ یہ کیوں پیدا ہو رہے ہیں؟ ان میں سے کتنے مسائل خصوصی اور کس قدر عمومی نوعیت کے ہیں؟ ان مسائل سے طلبہ وطالبات کی تعلیم اور صحت کس حد تک متاثر ہو رہی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔لکھاری انہی مسائل کو لے کر طلبہ وطالبات کے والدین سے گفتگو کرے گا۔وہاں سے اسے ایک دوسرے زاویے سے معلومات ملیں گی۔اسی طرح اساتذہ سے بات چیت مفید ثابت ہوگی کہ وہ بھی طلبہ وطالبات سے متعلق ہوتے ہیں۔وہ نئے رُخ سے گفتگو کریں گے اور بہتر انداز سے معلومات دے سکیں گے۔طلبہ وطالبات کے مسائل کا حل تلاش کرنا مقصود ہے تو اس پہلو پر بھی وہ طلبہ وطالبات، والدین اور اساتذہ سے گفتگو کرے گا۔پھر یہیں سے ایک پہلو اور بھی سامنے آتا ہے کہ مسائل کی نوعیت کے لحاظ سے کوئی اور طبقہ بھی تعلق رکھتا ہے، مثلاً بچوں کو اسکول لے جانے والے ڈرائیور حضرات تو ان سے بھی بات کر لی جائے۔ان سب لوگوں سے گفتگو کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لکھنے والے کے پاس تحریر لکھنے کے لیے اتنی معلومات آجائیں گی کہ وہ بہتر انداز میں لکھ سکے گا۔

٤- سماعت:

اگر آپ اچھا سننے والے ہیں تو یقین مانیے کہ آپ اچھا لکھنے والے بھی بن سکتے ہیں۔حدیث شریف میں آتا ہے: ’’انسانوں میں بھی سونے چاندی کی کانوں کی طرح معدنیات (یا معلومات) کا ذخیرہ ہوتا ہے۔‘‘ یعنی جس طرح کسی کان سے سونا، چاندی، کسی سے ہیرے جواہرات، کسی سے قیمتی پتھر اور کسی سے محض کوئلہ برآمد ہوتا ہے۔اس طرح انسان علم وفضل، فکر ودانش، اخلاقیات اور روایات کے اعتبار سے مختلف اعلیٰ صفات کے ذخائر ہوتے ہیں۔ان کی صحبت میں بیٹھنے سے ایسے ایسے گوہر نایاب ہاتھ آتے ہیں کہ جن کی چمک سے آنکھیں خیرہ اور دل

روشن ہو جاتے ہیں۔ آپ بھی اہلِ علم وادب کی صحبت تلاش کیجیے۔ ان کے پاس اُٹھنے بیٹھنے کی عادت بنائیے۔ ان کی گفتگو اور بحث وتمحیص کو کان لگا کر غور سے سنیے۔ صاحب علم وبصیرت لوگ باتوں باتوں میں ایسے موتی بکھیر جاتے ہیں کہ جو مبتدی کے لیے کالم کا موضوع بن جاتے ہیں یا پھر وہ انہیں اپنی تحریر میں ٹانک کر اس کے حسن وخوبصورتی میں اضافہ کر لیتا ہے۔

پہلے زمانے میں بڑے شہروں میں ''ٹی ہاؤس'' ہوتے تھے یا کچھ ادب پرور لوگوں کی بیٹھکیں ہوتی تھیں۔ وہاں ادیبوں اور شاعروں کی محفلیں جمتی تھیں۔ ان میں حاضری سے مبتدیوں اور نوآموزوں کی تربیت ہوتی تھی۔ بہت کچھ سیکھنے کو ملتا تھا۔ اب ایسی بیٹھکیں تو نایاب یا مفقود ہیں ،مگر صاحبانِ علم وفضل تو ہر جگہ پائے جاتے اور قیامت تک پائے جاتے رہیں گے۔ ان کی باتیں عمر بھر کے مطالعے اور ان کے عمر بھر کے تجربے کا نچوڑ ہوتی ہیں۔ آپ ان سے استفادہ کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیجیے۔

آخر میں یہ نصیحت یاد رکھیں کہ موادِ تحریر کے حصول کے لیے کسی ایک ذریعہ پر انحصار نہ کیا جائے۔ ایک جاندار، مؤثر، دلچسپ، معلومات خیز اور پُرکشش تحریر کے لیے چاروں ذرائع کا استعمال کیا جانا چاہیے۔ اب یہ لکھنے والے کے حالات اور وسائل پر منحصر ہے کہ وہ ان چاروں میں سے کس ذریعہ کو زیادہ یا کم استعمال کرتا ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ لکھاری زیادہ سے زیادہ منفرد اور دلچسپ معلومات اکٹھی کر سکے اور اس کی ذہن ساز تحریر سے دوسرے مستفید ہو سکیں۔

مواد محفوظ کرنے کے ذرائع

کاغذ پنسل ساتھ رکھنا

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب میں تصنیف کا کام کرتا تھا تو عادت یہ تھی ہر وقت کاغذ پنسل میرے ساتھ رہتے تھے۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے کوئی مضمون یاد آ گیا تو فوراً لکھ لیتا تھا۔ آدھی رات کو کوئی چیز یاد آتی تھی تو لکھ کر سوتا تھا کیونکہ بعض اوقات مضمون ذہن سے غائب ہو جاتا ہے پھر سوچنے سے بھی نہیں آتا۔ (تحفۃ العلماء: 2-271)

۱- بیاض اور کشکول (نوٹ بک اور جرنل):

ان خیالات اور معلومات کو جو ان چار میں سے کسی ذریعے سے حاصل ہوں، محفوظ کیسے کیا جائے؟ اس کے لیے بیاض اور کشکول یعنی نوٹ بک اور جرنل کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں اچھی تحریر کا فن سیکھنے، اچھی تحریر کی مشق کرنے اور اچھے موضوعات تک مسلسل رسائی رکھنے کا ایک بہترین ذریعہ ہیں۔ جب آپ نے اللہ کی رضا حاصل کرنے اور انسانیت کو ہدایت کی دعوت دینے کے لیے تحریر کا فن سیکھنے کا تہیہ کر ہی لیا ہے تو معلومات حاصل کرنے کے چاروں ذرائع (مطالعہ، مشاہدہ، مکالمہ، مسامعہ) کی عادت ڈالنے اور معلومات محفوظ کرنے کے دو ذرائع (بیاض اور کشکول) کو اپنے اوپر لازم کر لیجیے۔

نئے نئے آئیڈیاز جمع کرنے اور محفوظ رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ کے پاس دو چیزیں ہونی چاہییں:

(۱) چھوٹی یادداشت یا بیاض جو جیب میں آ سکے۔ یہ ہر وقت آپ کے پاس موجود رہنی چاہیے۔

(۲) ایک بڑی یادداشت یا کشکول جس میں آپ چھوٹی بیاض سے مندرجات نقل کرنے کے علاوہ وقتاً فوقتاً مختلف مضامین اور کتابوں سے جواہر پارے درج کرتے رہیں۔

آپ کی یہ نوٹ بک اور جرنل دراصل آپ کی ''میموری'' اور ''لائبریری'' کے علاوہ ''آئیڈیاز بک'' ہے جس میں آپ کے ذہن میں آنے والے خیالات محفوظ ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کے ذہن میں کسی موضوع سے متعلق جو خیال آئے، اسے لکھ لیجیے۔ کوئی خیال یا انداز اچھا لگے، اسے محفوظ کر لیجیے۔ کوئی تجربہ متاثر کرے، اسے درج کر لیجیے۔ زندگی میں روزانہ ایسے بے شمار واقعات آتے ہیں جن کی یادداشت لکھنے کی ضرورت رہتی ہے۔ نوٹ بک یا جرنل کی صورت میں یہ تجربہ یا خیال آپ کے پاس محفوظ ہو جاتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو یہ تجربہ یا خیال ضائع ہو جائے گا۔

آپ وقتاً فوقتاً اپنی بیاض پر نظر ڈال کر اپنی فکری قوتوں کی مدد سے اس میں گُل بوٹے کھلاتے رہیے۔ بیاض کے مندرجات پر توجہ مرکوز کیجیے۔ آپ کے ذہن میں نت نئے نکات اور خیالات کا ورود ہوگا، انہیں ضبط کیجیے۔ کسی خاص عنوان یا نکتے تک پہنچنے اور اس پر توجہ مبذول کرنے میں آسانی بھی ہوگی اور وقت بھی بچے گا۔ کسی خاص نکتے کو نمایاں کرنے کے لیے آپ اسے خط کشیدہ بھی کر سکتے ہیں۔ مختلف علامات یا رنگوں کی صورت میں اس کے بعض مندرجات کو ممتاز بھی کر سکتے ہیں۔ جرنل پر حاشیہ بنا کر بھی لکھ سکتے ہیں۔ اس سے آپ کو بعض اہم نکتے اضافہ کرنے یا نمایاں کرنے میں مدد ملے گی اور تحریر لکھتے وقت یہ نشان زدہ معلومات آپ کے ذہن میں جھماکا کر کے یا بجلیوں کی طرح کوند کر آنازل ہوں گی۔

۲- کٹنگ فائل:

رسائل و جرائد اور اخبارات میں بہت سی کام کی معلوماتی چیزیں چھپتی رہتی ہیں۔ ان کو اگر محفوظ نہ کیا جائے تو کچھ عرصے بعد مضمون لکھنے کے لیے ان کی ضرورت پڑتی ہے، لیکن سرتوڑ کوشش کے باوجود مل کر نہیں دیتیں، بلکہ یہی یاد نہیں آتا کہ انہیں کہاں اور کب دیکھا تھا؟ بس مبہم یادوں کی پرچھائیاں ہوں گی اور حسرتیں۔ آپ کچھ نہیں کر سکیں گے۔ اس حسرت سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ''کٹنگ فائل'' کہلاتا ہے۔ آپ کے پاس چند فائلیں ہونی چاہییں جن پر مختلف عنوانات واضح طور پر لکھے ہوئے ہوں۔ یہ عنوانات آپ خود اپنی سہولت سے منتخب کر سکتے

ہیں۔آپ کو جب بھی کوئی دلچسپ خبر، معلوماتی فیچر، یادگار کالم، یادر کھے جانے کے قابل چیز یا کوئی اچھی تصویر، نقشہ، گراف یا چارٹ ملے تو آپ اسے فائل میں یا فائل کے متعلقہ خانے میں لگادیں۔کچھ عرصے بعد آپ کے پاس اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو جائے گا جو مضمون لکھتے وقت مواد کی فراہمی کا بہترین ذریعہ ہوگا۔آپ اس ذخیرے کو سلیقے سے سنبھال کر رکھیں اور اسے بڑھاتے رہیں۔رفتہ رفتہ یہ ذخیرہ چھوٹی سی ''تراشہ لائبریری'' یا ''تراشہ ریکارڈ روم'' کا نام دیے جانے کے قابل ہو جائے گا۔تحریر کا شغل رکھنے والے ہر شخص کو لائبریری اور ریکارڈ روم کی ضرورت تو رہتی ہے۔آپ کوشش کریں کہ ایک چھوٹی سی ذاتی لائبریری آپ بھی بنالیں جس میں کتابیں زیادہ نہ سہی، خاطر خواہ تراشے تو موجود ہوں۔کٹنگ فائلوں پر مشتمل یہ لائبریری کم وسائل سے معیاری ذخیرہ جمع کرنے کی بہترین مثال ہے۔

آپ کو جب بھی فرصت ملے اپنی یادداشتوں اوران تراشوں کی ورق گردانی کرتے رہیے۔ ان کی خاص باتوں کو خط کشیدہ کیجیے۔ان پر حواشی اور یادداشتیں لکھیے۔ان کو اپنی یادداشت میں تر و تازہ رکھیے۔ان کو مرتب انداز میں یکجا کرنے پر توجہ صرف کیجیے۔آپ کو بہت سی چیزیں ازبر ہو جائیں گی اور بوقت ضرورت مطلوبہ مواد تلاش کرنے میں دقت بھی نہ ہوگی۔

مشق

۱-حصول مواد کے چار ذرائع مختصراً لکھیں۔
۲-مواد کیسے محفوظ کیا جا سکتا ہے؟ نکتہ وار لکھیں۔
۳-مشاہدہ کی بحیثیت ذریعۂ مواد اہمیت تحریر کریں۔
٤-''مطالعہ'' کی اہمیت وضرورت پر ایک مختصر تحریر لکھیں۔
۵-جیبی ڈائری، کٹنگ فائل اور روزانہ ڈائری کی موجودگی یقینی بنا کر سوال کا عملی جواب دینے کے بعد تینوں کی اہمیت وضرورت بیان کیجیے۔

تحریر کی ظاہری خوبیاں

ہر زبان کے کچھ ظاہری آداب ہوتے ہیں کچھ باطنی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے: تحریر کی کچھ لفظی خوبیاں ہوتی ہیں اور کچھ معنوی۔ ذیل میں اچھی تحریر کی چھ ظاہری خوبیاں بیان کی جاتی ہیں۔ ان کو اپنانے سے آپ کی تحریر معیاری تصور کی جائے گی اور آپ ایک سلجھے ہوئے قلم کار باور کیے جائیں گے۔ اگلے مضمون میں آپ کو سات معنوی خوبیوں سے آگاہ کیا جائے گا۔ آپ ان کو بھی غور سے پڑھیں۔ دونوں چیزیں کسی تحریر میں یکجا ہو جائیں تو اس کی قبولیت اور کامیابی کی ضامن سمجھی جاتی ہیں۔

۱- قواعدِ انشا:

تحریر لکھتے وقت اس زبان کے قواعد وانشا سے (مکمل نہ سہی مگر ضروری) واقفیت بھی ضروری ہے۔ قواعد انشا کا موضوع بہت طویل ہے، جس پر اس کتاب کے پہلے باب میں مختلف حوالوں سے بات کی گئی ہے۔ یہاں ہم ایک مثال پر اکتفا کریں گے۔

کا، کے، کی وغیرہ الفاظ مقرّر کے لیے اتنے پریشان کن نہیں ہوتے جتنے کہ قلم کار کے لیے۔ مذکر یا مؤنث الفاظ کا مسئلہ بھی قابل توجہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر لفظ ''فراک'' مذکر ہے، لیکن عموماً مؤنث بولا جاتا ہے۔ ''عوام کا لفظ مذکر ہے، لیکن بعض لوگ اسے مؤنث استعمال کرنے میں اپنی علمیت کا اظہار سمجھتے ہیں۔'' الفاظ لکھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ الفاظ کی تذکیر و تانیث، ترکیب اور مزاج سے واقف ہو۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حروفِ معانی کے استعمال، مبتدا وخبر اور فعل وفاعل میں مطابقت وغیرہ کے قوانین سے آگاہ ہو۔

۲- املا:

ہر لفظ کو ٹھیک ٹھیک لکھا جائے، یعنی اس لفظ میں جتنے حرف آنے چاہییں اور جس ترتیب سے

آنے چاہییں اُسی طرح آئے ہوں اور ان حرفوں کے جوڑ پیوند بھی ٹھیک ہوں تو کہا جائے گا اس لفظ کا ''املا'' درست ہے۔ اگر اس کے خلاف ہوگا تو کہا جائے گا کہ املا غلط ہے۔ املا کی تعریف یوں بھی کی گئی ہے: ''املا لفظوں کی صحیح تصویر کھینچتا ہے۔'' اس بات کو یوں بھی کہا گیا ہے: ''املا، لفظ میں حرفوں کے صحیح صحیح استعمال کا نام ہے۔'' جو طریقہ اُن حرفوں کو لکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، وہ ''رسمِ خط'' کہلاتا ہے۔ املا اور رسم خط میں وہی نسبت ہے جو پھول میں اور اس کے رنگ اور خوشبو میں ہوتی ہے۔ پھول نہ ہو تو رنگ کا وجود متعین ہو پائے گا، نہ خوشبو کو ٹھکانا ملے گا۔ لکھنے میں املا ایسا ہی ہے جیسے بولنے میں تلفظ اور رسم الخط ایسا ہے جیسے بولنے میں لب ولہجہ۔ املا میں تصحیح کی ضرورت یوں پڑا کرتی ہے کہ اَن جانے میں یا کسی اور وجہ سے کچھ لوگ بعض لفظوں کو غلط طور پر لکھنے لگتے ہیں۔ شروع شروع میں چند ہی لوگ ہوتے ہیں، مگر بعد کو انھی دو چار یا دس بیس کا لکھا ہوا سند بننے لگتا ہے اور اسے دیکھ کر بہت سے لوگ غلطیاں کرنے لگتے ہیں۔ جیسے ایک لفظ ہے ''مَوقِف'' جو ''مُوَقَّف'' استعمال ہوتا ہے، لیکن دراصل یہ عربی زبان کا اسمِ ظرف ہے۔ جس طرح ''موقع'' کو ''مؤقَّع'' لکھنا پڑھنا غلط ہے، اسی طرح موقِف کو مؤقَّف لکھنا پڑھنا بھی غلط ہے۔ یہ بہت صاف اور سادہ بات ہے، مگر اکثر لوگ ''واؤ'' پر ہمزہ پڑھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہی ہوا ہوگا کہ ابتدا میں دو چار آدمیوں نے اس لفظ کو اس طرح لکھا بولا ہوگا اور پھر دوسرے بھی اس طرح لکھنے بولنے لگے اور یہ کسی نے نہیں سوچا کہ اس لفظ کا صحیح املا کیا ہے؟

اس طرح کی گڑبڑ کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ اکثر حرف ملا کر لکھے جاتے ہیں اور ملا کر لکھنے کی صورت میں حروف اپنی شکل بدل کر چھوٹے ٹکڑوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس وجہ سے اس کا امکان رہتا ہے کہ بے توجہی کے سبب یا نہ جاننے کے باعث یا جلدی میں کسی حرف کی جگہ بدل جائے۔ کچھ صورتوں میں اس کا بھی امکان رہتا ہے کہ حرف ہی بدل جائے یا کوئی حرف کم ہو جائے یا زیادہ ہو جائے۔ مثلاً ''لیے'' میں ایک ''لام'' اور دو ''ی'' ہیں (ل ي ے)، اس کو ''لئے'' اور ''لیئے'' بھی لکھا جاتا ہے جو ظاہر ہے کہ بالکل غلط ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد، چچا کا نام ''آزر'' ہے، اس کو ''آذر'' فرض کر لیا جاتا ہے۔ ''اژدحام'' کو ''ازدہام'' اور ''زخّار'' کو ''ذخّار'' بنا دیا جاتا ہے۔ یا جیسے پیش کرنے اور عرض کرنے کے معنی میں ایک لفظ ہے

''گزارش'' اس میں ''ز'' ہے، مگر اس کو ''گذارش'' بھی لکھا جاتا ہے اور اس کے برعکس ''گذشتہ'' کو ''گزشتہ'' بنالیا جاتا ہے اور ''گزرنا'' کو ''گذرنا'' بھی لکھا جاتا ہے۔

کسی بھی زبان کے لیے اور اُس کے لکھنے والوں کے لیے یہ کچھ فخر کی بات نہیں کہ معمولی معمولی لفظوں کو صحیح طور پر نہ لکھا جائے۔ یا ایک ہی لفظ کو کوئی کسی طرح لکھے اور کوئی کسی طرح، اور یہ بات ٹھیک معلوم نہ ہو کہ صحیح صورت کیا ہے؟ جس طرح بولنے والے کو لفظ کا تلفظ معلوم ہونا چاہیے، اسی طرح لکھنے والے کو لفظ کا املا معلوم ہونا چاہیے۔ جس طرح ''قلم'' کی جگہ ''پنسل'' بولنا صحیح نہیں، اسی طرح ''قلم'' کو ''کلم'' لکھنا بھی درست نہیں ہوگا۔ اگر ایک شخص ''پان'' کو ''بان'' کہے تو کہا جائے گا کہ تلفظ بگڑ گیا۔ اسی طرح اگر ''چونہ'' اور ''کتھہ'' لکھا جائے تو کہا جائے گا کہ املا غلط ہو گیا، کیوں کہ صحیح املا ''چونا'' اور ''کتھا'' ہے۔

اضافت کی صورت میں لفظ کے آخری حرف پر زیر آجاتا ہے۔ یہ مانا ہوا قاعدہ ہے۔ ''منزل'' اور ''زندگی'' دو لفظ ہیں۔ اضافت کی صورت میں ''منزلِ مقصود'' لکھا جائے گا، مگر اس کو ''منزل مقصود'' (بغیر زیر کے) لکھا جائے تو ہر شخص یہی کہے گا کہ املا ناقص ہو گیا۔ اسی طرح ''زندگیِ جاوید'' لکھا جائے گا۔ اس کو بھی اگر ''زندگی جاوید'' لکھا جائے تو ''منزل مقصود'' کی طرح اس کا املا بھی ناقص ہو جائے گا، مگر ایسی غلطیاں اکثر دیکھنے میں آتی رہتی ہیں۔

لفظ ''معما'' تو سبھی نے سنا ہوگا۔ بہتوں نے تو معمے حل بھی کیے ہوں گے۔ یہ تو آپ جانیں کہ یہ ''کھیل'' کیسا ہے؟ مناسب یا غیر مناسب؟ مگر فانی کے اس مشہور شعر کو اگر آپ نے یوں لکھ دیا:

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کا ہے کو ہے، خواب ہے دیوانے کا

تو ضرور کہا جائے گا کہ پہلے مصرعے میں ایک لفظ کا املا غلط ہے۔ ''معمہ'' کوئی لفظ نہیں، اس کی صحیح صورت ''معما'' ہے۔ یعنی پہلے مصرعے کو یوں کہنا چاہیے تھا۔

ایک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

اضافت کی صورت میں اس کو (مثلاً) ''معمائے حیات'' لکھا جائے گا۔ فرض کر لیجیے کہ کسی شعر میں یہ مرکب آ گیا اور لکھنے والے نے اس کو ''معمۂ حیات'' لکھ دیا تو مصرع ہی بحر سے

خارج ہو جائے گا۔

اسی طرح کچھ لفظ ایسے ہیں جو ایک معنی میں ''الف'' سے اور ایک معنی میں ''ہ'' سے صحیح ہیں۔ اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ جملے میں صحیح لفظ کو استعمال کیا جائے۔ بے احتیاطی کی وجہ سے معنی بدل سکتے ہیں اور ختم بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی یہ ہو سکتا ہے کہ غلط املا کے سبب معنی ہی چوپٹ ہو جائیں۔

ایسے خاص خاص لفظ یہ ہیں:

- آسیا: چکی... آسیہ: فرعون کی بیوی کا نام۔
- پارا: جسے فارسی میں ''سیماب'' کہتے ہیں... پارہ: ٹکڑا
- چارا: جانوروں کی خوراک کے کام آتا ہے... چارہ: تدبیر
- خاصا: جیسے: اچھا خاصا... خاصہ: وہ نفیس چیز جو بادشاہوں یا اُمرا و وزرا کے لائق ہو۔
- دانا: عقل مند، جاننے والا... دانہ: جیسے آب و دانہ۔
- شیوا: فصیح و بلیغ، جیسے: شیوابیان شاعر... شیوہ: ناز و کرشمہ، طرز و روش وغیرہ۔ جیسے: بتِ ہزار شیوہ۔
- زَہرا: حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا لقب... زَہرہ: پِتّا... زُہرہ: ایک مشہور ستارے کا نام
- لالا: روشن، چمک دار، جیسے: لولوے لالا... لالہ: مشہور پھول۔ لالا کرم چند، یہ ''لالا'' بھی الف سے لکھا جائے گا۔
- نالا: ندی نالا... نالہ: نالہ و فریاد
- نا: تاکید کے لیے، جاؤنا، کھاؤنا۔ دیکھونا، وہ کیا کر رہے ہیں۔ یا جیسے: ہم تو کہتے تھے، اب دیکھو، روپے مل گئے نا... نہ: نفی کے لیے، جیسے: نہ کرو، نہ جاؤ۔

اسی طرح ایک لفظ ہے: اَش اَش: اَش اَش کرنا یا اَش اَش کر اُٹھنا، اسی سے بنتے ہیں۔ اس میں دونوں جگہ الف ہے۔ اس کو ع سے ''عش عش'' لکھنا صحیح نہیں۔

ایک اور لفظ ہے: ''لال'': مشہور رنگ، ایک چھوٹا سا خوبصورت پرندہ۔ بیٹے اور لڑکے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ ایک اور لفظ ہے: لعل۔ اب ان دونوں لفظوں کے استعمال میں اس طرح امتیاز کرنا چاہیے کہ رنگ، پرندے اور لڑکے کے معنوں میں ''لال'' لکھنا چاہیے۔ جیسے میرے لال، لال رنگ، لال اُڑ گئے؛

اور مشہور قیمتی پتھر کے معنی میں ''لعل'' لکھنا چاہیے، جیسے: لعل و گوہر، لبِ لعلیں، لعلِ نایاب۔

اس لیے یہ بہت ضروری ہے کہ لکھنے والے کو ہر لفظ کا صحیح املا معلوم ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ صحتِ املا سے متعلق اور ضروری باتیں بھی اس کے علم میں ہوں۔

۳۔ مکمل اور برمحل نقطے:

لفظ، مجموعہ ہوتا ہے حرفوں کا۔ چند حرف ملتے ہیں تو لفظ بنتا ہے۔ حرفوں کو ایک دوسرے سے ملا کر لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں لایا جائے۔ جیسے ایک حرف ہے ''ب''، جب یہ لفظ کے آخر میں آتا ہے تو اس کو اسی طرح لکھا جاتا ہے، جیسے: اب، جب۔ مگر جب یہ شروع میں یا بیچ میں آتا ہے تو الگ الگ حرفوں کے ساتھ اس کی الگ الگ شکلیں بن جاتی ہیں، جیسے: بت، بج، بس۔ اب اِس حرف کی چار شکلیں ہوئیں۔ ایک مفرد حالت میں، تین مرکّب حالت میں۔ بہت سے حرف اِسی طرح شکلیں بدلتے ہیں۔

کسی لفظ میں بس دو حرف ہوں تو عام طور پر اس کے لکھنے یا پڑھنے میں الجھن نہیں ہوتی۔ اگر کوئی لفظ تین یا چار یا اور زیادہ حرفوں کا مجموعہ ہو تو الجھن پیدا ہو سکتی ہے۔ مثلاً ایک لفظ ہے ''بنتا۔'' اِس میں چار حرف ہیں۔ شروع کے تین حرف (ب، ن، ت) ایک ہی گروپ کے ہیں۔ اِن کے جوڑ ایک ہی طرح لگتے ہیں، یعنی یکساں شوشوں کی صورت میں اِن کو لکھا جاتا ہے۔ بس نقطوں کی مدد سے ان کو پہچانا جاتا ہے۔ اب اگر نقطے پورے پورے نہ لگائیں جائیں یا صحیح جگہ پر نہ ہوں تو ظاہر ہے کہ لفظ کی لکھاوٹ غلط ہو جائے گی۔ کوئی شخص اٹکل سے پڑھ لے تو پڑھ لے، ورنہ عام طور پر اس لفظ کو غلط ہی پڑھا جائے گا۔ غلط پڑھا گیا تو معنی بدل جائیں گے یا چوپٹ ہو جائیں گے۔ یا جیسے ایک لفظ ہے ''نبی'' (ن، ب، ی) اس میں ن اور ب کے نقطے ذرا اِدھر اُدھر ہو جائیں تو معنی ہی بدل جائے گا۔ یا جیسے ایک لفظ ہے ''رجحان'' (ر، ج، ح، ا، ن) اس کو بہ آسانی ''رحجان'' (ر، ح، ج، ا، ن) پڑھا جا سکتا ہے۔ دسویں درجے کے نصاب میں ایک غزل تھی، جس کے مطلع کا پہلا مصرع یہ تھا: ''دل مت ٹپک (پ ٹ ک) نظر سے کہ پایا نہ جائے گا۔'' اس مصرعے کو بار ہا اس طرح پڑھا گیا: ''دل مت ٹپک (ٹ پ ک) نظر سے کہ پایا نہ جائے گا۔'' وجہ یہ تھی کہ کتاب

میں یہ لفظ اس طرح چھپا ہوا تھا کہ ٹ کی ط اور پ کے نقطے اپنی اپنی جگہ سے ادھر اُدھر ہو گئے تھے۔ مطلب یہ نکلا کہ ہر حرف کے نقطے بالکل ٹھیک ٹھیک جگہ پر ہونے چاہییں۔

٤- پورے شوشے:

جلدی میں اپنی کاپی میں آپ جو لکھیں اور جیسے لکھیں، آپ جانیں اور آپ کا پھوہڑ پن، مگر جب کسی کو خط لکھا جائے، کوئی مضمون تحریر کیا جائے، امتحان کی کاپی میں جوابات لکھے جائیں یا اور کچھ لکھا جائے جو سب کے لیے ہو، تو اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ حرفوں کے جوڑ قاعدے کے مطابق ہوں اور شوشے بھی ٹھیک ٹھاک ہوں۔ یہ نہ ہو کہ ''صبح'' کو ''صبح'' یا ''کسنا'' کو ''کسنا'' لکھ دیا جائے (وغیرہ) اور یہ بھی نہ ہو کہ آپ کی تحریر پٹواری کا اندراج بن کر رہ جائے، جس کو وہ خود ہی پڑھتا ہے، یا وہ اُن حکیم صاحب کا نسخہ ہو جن کے لکھے کو اُن کے خاص عطار کے سوا اور کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ وہ حکایت تو سنی ہوگی آپ نے کہ محلے کا ایک بے پڑھا شخص ایک صاحب کے پاس خط لکھوانے کے لیے آیا۔ اُن صاحب نے کہا کہ بھائی! میں تمہارا خط لکھ تو دیتا، مگر میرے پیروں میں درد ہے، میں چل پھر نہیں سکتا۔ اُس شخص نے حیران ہو کر پوچھا کہ خط لکھنے کو پیروں کے درد سے کیا نسبت ہے؟ جواب میں انھوں نے کہا: ''جب میں کسی کو خط لکھتا ہوں تو پھر پڑھنے کے لیے بھی مجھی کو جانا پڑتا ہے۔''

کوئی شخص کسی کو بددعا دے رہا ہو، یا برا بھلا کہہ رہا ہو تو آپ نے دیکھا ہوگا اچھے خاصے آدمی کا چہرہ بدل جاتا ہے۔ نہیں نہیں! بگڑ جاتا ہے۔ منہ کیسا بن جاتا ہے؟ آنکھیں کیسی بھیانک ہو جاتی ہیں اور رنگ کیسا بدل جاتا ہے؟ زبان کے بگڑنے سے جس طرح چہرہ بگڑ جاتا ہے، اُسی طرح تحریر کے بگاڑ سے لکھنے والے کی شخصیت گہنا جاتی ہے۔ پڑھنے والے کی آنکھیں فوراً دل تک یہ بات پہنچاتی ہیں کہ یہ شخص یا تو اول جلول ہے یا بہت بے پروا ہے، یا یہ کہ اس کے دل میں مکتوب الیہ کے لیے لحاظ اور مروت کچھ کم ہے۔ سب کا خط اچھا ہو، اس کی امید نہیں کرنا چاہیے، مگر یہ مختلف بات ہے۔ خط اچھا نہ ہو، یہ تو ایک بات ہوئی اور بے ڈھنگے پن کے ساتھ لکھنا دوسری بات ہے۔ خط جیسا بھی ہو، اگر لفظ میں شامل حرفوں کی ترتیب درست ہے، جوڑ ٹھیک ہیں، شوشے پورے ہیں، نقطے صحیح جگہ پر ہیں اور جلد بازی یا بے پروائی کا پیدا کیا ہوا

آڑا تر چھا پن نہیں ہے تو یہ کافی ہے۔

۵- صحیح جوڑ:

دو لفظوں کو بلا وجہ ملا کر نہیں لکھنا چاہیے۔ اُردو میں نقطے، شوشے، جوڑ، حرفوں کی مختلف صورتیں، یہ سب اس قدر اور اس طرح ہے کہ ان سب کے ساتھ دو یا زیادہ لفظوں کو ملا کر لکھنا، نگاہ کو مزید آزمائش میں مبتلا کرنا اور طالب علم کو حیران کرنا ہے۔ لکھنے اور پڑھنے کی آسانی اس میں ہے کہ لفظوں کو ملا کر نہ لکھا جائے۔ اس سے پڑھنے میں آسانی اور لکھنے میں سادگی کا فائدہ حاصل ہوگا۔ زبان صرف اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کے لیے نہیں ہوتی، وہ طالب علموں اور کم خواندہ لوگوں کے لیے بھی ہوتی ہے۔ ایک لکھا پڑھا آدمی ''نیکبخت'' کے پڑھنے میں الجھن نہیں محسوس کرے گا، مگر ابتدائی درجوں کے طلبہ اور معمولی سطح کے آدمیوں کو اس کے پڑھنے میں اُلجھن سے آنکھیں چار کرنا پڑیں گی۔ اس لیے ماہرین نے یہ طے کیا ہے کہ: ''مرکب لفظ جو دو یا زیادہ لفظوں سے بنے ہوں، آپس میں ملا کر نہ لکھے جائیں، بلکہ ہمیشہ الگ الگ لکھے جائیں۔'' اس کی پابندی کرنا چاہیے۔

٦- علامات کا درست استعمال:

ہمارے ہاں چونکہ تحریر و تحقیق اور تصنیف و تالیف کی تربیت کا رواج نہیں ہے، اس لیے بعض الفاظ کے مجموعے کو ''جملہ'' اور چند یا خاص جملوں کے مجموعے کو ''مضمون'' کا نام دے دیا جاتا ہے۔ آج کل اردو میں لکھی جانے والی اکثر تحریروں میں آپ کو پورے پورے مضامین میں ''علاماتِ وقف'' کا برمحل استعمال نظر نہیں آئے گا۔ جملہ شروع ہوگا تو پھر پیراگراف کے آخر میں ایک ختمہ (۔) ملے گا۔ یہ مزاج اخبارات کا بھی ہے اور رسائل کا بھی۔ تحریر کی علامات (مثلاً سکتہ، ختمہ، ندائیہ وغیرہ) تحریر کا سولہ سنگار (میک اَپ) ہیں۔ ان سے تحریر میں خوبصورتی اور کشش پیدا ہوتی ہے۔ ان سے قلم کار کا مدعا بیان کرنا آسان ہوتا ہے۔ انگریزی ادب میں ان تمام علامات کے اصول اور معیارات مقرر ہیں اور ان کے مطابق ہی ان علامات کا تحریروں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ان علامات کے استعمال کا معاملہ اس قدر حساس ہے کہ محض معمولی سے ردوبدل سے جملے کا مفہوم بدل سکتا ہے۔ اس کی مثالیں ''رموز اوقاف'' کے بیان میں دی جارہی ہیں۔ اس لیے ان علامات کو سیکھیے اور پابندی

سے استعمال کیجیے۔ہم آپ کی آسانی کے لیے تحریر کی ظاہری خوبیوں میں سے املا (نقطے، شوشے اور جوڑ اسی میں آجاتے ہیں) اور رموزِ اوقاف کو مختصراً بیان کیے دیتے ہیں۔اس کے بعد معنوی خوبیوں کا بیان شروع کریں گے۔

اردو املا

تعریف:

"املا" باب افعال سے عربی مصدر ہے اور عربی میں اس کا صحیح املا ہمزہ کے ساتھ اس طور پر ہوگا: "املاء" لیکن اردو میں (ہمزہ والے دیگر الفاظ کی طرح) املا کا لفظ ہمزہ کے بغیر لکھا جاتا ہے۔
املا کے لغوی معنی ہیں: لکھنا، لکھوانا اور رسی دراز کرنا۔

اصطلاح میں "املا" سے مراد کسی لفظ کو مقررہ ضابطوں کے ساتھ اس طرح لکھنا ہے کہ بولنے اور پڑھنے میں اسے صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کیا جا سکے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ:

(الف) کسی خاص لفظ کے لیے جو حروف مخصوص ہیں، وہ لفظ انہی حروف کی مدد سے لکھا گیا ہو، مثلاً: علم بمعنی جھنڈا کو "ع ل م" کے بجائے "ا ل م" سے لکھنا صحیح نہ ہوگا۔

(ب) حروف کو باہم ملانے کے جو اصول مقرر ہیں ان کی پابندی کی گئی ہو، یعنی ہر لفظ میں حروف، ان کے شوشے اور جوڑ وغیرہ کسی ضابطے کے تحت بنائے گئے ہوں۔

(ج) حسب ضرورت ہر لفظ کے حروف پر اعراب یعنی زیر، زبر، پیش اور تشدید و تنوین وغیرہ کے نشانات لگائے جائیں۔ مثلاً "مُقدّم" کے لفظ میں جب تک "میم" پر پیش اور "ق"، "د" پر تشدید کا نشان نہ ہوگا، صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا اور بولنا مشکل ہوگا، اس لیے کہ اس شکل کا دوسرا لفظ "مقدم" (خیر مقدم) بھی ہے اور بغیر اعراب و تشدید کے "مُقدّم" اور "مَقدَم" ایک ہو جائیں گے۔

ضرورت واہمیت:

املا کے قواعد واصول، درست نویسی اور درست خواندگی کے لیے وضع کیے جاتے ہیں۔ دنیا کی ساری ترقی یافتہ زبانوں میں املا کے ضابطوں کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے۔جس طرح یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم جس لفظ کو بول رہے ہیں، اُس کا مفہوم کیا ہے، اُسی طرح یہ بات بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہم جس لفظ کو لکھنا چاہتے ہیں، اُس کی صحیح صورت کیا ہے۔ کسی لفظ کا تلفظ اپنے مروّج املا سے خواہ کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو، لکھتے وقت اس کا جو املا مقرر اور متعین ہے، اسی طرح لکھیں گے، لیکن آج کل اس حوالے سے حد درجہ کی کوتاہی پائی جاتی ہے۔ حروف کی اشکال، شوشے اور جوڑ تو سرے سے قابل توجہ ہی نہیں سمجھے جاتے۔ ایک حرف کو دوسرے حرف سے بغیر کسی قاعدے کے آزادانہ ملا دیا جاتا ہے۔ ابتدائی جماعتوں سے لے کر منتہی درجات کے طلبہ تک ایک حرف کو دوسرے سے جس طرح چاہتے ہیں ملا دیتے ہیں، صحیح شوشہ نہیں لگاتے۔

آج کے طالب علموں یا فارغ التحصیل نوجوانوں کو عام طور پر یہ معلوم ہی نہیں کہ اردو کے حروف تہجی جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہاں کہاں اور کیا کیا شکلیں بدلتے ہیں یا اردو تحریر میں رموز اوقاف اور بعض دوسری علامتوں کا استعمال کہاں کہاں ہوتا ہے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ مکتبوں اور ابتدائی مدرسوں میں کئی سال تک تختیوں پر لکھنے کی مشق کرائی جاتی تھی۔ خوش خطی کی کاپیاں اس پر مزید تھیں۔ پہلے الگ الگ حروف پھر انہیں ایک دوسرے سے ملا کر لکھوایا جاتا تھا۔ املا الگ سے بولا جاتا تھا۔ معلم ہر طالب علم کا کام روزانہ فرداً فرداً دیکھتا تھا اور ہر ایک کو بتاتا تھا کہ کون سا حرف کس طرح ملایا جائے گا اور کون سی علامت کہاں استعمال ہوگی؟ اس رواج کو پھر سے زندہ کرنا چاہیے، ورنہ اردو املا انتشار کا شکار ہوتا چلا جائے گا۔

اردو املا کا ایک اہم اصول:

ان شاء اللہ خان انشا نے "دریائے لطافت"، میں لکھا ہے:

"جو لفظ اردو میں آیا وہ اردو ہوگیا، خواہ وہ لفظ عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی، اصل کی رُو سے غلط ہو یا صحیح، وہ لفظ اردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی

صحیح اور اگر اصل کے خلاف ہے تو بھی صحیح۔ اس کی صحت اور غلطی اس کے اردو میں رواج پکڑنے پر منحصر ہے کیونکہ جو چیز اردو کے خلاف ہے، وہ غلط ہے، گو اصل میں صحیح ہو اور جو اردو کے موافق ہے، وہی صحیح ہے، خواہ اصل میں صحیح نہ بھی ہو۔"

کسی لفظ کے تلفظ اور استعمال کے بارے میں انشا کی اس رائے کو اردو کے سارے علماء و ماہرین نے تسلیم کیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ اردو املا میں عربی فارسی کے قواعد اور عروض کو نہیں بلکہ رواج عام اور قبول عام کو ترجیح دینا چاہیے۔

چند متفرق قواعد

یہاں چند ایسے مشہور الفاظ کا صحیح املا اور انہیں درست لکھنے کے قواعد بیان کیے جاتے ہیں جن کے حوالے سے عموماً نئے لکھنے والوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے۔

ہمزہ:

(۱) عربی کے جن الفاظ کے آخر میں ہمزہ بطور حرف اصلی آتا ہے وہ اُردو املا میں "ہمزہ" کے بغیر لکھے جائیں گے، مثلاً: "ابتداء" کا املا اُردو میں "ابتدا" ہوگا، لیکن اگر اس قسم کے لفظوں پر تنوین آئے گی تو ہمزہ برقرار رہے گا، یعنی ابتدا کو تنوین کے ساتھ لکھیں تو "ابتداءً" لکھا جائے گا۔

(۲) ضیا، ثنا اور علا کے الفاظ عربی میں ہمزہ کے ساتھ ضیاء، ثناء اور علاء ہیں۔ اُردو میں جب اس طرح کے الفاظ مفرد استعمال ہوں گے، بغیر ہمزہ لکھے جائیں گے، لیکن جب عربی اضافت کے ساتھ آئیں گے تو ہمزہ لکھا جائے گا۔ جیسے ضیاء الاسلام، ثناء اللہ اور علاء الدین میں۔

(۳) مسئلہ: اس لفظ پر ہمزہ ضرور لکھنا چاہیے۔ اس لیے کہ اس کا غلط تلفظ عام ہوتا جا رہا ہے۔

(٤) "سوائے" اور "بجائے" کی یائے تحتانی پر ہمزہ آئے گا۔

(٥) مؤنث، مؤخر، مؤثر، اسرائیل، آئینہ، مؤدب اور اس طرح کے دوسرے عربی فارسی الفاظ جن کے درمیان میں ہمزہ لکھا جاتا ہے، اُردو میں بھی لکھا جائے گا۔

(٦) ہندو اور بچھو کی جمع ہندوؤں اور بچھوؤں پر ہمزہ لکھا جائے گا۔

نون اور نون غنہ:

(۱) بعض الفاظ مثلاً سوچنا اور سیکڑا کو بعض نون غنہ کے ساتھ سونچنا اور سینکڑا یا سیکڑہ لکھتے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ نون غنہ کے بغیر "سوچنا" اور "سیکڑا" ہی لکھنا چاہیے۔

(۲) کاٹنا کے حاصل مصدر "کاٹ" کو بعض نون غنہ کے ساتھ "کانٹ" لکھتے ہیں جبکہ

چھانٹنا کے حاصل مصدر چھانٹ کو بعض نون غنہ کے بغیر لکھتے ہیں، جیسے: کانٹ چھاٹ، یہ درست نہیں، کاٹ چھانٹ لکھنا چاہیے۔ اس قسم کی غلطی بانٹنا (تقسیم کرنا) اور بٹنا (تقسیم ہونا) کے مصادر کے استعمال میں کئی جگہ دیکھنے میں آتی ہے۔ احتیاط کرنی چاہیے کہ پہلے میں نون غنہ ہے نہ کہ دوسرے میں۔

دہری واؤ:

دوکان اور دوہرا میں "واو" کی ضرورت نہیں، بغیر واو کے " دکان" اور ''دہرا'' لکھنا چاہیے۔

ہائے اصلی و ہائے مختفی:

(۱) جب کسی لفظ کے آخر میں ''ہائے مختفی'' (اسے ہائے غیر ملفوظی بھی کہتے ہیں) ماقبل سے متصل ہو کر آئے گی تو صرف ایک مختصر شوشے کے ساتھ لکھی جائے گی، جیسے: مہ، بہ، نہ، یہ وغیرہ۔ لیکن اگر ہائے ملفوظی ہوگی تو دو شوشے آئیں گے، جیسے: کہہ (کہا سے) سہہ (سہا سے) بہہ (بہا سے)۔ یہ قاعدہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ اکثر اس میں غلطی ہوتی ہے۔

(۲) شبیہہ اور وجیہہ میں دو "ہ" آتی ہیں، پہلی ہائے ملفوظی کی حیثیت میں، دوسری ہائے مختفی کی حیثیت سے۔ ان لفظوں کو اسی طرح لکھنا چاہیے۔

(۳) "بالمشافہہ" کو اکثر بالمشافہ لکھا جاتا ہے، یہ غلط محض ہے۔ اس کے آخر میں دو "ہ" آتی ہیں۔ ایک ''ہائے ہوز'' اور دوسری ''ہائے مختفی''۔ دونوں لکھی جائیں تاکہ پڑھنے میں غلطی نہ ہو۔ بالمواجہہ کی بھی یہی صورت ہے۔

(٤) عربی و فارسی کے ایسے الفاظ جن کے آخر میں ہائے مختفی آتی ہے، جب فارسی ترکیب میں مضاف یا موصوف ہوں گے تو اظہارِ اضافت کے لیے "ہا" کے نیچے زیر کے بجائے اوپر ہمزہ لگایا جائے گا، جیسے: نالۂ دل، تذکرۂ شعرا، بندۂ خدا، دیدۂ خونبار، بندۂ ناچیز، حوصلۂ دل، نامۂ شوق وغیرہ۔

(۵) تقاضا، تحاشا، تماشا کو بعض الف کے بجائے ''ہائے مختفی'' سے تقاضہ، تحاشہ اور تماشہ لکھتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ الف سے لکھنا چاہیے۔

(٦) "مزہ" کا لفظ فارسی ترکیب میں ہائے مختفی کے ساتھ اور اُردو میں الف سے لکھا جائے، جیسے: کلفٹن کی سیر میں بڑا مزا آیا۔

(٧) پروا: کا املا "پرواہ" یکسر غلط ہے۔ ہمیشہ "پروا" لکھنا چاہیے۔

عربی الفاظ:

(١) زکوٰۃ اور صلوٰۃ کو عربی کے مطابق لکھنا بھی جائز ہے اور ان کے تلفظ کے مطابق اُردو میں زکات اور صلات بھی لکھا جا سکتا ہے۔

عربی کے جن الفاظ کے آخر میں گول "ۃ" پر تنوین آتی ہے، ان میں الف کے اضافہ کے بغیر تنوین لگانی چاہیے۔ جیسے: فطرۃً، قدرۃً، حقیقۃً وغیرہ۔

(٢) غلطی بمعنی خطا اُردو ہے۔ اس لیے عربی کی تقلید میں اس کے لام پر زبر لکھنا مناسب نہیں۔

(٣) عربی کے مصدر "مُفاعلہ" اور اس وزن کے دوسرے مصادر، مثلاً: مشاعرہ، مصافحہ، معاملہ، مباحثہ، معاشقہ، معاہدہ، مطالعہ، محاسبہ، مشاہدہ، موازنہ وغیرہ کے چوتھے اور پانچویں حرف پر زبر آتا ہے اور عربی میں ان کا تلفظ اسی طرح کیا جاتا ہے، لیکن اُردو میں چوتھے حرف کے زبر کو زیر سے بدل لیتے ہیں یا چوتھے حرف کو ساکن کر لیتے ہیں۔ عام وخاص سب کا یہی طرزِ عمل ہے، اس لیے عربی کی تقلید میں اسی نوع کے الفاظ کے چوتھے حرف پر زبر لکھنا درست نہ ہوگا۔

(٤) بعض حضرات نے جمادی الاول، جمادی الثانی اور غوث الاعظم کو جمادی الاولیٰ، جمادی الآخرہ اور الغوث الاعظم لکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ عربی کی رُو سے یہی درست بھی ہے، لیکن اول الذکر صورتیں "غلط العام فصیح" میں داخل ہو گئی ہیں، اس لیے اسی صورت میں لکھنا چاہیے۔

(٥) تحتَ الثَّرٰی ...... میں دوسری ت اور ث پر زبر یا کھڑی زبر لکھنا چاہیے تا کہ تلفظ میں غلطی نہ ہو۔

(٦) "جز" بمعنی حصہ۔ عربی میں ہمزہ کے ساتھ "جزء" ہے، لیکن اردو املا کا عام اصول یہ ہے کہ عربی الفاظ کے آخر کا ہمزہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اسے "جز" لکھنا چاہیے، لیکن اردو میں چونکہ اسی شکل کا دوسرا لفظ "جز" بمعنی "بجز" بھی مستعمل ہے، اس لیے دونوں میں فرق

کرنے کے لیے اردو میں جز بمعنی حصہ کو " جزو" یعنی واو کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اس کا رواج عام ہے۔ مرکبات میں بھی واو کے ساتھ لکھتے ہیں جیسے: جزوِ بدن، جزوِ کلام، جزوی بحث وغیرہ۔ البتہ بہتر یہ ہے کہ مرکبات میں تو واؤ کے ساتھ ہی لکھا جائے لیکن مفرد کے طور پر ''جز'' لکھا جائے تاکہ کوئی اسے ''جُزْوْ'' نہ پڑھے۔ ''جیسا بولو ویسا لکھو'' کا قانون بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔

(۷) طالب کی جمع "طلبہ" کو اردو املا میں ''طلبا'' بھی لکھتے ہیں۔ اگرچہ عربی قاعدے کے مطابق یہ درست نہیں، لیکن چونکہ طلبہ اور طلبا دونوں کا رواج عام ہو چکا ہے اس لیے دونوں طرح لکھنا درست ہے، البتہ ترجیح "طلبہ" کو دینا چاہیے۔

(۸) انشاءاللہ کو بعض نے "ان شاءاللہ" لکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ مشورہ غلط نہیں ہے، لیکن اردو میں انشاءاللہ ہی مروّج ہے۔ بندھے بندھائے الفاظ کے جوڑ الگ کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

(۹) ازدحام " ہجوم" کے معنی میں عربی لفظ ہے۔ اسے ز کے بجائے ژ سے اژدہام لکھنا صریحاً غلط ہے۔

فارسی تراکیب (مرکبِ اضافی وتوصیفی):

(۱) فارسی ترکیب میں جبکہ مضاف یا موصوف کے آخر میں ''حروفِ مدّہ'' یعنی الف، واور ی نہ ہو، تو مضاف یا موصوف کے نیچے زیر لکھا جائے گا، جیسے: دلِ غمگین، گلِ رنگین، غمِ روزگار، رسمِ جفا، خونِ جگر، حسنِ نظر، نگاہِ بلند، وغیرہ۔

(۲) فارسی عربی کے ایسے الفاظ جن کا آخری حرف ''یائے معروف'' ہو، جب فارسی ترکیب میں مضاف یا موصوف ہوں گے تو " ی" کے نیچے اضافت کو ظاہر کرنے کے لیے زیر کا نشان لگایا جائے جیسے: طوطیِ ہند، درستیِ اخلاق، خرابیِ بسیار، شوخیِ رفتار، سختیِ ایام، زندگیِ دوام، روشنیِ طبع، مفتیِ زماں، قاضیِ شہر، شادیِ مرگ وغیرہ۔ بعض نے زیر کے بجائے "ی" پر ہمزہ لکھنے کا مشورہ دیا ہے لیکن اُردو املا میں "ی" کے نیچے زیر لگانا ہی مناسب ہے، اس لیے کہ تلفظ سے یہی قریب تر ہے۔

(۳) فارسی عربی کے ایسے الفاظ جن کا آخری حرف ''یائے مجہول'' ہو، جب فارسی ترکیب

میں مضاف یا موصوف ہوں گے تو اضافت کے اظہار کے لیے نہ ہمزہ کی ضرورت ہوگی نہ زیر کی، اس لیے کہ ایسی جگہ "ے" کسرۂ اضافت کی نیابت کر لیتی ہے، جیسے: شے لطیف اور مے ناب، بغیر ہمزہ لکھے جائیں گے۔

(٤) عربی و فارسی کے جن الفاظ کے آخر میں الف، واؤ اور ہمزہ میں سے کوئی حرف ہوتا ہے تو فارسی ترکیب میں اضافت کے وقت ان کے بعد بڑی "ے" لگا دی جائے گی اور "ے" پر ہمزہ نہیں لکھا جائے گا، جیسے: دریا سے دریائے عشق، سودا سے سودائے خام، ابتدا سے ابتدائے شوق، انتہا سے انتہائے کرم، بلا سے بلائے جان، دوا سے دوائے درد، سو سے سوئے خیال، کو سے کوئے یار، بو سے بوئے گل، آرزو سے آرزوئے دل وغیرہ۔ یہ قاعدہ خصوصیت سے یاد رکھنا چاہیے۔ غالب نے اس قسم کی فارسی ترکیبوں کی "ے" پر ہمزہ لکھنا عقل کو گالی دینا کہا ہے۔

(٥) دُوُم: (دوسرا) میں دال روا وٗ دونوں پر پیش ہے۔ اسے دوئم لکھنا غلط ہوگا۔ البتہ دوم (واوِ مجہول کے ساتھ) مشہور عام ہو چکا ہے۔

(٦) سِوُم: میں س مکسور اور واؤ مضموم ہے، اس لیے سوئم یا سویم یا سیوم لکھنا غلط ہوگا۔ البتہ سوم (واوِ مجہول کے ساتھ) مشہور ہو چکا ہے۔

الفاظ کے اندر اعداد:

عبارت کے اندر اعداد کے اظہار کے لیے ہندسوں کے بجائے الفاظ استعمال کیے جانے چاہییں، یعنی ٣٠٠ روپے کو تین سو روپے، 2½ مں کو ڈھائی من، ١٢ آنے کو بارہ آنے لکھنا چاہیے۔ اس سے مغالطے کی گنجائش نہ رہے گی۔

متفرق:

(١) ایک لفظ ہے "مطمحِ نظر" اسے عام طور پر "مطمعِ نظر" لکھا جاتا ہے۔ اساتذہ نے اسے غلط قرار دیا ہے۔

(٢) "مسالا" خواہ کھانے میں ذائقے کے لیے ڈالے جانے والے اجزا کے لیے استعمال ہو اور گرم مسالا کے لوازم میں سے ہو یا "گارے" یا "چونے" کے معنی میں، اس طرح لکھا جائے

گا: ''مسالا''۔ بعض لوگ مصالحہ یا مسالہ لکھتے ہیں، لیکن مصالحہ کے معنی ہیں: ''لڑنے والے دو فریقین کے درمیان صلح''، اس لیے اساتذۂ فن نے پہلے کو درست قرار دیا ہے۔

(۳) ''نقطۂ نظر'' بمعنی سوچ، خیال، نظریہ، مرکزِ نگاہ (Point of view) ہے، جبکہ بعض لوگ ان معنوں میں ''نکتۂ نظر'' لکھتے ہیں۔ نکتہ باریکی، تہہ کی بات، لطیفہ یا چٹکلا کے معنی رکھتا ہے۔ جب سوچ یا نظر کا ارتکاز بیان کرنا مطلوب ہو تو ''نقطۂ نظر'' لکھنا چاہیے کہ اس میں وسعت نہیں، تحدید ہے۔ جب زاویۂ نگاہ میں کسی قدر وسعت ہو اور ایک سے زیادہ احتمالات ہوں تو ''نکتۂ نظر'' لکھنا چاہیے۔

(٤) موقع: کو ہائے مختفی کے ساتھ ''موقعہ'' لکھنا غلط محض ہے۔ ''موقع'' لکھنا چاہیے۔

(٥) فُلاں: کنایہ ہے شخص یا فرد سے، اس کی ف میں ہمیشہ پیش لکھنا چاہیے۔

(٦) متوفیٰ: بمعنی وفات پایا ہوا، میں کھڑی الف لگانا ضروری ہے۔ جو لوگ متوفی لکھتے ہیں غلطی پر ہیں۔

(۷) انگریزی کے وہ الفاظ جن کے شروع میں ایس (S) آتا ہے اور تلفظ میں ای (E) کی آواز نکلتی ہے، اُردو املا میں الف سے لکھے جائیں گے، جیسے: اسکول، اسپیشل، اسٹیٹ، اسپورٹ، اسٹول وغیرہ۔

مشق

۱-تحریر کی ظاہری خوبیوں میں سے ہر ایک کی تین تین سطری وضاحت لکھیں۔

۲-''تصحیح املاء'' کی اہمیت ذکر کریں۔ نیز متعلقہ دو عنوانات کے تحت دی گئی تفصیل پڑھنے سے آپ کی کون کون سی اغلاط کی اصلاح ہوئی؟ کاپی پر خانے بنا کر درست غلط بالتفصیل لکھیں۔

۳-''ان شاء اللہ خان انشاء'' کا ضابطہ اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

٤-متفرق قواعد کے تحت جو عوامی غلطیاں آپ کے علم میں آئیں، انہیں بالترتیب و بالتفصیل لکھیں۔

٥-''جیسا سنو ویسا لکھو'' اور ''غلط عام فصیح'' ان ضوابط کی تشریح مثالوں سمیت کریں۔

اُردو کے رموز اوقاف

تحریر میں ظاہری حسن پیدا کرنے اور اس کی تفہیم میں آسانی کے لیے کچھ علامات کے استعمال کا رواج قدیم زمانے سے ہوتا چلا آیا ہے، البتہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شکلیں تبدیل ہوتی رہی ہیں۔ ہر دور کے اہل علم اس کی پابندی کرتے رہے ہیں۔ ان سے جہاں پڑھنے والے کو معانی و مفاہیم سمجھنے اور انہیں ذہن نشین کرنے میں آسانی ہوتی ہے، وہیں ایسی غلطیوں سے بھی بچا جاسکتا ہے جو ان علامات کے عدم استعمال یا بے موقع اندراج سے پیدا ہوتی ہیں۔

انسان کا خاصہ ہے کہ بات کرتے وقت یا تقریر کے دوران کبھی آواز کو پست کرتا ہے کبھی بلند، کہیں رُک رُک کر بات کرتا ہے تو کہیں بالکل ٹھہر جاتا ہے، ان تمام صوتی کیفیات یا حرکات وسکنات کو ظاہر کرنے کے لیے مختلف علامات ہیں جو عبارت میں استعمال ہوتی ہیں۔ معیاری ادبی جرائد میں بھیجی جانے والی ایسی کوئی تحریر قابل التفات نہیں سمجھی جاتی جو ان علامات کے برمحل استعمال سے مزین نہ ہو، لہٰذا ہمارے عزیز طلبہ کو اپنی تحریروں میں ان علامات کے صحیح استعمال کی مشق بھی کرنی چاہیے۔ یہاں ہم پہلے ان علامات کا جدول دیتے ہیں جن میں ان علامات کا نام تین مشہور عالمی زبانوں میں دیا گیا ہے، پھر ان کو تفصیل سے بیان کریں گے۔

رموز اوقاف کا جدول

رموز اوقاف	عربی نام	اردو نام	انگریزی نام
،	الشولة	سکتہ (چھوٹا ٹھہراؤ)	COMMA
؛	الشولة المنقوطة	وقفہ (ٹھہراؤ)	Seme Colon
.	النقطة	ختمہ (وقف تام)	Full Stop

:	النقطتان	رابطہ	Colon
؟	علامة الاستفهام	سوالیہ نشان	Sign of Inerogation
!	علامة الانفعال	ندائیہ، فجائیہ	Note of Exclamation
–	الشرطة	خط	Dash
" "	التضبيب	واوین	Inverted Commas
( )	القوسان أو الهلالان	بین القوسین	Brackets

علاماتِ وقف:

اُردو میں جو علامتیں عام طور پر استعمال کی جاتی ہیں اور مختلف قسم کے وقفوں کو ظاہر کرتی ہیں، ان میں سے مشہور یہ دس ہیں: سکتہ، وقفہ، ختمہ، سوالیہ، تأثریہ، تفصیلیہ، واوین، قوسین، مربع قوسین اور نقطے یعنی علامتِ حذف۔ ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

١- وقفِ خفیف یا سکتہ (،):

اس علامت سے جملے کے مختلف الفاظ یا چھوٹے چھوٹے مرکبات کو جدا رکھنے اور عبارت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ مختصر ترین علامت ہے۔ متکلم اس جگہ اپنی سانس توڑتا تو ہے، لیکن ٹھہرتا نہیں۔ اس کے استعمال کی عام صورتیں یہ ہیں:

(١) جملے میں تین یا تین سے زیادہ الفاظ جو ساتھ ساتھ استعمال کیے گئے ہوں، ان میں آخری لفظ سے پہلے "اور" کا لفظ اور بقیہ سب الفاظ کے بعد یہ علامت لائی جاتی ہے۔ اس علامت پر تھوڑا سا ٹھہرنا پڑتا ہے، مثلاً:

- محبت، اخلاق، نرم خوئی اور دل جوئی کے ذریعے مشکل سے مشکل کام آسان ہو جاتا ہے۔

- ایک قادر الکلام واعظ نے، رات کو ایک بڑے جلسے میں، ایسی ایمان افروز تقریر کی کہ بہت سے سامعین آبدیدہ ہو گئے۔ در و دیوار سے نعرہائے تحسین بلند ہوئے اور غیر مسلموں پر بھی اچھا اثر ہوا۔

(۲) ایک ہی جملے کے جوڑا جوڑا الفاظ کے درمیان یہ علامت لائی جاتی ہے، جیسے:
میاں! نزلہ ہو یا زکام، کھانسی ہو یا بخار، سر میں درد ہو یا جسم میں، یہ دوا ہر حال میں مفید ہے۔
(۳) بڑے بڑے جملوں کے درمیان حروفِ عطف یعنی: اس لیے، لیکن، آخر کار، اگرچہ، اور بلکہ وغیرہ آنے کی صورت میں، مثلاً:

"جب دوست کی طرف سے کچھ شکایت و کدورت پیدا ہو تو اس کو دل میں مخفی نہ رہنے دے، بلکہ صاف دلی اور بے تکلفی کے ساتھ دوست پر اس کا اظہار کر دے۔ اس سچے برتاؤ سے فوراً صفائی ہو جائے گی اور محبت میں فرق نہ آنے پائے گا، کیونکہ جب ایک بار دوستی ہو گئی تو ہر طور سے اس کے نباہ کی کوشش کرنی واجب ہے، اگرچہ نزاع و خصومت ہر حال میں ناروا ہے، لیکن محبت کے بعد عداوت کا ہونا تو سخت معیوب اور نہایت شرم کی بات ہے۔"

(٤) اگر چند جملے یکے بعد دیگرے آئیں اور وہ سب مل کر ایک معنی دیں، ان کی الگ الگ مستقل حیثیت نہ ہو تو ان کے درمیان سکتہ لگے گا۔ یہ بند پڑھیے:

"تحریر کے لیے ضروری ہے کہ قواعد و آدابِ زبان کی رعایت کی جائے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی باتوں کی ضرورت ہے، جو کثرتِ مشق اور مسلسل لکھتے رہنے، نیز اساتذۂ ادب و سخن کی نگارشات سے پیہم اور تقدیم و تاخیر، بوقتِ ضرورت درازنفسی و اختصار، سہولت، سلالت، شیرینی، ادائے پُرکشش، ایک خاص قسم کا اتار چڑھاؤ، موضوع کی مناسبت سے الفاظ کا انتخاب، جملوں کی خاص قسم کی نشست اور ایک ایسی طرزِ سخن کہ قاری جب مضمون یا کتاب کو ہاتھ میں لے، تو اسے از اول تا آخر پڑھے بغیر چین نہ آئے، شرط یہ ہو کہ وہ اسے شروع کر دے پھر ختم کیے بغیر وہ دم نہ لے سکے۔ یہ اور اس طرح کے دیگر عناصرِ تحریری کے بعد ہی کسی تحریر کو تحریر کہا جا سکتا ہے اور اسی طرح کی تحریروں سے مطلوبہ فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ان عناصر سے خالی نگارشات کو صرف "معتقدین" یا متعلقہ افراد، جنہیں ان کا پڑھنا اور ان سے فائدہ اٹھانا ناگزیر ہوتا ہے، پڑھتے ہیں اور جن "قرائے مستحقین" کے پڑھنے کے لیے، بلکہ پڑھوانے کے لیے لکھی گئی ہوتی ہیں، وہ انہیں ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔" (حرفِ شیریں: ٤٠)

(۵) اشعار میں ایسے مقامات پر سکتہ ضرور لگانا چاہیے جہاں لفظ آگے پیچھے ہوں یا ٹکڑوں کو

الگ الگ کر دینے سے مفہوم واضح ہو سکتا ہو۔ یہ شعر غور سے پڑھیے:

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں، معاف
آج کچھ درد، مرے دل میں سوا ہوتا ہے
(مرزا غالب)

یہی آئینِ قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہ عمل پر گامزن، محبوب فطرت ہے
(علامہ اقبال)

۲- وقفۂ منقوطہ (؛)

اسے انگریزی میں "سیمی کولن" کہتے ہیں۔ یہ علامت وہاں لگائی جاتی ہے جہاں "سکتے" سے زیادہ ٹھہرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُردو میں اس کے استعمال کی مندرجہ ذیل صورتیں ہیں:

(۱) جب ایک طویل جملے میں کئی چھوٹے جملے آئیں تو آخری جملے سے پہلے، جیسے:

"اس دور میں جب ہر طرف افراتفری کا عالم ہے، جب رشوت اور بدعنوانی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے، جب حق وصداقت کی تمام قدریں ختم ہوتی جارہی ہیں، جب عدل وانصاف عنقا ہو چکا ہے، جب لحاظ ومروّت کا نام تک نہیں رہا؛ ایسے میں اللہ والے دیانت دار اور وضع دار لوگوں کا وجود غنیمت ہے۔"

(۲) جملے کے ایسے حصوں کے درمیان علامت وقفہ لائی جاتی ہے جو الگ الگ حیثیت رکھتے ہوں، جیسے:

"مولانا حالی کی یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید، مقدمۂ شعر وشاعری؛ مولانا شبلی کی سیرۃ النبی، الفاروق، سوانح مولانا روم؛ مولانا علی میاں کی المرتضی، تاریخ دعوت وعزیمت، سیرت سید احمد شہید؛ اردو کی بلند پایہ تصانیف ہیں۔"

(۳) جب کئی لفظوں کے بیچ میں وقف خفیف (سکتہ، کاما) ہو، لیکن اس کی نوعیت مختلف ہو تو اس کے اظہار کے لیے بھی وقفہ لگایا جاتا ہے، جیسے:

- دہلی، بمبئی، کلکتہ؛ ان سب بڑے شہروں میں کچی بستیاں موجود ہیں۔
- سچائی، خلوص، ایمان داری؛ انتہائی اعلیٰ درجے کی انسانی خصوصیات ہیں۔
؎ آنا تو خفا آنا؛ جانا تو رُلا جانا   آنا ہے تو کیا آنا؛ جانا ہے تو کیا جانا

۳- وقف کامل یا ختمہ (-):

یہ علامت (۔) وہاں لگائی جاتی ہے جہاں کوئی جملہ یا قطعہ کلام (یا پیرا گراف) ختم ہوتا ہے۔ اس علامت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو خیال شروع ہوا تھا وہ ختم ہو چکا ہے۔ یہاں مثال سے پہلے یہ بات سمجھ لینی ضروری ہے کہ عربی اور انگریزی زبان میں جملے کی تکمیل کی علامت کے لیے نقطہ اور فل سٹاپ کو استعمال کیا جاتا ہے جبکہ اردو میں اس کے لیے چھوٹا سا ڈیش استعمال کیا جاتا ہے، جیسے:

"آج کل ہمارے مدارس میں زبان پر توجہ نہیں دی جاتی۔ اور اگر دی جاتی ہے تو ناقص طور پر۔ رموز اوقات وغیرہ کو تو بالکل ہی قابل توجہ نہیں سمجھا جاتا۔ اکثر فضلائے مدارس نئی سطر کے شروع میں پانچ نقطوں کے بقدر جگہ چھوڑنے کے اصول سے بھی واقف نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ اردو میں ''بالکل'' کو ''باالکل'' اور ''بالجبر'' کو ''باالجبر'' لکھتے ہیں۔

''اسکیلیئے'' ''انکیلیئے'' ''جنکا'' ''انکو'' ''اسکو'' ''اسکے'' ''انپر'' کب کا متروک ہو چکا، لیکن ہم لوگ اب تک ''اس کے لیے'' ''ان کے لیے'' ''جن کا'' ''ان کو'' ''اس کو'' ''اس کے'' ''ان پر'' لکھنے کے عادی نہیں بن سکے۔ اسی طرح ''کیجیے'' ''لیجیے'' ''لیے'' ''دیے'' وغیرہ (''جیسا بولو ویسا لکھو'' کے اصول کے تحت) یائے مجہول (یے) کے نیچے دو نقطوں کے ساتھ لکھے جائیں گے، کیونکہ یہاں یا پڑھی جاتی ہے۔ جب کہ ''گئے'' ''آگئے'' وغیرہ یائے مجہول پر ہمزے کے ساتھ لکھے جائیں گے۔ کیوں کہ یہاں ہمزہ پڑھی جاتی ہے۔

پٹنہ، ہمزہ، اسوہ، غزوہ ایسے الفاظ جن کے آخر میں ہائے مختفی ہے، مرکب جملوں میں یائے مجہول کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں، جیسے: میں پٹنے گیا تھا۔ ہمزے کی کتابت قدرے مشکل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوے ہی کو اپنانا چاہیے۔ اس غزوے میں بہت سے صحابہ شہید ہوئے

تھے۔''(حرف شیریں:٦٨)

-مخففات کے بعد بھی یہ علامت لگائی جاتی ہے، جیسے:

ڈاکٹر محمد اقبال ایم-اے، پی ایچ-ڈی

-جب چند مکمل جملے پے در پے مسلسل آئیں تو ان کے بعد، جیسے:

''دوستو!

لکھنے کا سلیقہ جب آ جائے، قلم رواں ہو جائے اور ''قط لگانے'' کی کچھ زیادہ ضرورت نہ رہ جائے، تو اس وقت یہ منزل آتی ہے کہ کسی ایک مصنف ہی کو زیادہ سے زیادہ پڑھا جائے۔ اس کا اسلوب، رویہ، سلیقہ، طریقہ، رکھ رکھاؤ، مذاق، رجحان اور سمتِ قلم و قبلۂ تحریر کو سمجھنے اور اس سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کی جائے۔ اس کی تحریر کے موسم اور ماحول میں جینے، جی لگانے اور اس سے دل لبھانے کا گر سیکھا جائے۔

لیکن اس خصوص میں کسی ''معرفت نگاہ'' اسلامی شعور کے حامل، عالمی پیمانے پر دل و نگاہ کو آباد یا خراب کرنے کی مفسدہ پردازی سے باخبر، قلم کی دنیا کے ''نیک نیت'' یا ''سودخور'' تاجروں، ''اہل کاروں''، ''ایجنٹوں''، یا کسی قیمت پر نہ بکنے والوں اور ہر کھوٹے سکّے پر مر مٹنے والوں کی جان کاری رکھنے والے، پیغام الٰہی کا درد اور دعوتِ محمدی کا عشق رکھنے والے، کسی استاذ سے مشورہ ضروری ہے۔ انہی کے مشورے سے کسی ایسے اہلِ قلم کو پڑھنے اور پینے کے لیے انتخاب کیا جائے جس کے یہاں زبان و قلب میں یکسانیت ہو، جس کے یہاں زبان سے زیادہ دین کی اہمیت ہو، جس کے دل کی تپش عبارت میں محسوس ہوتی ہو، جس کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پیار ہو، جس کو اسلام کے کشتیِ نجاتِ انسانیت ہونے پر یقین کامل ہو، جو مغربی تہذیب کی فسوں کاری سے نہ صرف آزاد ہو، بلکہ اس کی ''تازہ ستم ایجادی'' کے خلاف اس کا قلم شرربار بھی رہا ہو، جس کو اسلام کی علمی، تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی میراث سے محبت ہو، جس کو اسلام کے اولین محسنین: صحابۂ کرام اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے علما، ائمہ، فقہا، صلحا، مجددین، مصنفین اور خادمانِ علم و دین سے عقیدت ہو، یا کم از کم وہ دشمنِ اسلام اور دینی روایات و اقدار سے بیزار نہ ہو۔'' (مولانا نور عالم خلیل، حرف شیریں:٥٥)

٤- سوالیہ یا استفہام (؟):

یہ علامت کسی جملے کے آخر میں لائی جاتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی بات دریافت کی جارہی ہے، جیسے:

آپ کا کیا نام ہے؟ آپ کہاں رہتے ہیں؟ آپ کس مدرسے میں پڑھتے ہیں؟

جب سوال میں طنز یا شدت طلب کی کیفیت ہو تو یہ علامت دو یا تین مرتبہ بھی لگائی جاتی ہے۔ اس کی مثال آگے آرہی ہے۔

٥- ندائیہ یا استعجابیہ (!):

☆ یہ علامت منادیٰ (جس کو پکارا جائے) کے بعد لگتی ہے، جیسے:

-اے خدا! او بھیا! جی حضور! جنابِ من!

-پروردگارِ عالم! مسلمانوں کو کامیابی نصیب فرما۔

☆ نیز مختلف نفسیاتی کیفیات مثلاً غم، خوشی، حیرت اور تعجب وغیرہ کو ظاہر کرنے کے لیے لگائی جاتی ہے، جیسے:

-انا للہ! یہ دم بھر میں کیا ہوگیا۔

-واہ! سبحان اللہ! کتنا پیارا منظر ہے۔

-وہ اور رحم! بس صاحب بس! اس سے یہ امید فضول ہے۔

☆ خطابیہ الفاظ کے آخر میں بھی یہ علامت استعمال کی جاتی ہے، جیسے:

صدرِ گرامی! معزز حاضرین! میرے عزیز دوستو!

☆ اظہار تعجب کی صورت میں اس علامت کو ''استعجابیہ'' کہا جاتا ہے اور جب تأثر میں شدت یا تاکید کی کیفیت پیدا کرنا مقصود ہو تو یہ علامت ایک سے زیادہ لگائی جاتی ہے نیز استفہامِ تعجب میں علامت استفہام کے ساتھ مل کر لگتی ہے، جیسے:

''مقصد کا صحیح شعور ہی انسان کو انتھک کوشش پر آمادہ کرتا ہے اور انسان بہت سی لذیذ و عزیز باتوں کی قربانی دے کر منزل تک پہنچنے کی ٹھان لیتا ہے۔ مقصد ناشناسی یا مقصد کا ابہام اور اس کا

ذہنی الجھاؤ یا اس کی واقعی تعیین سے لاپرواہی، ایک انسان کو شہید جستجو بننے نہیں دیتا۔

اگر آپ یقین کے ساتھ یہ جان لیں کہ آپ کا مقصدِ اولیں تحصیلِ علمِ دین ہے، یہ ہے کہ آپ اسلام کے داعی و سپاہی اور سرکارِ دوعالم (روحی فداہ) صلّی اللہ علیہ وسلم کے پیغامِ جاوداں کے وفادار و جاں نثار خادم بنیں تو یقیناً آپ کا طلبِ علم کے حوالے سے موجود رویہ یکسر تبدیل ہو جائے گا۔ آپ وقت، فرصت اور حاصل شدہ مواقع سے انتہائی حد تک فائدہ اٹھانے کی کوشش سے باز نہ آئیں گے۔ آپ کسی سبق اور محاضرے کو سمجھے بغیر کھانے پینے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکیں گے۔ زیرِ درس مضامین و مواد کو ہر جتن کے بعد اپنے ذہن میں جمائے بغیر دنیا کی لذتیں آپ کو تلخ معلوم ہوں گی۔ اور آپ یہ ہرگز نہ کر سکیں گے کہ

صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی، تمام ہوتی ہے

عزیز طلبہ! اگر آپ کو مقصد کا صحیح احساس ہو جائے، تو آپ اپنے موجودہ رویے سے (جس سے مجھ جیسے ایک ظاہر بین اور کوتاہ نظر کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے گویا طالبِ علم کو ایک کھلونا، طالبِ علمانہ زندگی کو ایک تماشہ اور اس زندگی کے قیمتی تر لمحات کو بے معنی سمجھ رکھا ہے) یقیناً باز آجائیں گے اور اپنے باکمال استاذ، ہونہار ساتھی اور ذی استعداد طالبِ علم سے درس کے اوقات کے بعد ہی سہی اور ہر طرح کے تملق، خوشامد اور دست بستگی کے ساتھ ہی سہی، آپ روزانہ کے اسباق کو ہضم کیے بغیر، ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتے ہوئے نظر آئیں گے۔"

٦۔ تفصیلیہ (:-):

یہ علامت کسی طویل اقتباس کو نقل کرتے وقت یا کسی فہرست کو پیش کرتے وقت لگاتے ہیں، جیسے:

تحریر نگار کے لیے چند اہم ہدایات یہ ہیں:

۔ تحریر نگار کو واحد متکلم کی ضمیر استعمال کرنے سے حتی الامکان پرہیز کرنا چاہیے۔

۔ بہت زیادہ مشہور شعر یا بہت زیادہ چلی ہوئی ضرب المثل استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

-تحریر کے ابتدائیہ کو عامیہ پن سے بچانے، مرکزیہ میں جاندار معلومات سمونے اور اختتامیہ کو نتیجہ خیز بنانے پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

۞ ان جملوں کے آخر میں بھی یہ علامت لگائی جاتی ہے جن میں " مندرجہ ذیل" اور " حسب ذیل" جیسے الفاظ استعمال کیے گئے ہوں، جیسے:

-مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کیجیے:-

-اس دوائی کو حسب ذیل طریقے سے استعمال کیجیے:-

۞ جب ذیلی عنوان لگایا جائے یا مثال پیش کرنی ہو تو یہ علامت دو عمودی نقطوں (:) کی صورت میں لگائی جاتی ہے، جیسے:

حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے پاس شہید کے لیے چھ انعامات ہیں:

پہلا انعام: اسے فوراً بخش دیا جائے۔

دوسرا انعام: اسے جنت میں اس کا ٹھکانا دکھایا جائے گا۔

تیسرا انعام: اسے عذابِ قبر سے محفوظ رکھا جائے گا۔

چوتھا انعام: روزِ حشر اسے پرامن و پرسکون رکھا جائے گا۔

پانچواں انعام: اس کے سر پر وقار کا تاج رکھا جائے گا جس کا ایک ایک یاقوت دنیا اور دنیا کے تمام زر و جواہر سے بہتر ہوگا۔ (ترمذی، ابنِ ماجہ)

۷- واوین یا علامت اقتباس (“ ”)

(۱) جو جملہ یا تحریر کسی دوسرے شخص کا کہا ہوا ہو، اسے ان دو علامتوں (" ") کے درمیان لکھتے ہیں۔ سیدھے واؤ (") تحریر یا قول کے شروع میں اور الٹے واؤ (") اس قول یا تحریر کے خاتمہ پر لگاتے ہیں۔ اس عبارت کو غور سے پڑھیے:

”جملہ نگاری سے مضمون نگاری تک“ کی مشق پہلے قدم پر چھوٹے چھوٹے جملے لکھنے کی مشق کرنی چاہیے۔ چھوٹے سے بڑے، کچھ زیادہ بڑے اور بہت بڑے کی طرف بڑھنا چاہیے۔ یہ

فطری طریقہ ہے، آسان ہے، سودمند ہے اور حوصلہ افزا ہے۔ اس طرح مسافرِ ہمت راستے سے واپس چلے آنے کی کبھی نہیں سوچتا۔ جیسے: آپ کے لیے یہ کہنا آسان ہے کہ ھذہ شجرۃ پھر کہیے: ھذہ شجرۃ کبیرۃ مثمرۃ مخضرۃ، پھر کہیے: ھذہ شجرۃ کبیرۃ مثمرۃ مخضرۃ، لونھا جمیل، أوراقھا مائلۃ الی الصفرۃ، ساقھا ضخم، أغصانھا تترامی الی بعید۔ اسی طرح آگے بڑھتے جائیے اور اس درخت کے متعلق جو کچھ کہنا ہے (اور بہت کچھ کہا جاسکتا ہے) وہ کہتے چلے جائیے۔" (مولانا نور عالم خلیل، حرف شیریں: ٤٠، ٤١)

(۲) ظریفانہ اور طنزیہ الفاظ کو واوین میں لکھا جاتا ہے، جیسے:

یہ صاحب "اصلی نقل" تیار کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔

(۳) کسی لفظ کو خصوصیت سے ظاہر کرنے کے لیے بھی یہ علامت استعمال ہوتی ہے، جیسے:

عالم اسلام کی شہرہ آفاق علمی درس گاہ "دارالعلوم دیوبند" ضلع سہارنپور کے ایک پسماندہ گاؤں "دیوبند" میں واقع ہے۔

۞ اگر حوالہ در حوالہ یا اقتباس در اقتباس کی صورت درپیش ہو تو اندرونی اقتباس کے لیے اکہری واوین استعمال ہوتی ہیں نہ کہ دُگنی، اس عبارت پر بغور نظر ڈالیے:

عربی سیکھنے کے دو درجے

''عربی زبان سیکھنے کے دو پہلو ہیں۔ پہلا یہ کہ آپ کی صرف ونحو درست ہو اور آپ عبارت خوانی وعبارت فہمی میں کوئی غلطی نہ کریں۔ آپ عبارت کے تمام پیچ وخم سے واقف ہوں اور آپ مطالب ومعانی کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور غلط کو خود ہی صحیح کرسکیں، کوئی غلط فہم آپ کو غلط مطلب کے مان لینے پر مجبور نہ کرسکے، خواہ آپ عربی کو لکھ اور بول نہ سکیں، کہ اس کا تعلق مشق سے ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ آپ عربی صرف ونحو اچھی طرح جانتے ہوں، عبارت کی تمام خوبیوں اور خرابیوں سے واقف ہوں اور اس کی ہر گرہ آپ کھول سکتے ہوں، اسی کے ساتھ ساتھ آپ عربی میں اچھی طرح لکھ بھی سکتے ہوں اور بول بھی سکتے ہوں اور تصنیف وتالیف بھی کرسکتے ہوں۔

محققین کا کہنا ہے کہ 'اول الذکر سطح تک کی عربی جاننا ہر اس طالب علم کے لیے فرض ہے جو

دینی علم کے حصول کے لیے کسی اسلامی مدرسے میں داخل ہوتا ہے، کیوں کہ اس کے بغیر نہ تو وہ کسی عبارت کو سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی کسی مطلب تک از خود رسائی حاصل کر سکتا ہے اور اگر کوئی کم علم یا کم فہم بلکہ بدفہم کوئی غلط مطلب کسی عبارت کا بتا اور سمجھا دے، تو اس غلطی کو بھی وہ معلوم نہیں کر سکتا، کیوں کہ عبارت فہمی ہی وہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعے کسی عبارت کے غلط یا صحیح مطلب میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ کسی طالب علم کی ننانوے فیصد کامیابی یہی ہے کہ وہ عبارت کو اس حد تک ضرور سمجھ لے۔ اس کے بغیر دینی تعلیم کا حصول، کتاب وسنت کی صحیح جان کاری اور شرعی علوم کا اکتساب، ایک خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں۔"

۸- قوسین: ()

یہ علامت جملہ معترضہ یا کسی بات کی تشریح کے لیے استعمال کی جاتی ہے، یعنی جو لفظ یا جملہ کسی جملے کے درمیان زائد لایا جاتا ہے اس کو خطوط ہلالی (قوسین) کے اندر لکھتے ہیں، جیسے:

-میرا قلم (جو میں نے کل ہی خریدا تھا) کہیں گم ہو گیا ہے۔

-جگر مرادآبادی (مشہور شاعر) اپنے سینے میں گداز دل رکھتے تھے۔

۹- مربع قوسین: [ ]

اسے انگریزی میں "اسکوائر بریکٹ" کہتے ہیں۔ یہ علامت دو مواقع میں استعمال ہوتی ہے:

(۱) ترجمے کے دوران تشریحی اضافات یا وہم والتباس کو ختم کرنے والے اضافی الفاظ کو ظاہر کرنے کے لیے، جیسے:

"ایک روایت میں آیا ہے: "تین اعمال ایسے ہیں جن کا اجر [اللہ کے سوا] کوئی نہیں جانتا: جہاد میں اپنے ساتھیوں کی خدمت کرنا، اللہ کے راستے میں سایہ [یعنی خیمہ] دینا، [جہاد میں] اپنا گھوڑا اعاریۃً دینا۔"

(۲) اگر کوئی عبارت بلفظہ نقل کی جا رہی ہو اور ناقل درمیان میں کوئی تبصرہ یا تنقید بڑھانا چاہے تو اسے مربع قوسین میں لکھا جاتا ہے تاکہ ظاہر ہو سکے کہ اس نے علمی دیانت وامانت کا پاس رکھا ہے اور اپنی طرف سے ادخال وادراج جیسی خیانت یا قطع وبرید جیسی بددیانتی کا ارتکاب نہیں

کیا۔

فائدہ: قرآن شریف کی آیات کو نمایاں کرنے کے لیے پھولدار قوسین (﴿ ﴾) اور احادیث کے لیے جڑواں قوسین استعمال ہوتی ہیں لیکن یہ ہاتھ سے نہیں بنتیں، کمپیوٹر سے لی جاسکتی ہیں۔ دستی لکھائی میں آیات اور احادیث یا ان کے ترجمے کے لیے واوین ہی استعمال ہوتی ہیں۔

۱۰- نقطے (......):

اگر کسی بات کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا جائے تو اس کی جگہ نقطے لگا دیتے ہیں، جو کم از کم تین ہوتے ہیں۔

وضاحت: بعض اہل قلم، خطِ مستقیم اور علامت حذف کو قوسین کی جگہ بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس صورت میں یہ دونوں جڑواں ہوں گی۔ ان دو مثالوں کو دیکھیے:

خطِ مستقیم کی مثال: ''حضرت الامام مولانا نانوتویؒ کی کتابیں -جو سبھی مطبوعہ و متداول ہیں- اسلام کو عقلی دلائل کی روشنی میں اس طرح پیش کرتی ہیں کہ اس کی حقانیت آئینہ ہو جاتی ہے۔''

علامت حذف کی مثال: ''میری رائے ہے.....اگر چہ میں کیا اور میری رائے کیا؟.....کہ آپ اس سلسلے میں جلدی نہ کریں۔''

مخصوص شعری علامات:

نظم اور شعر میں وہ تمام علامات تو استعمال ہوتی ہی ہیں جو نثر میں لگائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ ذیل کی تین علامات ایسی ہیں جو اشعار ہی میں استعمال ہوتی ہیں:

علامتِ تخلّص: (ؔ)

یہ علامت تخلّص کے اوپر ڈالی جاتی ہے، مثلاً: غالبؔ، حالیؔ، داغؔ، تبسمؔ۔

علامتِ شعر: (؎)

یہ علامت عبارت میں کوئی شعر لکھنے سے پہلے بنائی جاتی ہے، جیسے: ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

علامتِ مصرع: (ع)

یہ علامت عبارت میں کوئی مصرع درج کرنے سے پہلے بناتے ہیں، جیسے: ع
"گر قبول افتدز ہے عز و شرف"

چند وضاحتیں:

(۱) یہ تمام علامتیں سطر کے متوازی لگتی ہیں۔ صرف علامت اقتباس (واوین) سطر کے اوپر لگائی جاتی ہے۔

(۲) سطر کے شروع میں سوائے ان علامتوں کے کوئی علامت نہیں لگائی جاتی: علامت اقتباس، قوسین، علامتِ حذف۔

(۳) بہت سے لکھنے والے قوسین ( ) کی جگہ دو چھوٹے خط (- -) یا جڑواں علامت حذف (.........) استعمال کرتے ہیں۔ یہ استعمال کافی معروف ہوتا جارہا ہے۔ ان میں سے پہلی علامت بھی سطر کے شروع میں لگ سکتی ہے۔

(٤) علامت تفصیلیہ جب کسی طویل اقتباس یا فہرست دینے سے پہلے لگائی جائے تو اس میں دو نقطوں کے بعد چھوٹی لکیر (:-) بھی لگتی ہے اور اگر کسی ذیلی عنوان کے بعد یا مثال دینے کے لیے لگائی جائے تو صرف دو نقطے (:) لگتے ہیں۔

(٥) علامت اقتباس کے درمیان درج کی جانے والی عبارت میں تمام علامات بدستور لگائی جاتی ہیں۔

(٦) جب جملے کا اختتام علامتِ تاثر یا استفہام پر ہو تو ختمہ لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

(۷) قوسین کے اندر درج عبارت کے اختتام پر ختمہ لگانا ضروری نہیں۔ اختتامی قوس ختمہ کے قائم مقام ہوتی ہے۔

یاد رکھنے کی بات:

علاماتِ وقف عبارت کی تفہیم میں آسانی کے لیے ہوتی ہیں، لہٰذا انہیں اتنی کثرت سے نہیں لگایا جائے گا کہ عبارت ہی بوجھل اور پیچیدہ ہو جائے۔ ذیل کی عبارت کو غور سے پڑھ کر دیکھیے کہ ان علامات کو کس اعتدال اور سلیقے سے لگایا گیا ہے۔

خط اور انسانی نفسیات

''علمائے نفسیات انسان کی خوش خطی اور اس کی بدخطی سے اس کی اندرونی کیفیات کا اندازہ کر لیتے ہیں، کیوں کہ انسان کے نفسیاتی خصائص و امتیازات اس کے ظاہری اعمال و احوال میں مجسم ہو جایا کرتے ہیں۔

(الف) ان کا کہنا ہے کہ سیدھی سطریں، کاتب کی سلامت روی اور گردوپیش سے باخبری، نیز نقصانات و خطرات کے حوالے سے اس کی پیش بندی کی علامت ہیں۔

(ب) چڑھتی ہوئی سطریں (جو نیچے سے اوپر کی طرف کو چڑھنے لگتی ہیں) جذبۂ اقدام اور ہمت و حوصلے کی غماز ہوتی ہیں۔ انہوں نے تجربے سے یہ ریکارڈ کیا ہے کہ بڑے بڑے تاجر اور کاروباری لوگ، جو اپنی ذاتی محنت و عرق ریزی سے مال و دولت کی دنیا میں، اپنا نام روشن کر گئے، ان کی تحریروں کی سطریں، سیدھی شروع ہو کر آہستہ آہستہ اوپر کو چڑھتی ہوئی ہوتی تھیں۔

(ج) اس کے برخلاف اوپر سے نیچے کو اترتی ہوئی سطریں (جو سیدھی شروع ہو کر آہستہ آہستہ نیچے کو مڑتی چلی جاتی ہیں۔) نویسندہ کی قناعت پسندی، گم نامی یا بے نامی کو بتاتی ہیں، چناں چہ خواتین کی تحریریں عموماً اسی قسم کی ہوتی ہیں۔

(د) ٹیڑھی میڑھی تحریر، جو کبھی چڑھتی اور کبھی اترتی ہوئی نظر آتی ہے، نویسندہ کے ذہنی تردد، قوتِ فیصلہ کی کمی، الجھاؤ، نفسیاتی دباؤ اور نامعلوم وحشت کی علامت ہوتی ہے۔

(و) حروف کی خوب صورتی اور نشست اگر مطبع کے حروف کی طرح ہوں، تو اس سے کاتب کے صبر شعار، ٹھنڈے مزاج اور متین طبع ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خصوصاً اگر ج، ح، خ کے دائرے کی صحیح گولائی، س، ش، کے شوشوں اور الف کی ایستادگی پر توجہ دی گئی ہو۔

(ز) الفاظ کے آخری حروف کی درازی، خصوصاً ج، ح، ع، غ، کی نویسندہ کے مبالغہ پسند،

فضول خرچ اور عیش کوش ہونے کو بتاتی ہے۔

(ح) تحریر کے حروف کا ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہونا، جیسے کاف الف سے جڑ جائے اور الف لامِ تعریف سے مل جائے، کاتب کی عجلت پسندی وجلد بازی کو بتاتا ہے۔

(ط) تحریر کے حروف کا توازن اور شکل وصورت کا اعتدال، کاتب کی معتدل المزاجی، استقامتِ طبع، حلم جوئی، نرم خوئی، خوش اخلاقی اور وسیع القلبی کو بتاتا ہے۔

(ی) چھوٹے چھوٹے حروف والی مرتب تحریر، جس کے الفاظ اور سطروں کے مابین فاصلے ہوں، لطیف المزاجی اور جذبات کی پاکیزگی کی غماز ہوتی ہے۔

(ک) جس کی تحریر کے حروف بڑے اور الفاظ کے درمیان فاصلے ہوں، وہ سخی اور فضول خرچ ہوتا ہے۔

(ل) باریک الفاظ والی تحریر جس کے الفاظ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں، عموماً اس کا لکھنے والا جز رس، بخیل، لالچی یا کم خرچ ہوتا ہے۔

(م) جس کی تحریر کے حروف کھڑے اور الف لام وغیرہ پائے کی طرح ہوں، تو وہ بحث و مباحثے اور مشقتوں کا عادی ہوتا ہے۔

(ن) بعض لوگوں کی تحریروں میں ''ف'' اور ''ب'' کے مابین امتیاز نہیں ہو پاتا، اور ''س'' یا دائروں والے حروف کے دائرے غیر واضح ہوتے ہیں، اس قسم کے لوگ جلد باز اور اپنی ذات کے سلسلے میں لاپروا ہوتے ہیں۔''

قوسین: ( )

یہ علامت جملہ معترضہ یا کسی چیز کی تشریح کے موقع پر استعمال ہوتی ہے، جیسے: ''زید (خدا بہشت نصیب کرے) نیک آدمی تھا۔'' (حرفِ شیریں:۸۸)

واوین: ('' '')

اس کو علامت اقتباس بھی کہتے ہیں۔ اس علامت سے کسی دوسرے کی بات کو ظاہر کیا جاتا ہے، جیسے: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ فرمایا: ''میری تفسیر [بیان القرآن] کی قدر وہ جان سکتا ہے جو پچاس تفاسیر کی ورق گردانی کے بعد اسے دیکھے۔''

علامہ شمس الحق افغانی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''ایک مدرس کو درس کی تیاری کے لیے تین بار مطالعہ

کرنا چاہیے: پہلی بار فہم کے لیے، دوسری بار افہام کے لیے اور تیسری بار تسہیلِ افہام کے لیے۔"

علامتِ تخلّص: (‾)

یہ علامت تخلّص کے اوپر ڈالی جاتی ہے، مثلاً: غالبؔ، حالیؔ، داغؔ، تبسمؔ۔

علامتِ شعر: (؎)

یہ علامت عبارت میں کوئی شعر لکھنے سے پہلے بنائی جاتی ہے، جیسے: ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

علامتِ مصرع: (ع)

یہ علامت عبارت میں کوئی مصرع درج کرنے سے پہلے بناتے ہیں، جیسے: ع
"گر قبول افتد زہے عزّ و شرف"

چند وضاحتیں:

(۱) یہ تمام علامتیں سطر کے متوازی لگتی ہیں۔ صرف علامت اقتباس (واوین) سطر کے اوپر لگائی جاتی ہے۔

(۲) سطر کے شروع میں سوائے ان علامتوں کے کوئی علامت نہیں لگائی جاتی: علامت اقتباس، قوسین، علامتِ حذف۔

(۳) بہت سے لکھنے والے قوسین ( ) کی جگہ دو چھوٹے خط (- -) یا جڑواں علامت حذف (......) استعمال کرتے ہیں۔ یہ استعمال کافی معروف ہوتا جا رہا ہے۔ ان میں سے پہلی علامت بھی سطر کے شروع میں لگ سکتی ہے۔

(۴) علامت تفصیلیہ جب کسی طویل اقتباس یا فہرست دینے سے پہلے لگائی جائے تو اس میں دو نقطوں کے بعد چھوٹی لکیر (:-) بھی لگتی ہے اور اگر کسی ذیلی عنوان کے بعد یا مثال دینے کے لیے لگائی جائے تو صرف دو نقطے (:) لگتے ہیں۔

(۵) علامت اقتباس کے درمیان درج کی جانے والی عبارت میں تمام علامات بدستور لگائی

جاتی ہیں۔

(٦) جب جملے کا اختتام علامتِ تاثر یا استفہام پر ہو تو ختمہ لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

(٧) قوسین کے اندر درج عبارت کے اختتام پر ختمہ لگانا ضروری نہیں۔ اختتامی قوس ختمہ کے قائم مقام ہوتی ہے۔

بند سازی

جس طرح حروف سے الفاظ اور الفاظ سے جملے بنتے ہیں، اسی طرح جملوں سے مل کر بند (پیرا) بنتا ہے۔ پھر جس طرح ایک جملے کے اجزا میں باہمی ربط کے اظہار اور دوسرے جملے سے خلط ملط ہونے سے بچانے کے لیے رموز اوقاف وضع کیے گئے ہیں، اسی طرح چند مربوط اور متحد المعنی جملوں کو دوسرے جملوں سے جدا کرنے کے لیے ''بند سازی'' (پیراگرافنگ) کا اُصول اپنایا گیا ہے۔

ایک مسلسل عبارت کو بندوں میں تقسیم کرنے سے پڑھنے والے کو مضمون کے مختلف اجزا (مثلاً تمہید، اصل موضوع، خاتمہ وغیرہ) سمجھنا آسان ہو جاتا ہے، اور وہ اس اکتاہٹ میں بھی مبتلا نہیں ہوتا جو طویل عبارت پڑھتے وقت اس کے مختلف اجزا اور اس کے اندر بیان کردہ مختلف باتوں کے ایک دوسرے سے تمیز نہ کر سکنے سے پیدا ہوتی ہے۔

بند بنانے کے بنیادی اصول یہ ہیں:

(۱) نیا بند ہمیشہ نئی سطر سے تقریباً تین حروف کے بقدر جگہ خالی چھوڑ کر شروع کیا جاتا ہے اور پھر پیرا ختم ہونے تک سطر کی دونوں جانب جگہ بالکل نہیں چھوڑی جاتی۔

(۲) ایک بند ایک مرکزی خیال پر مشتمل ہوتا ہے، چاہے وہ طویل ہو یا مختصر۔ نئی بات شروع کرنے کے لیے نیا بند شروع کیا جاتا ہے۔

(۳) صفحے کے دونوں طرف مناسب حاشیہ چھوڑنا چاہیے تاکہ اضافات کے اندراج اور جلد بندی میں سہولت ہو۔ اگر کوئی اقتباس نقل کرنا ہو تو اس کے لیے دونوں طرف مزید حاشیہ چھوڑا جائے۔ اقتباس کی پہلی سطر بھی چند حروف کی جگہ خالی چھوڑ کر شروع کی جاتی ہے۔

مشق

۱-اردو کے رموز اوقاف کی اہمیت پر چار نکات مناسب وضاحت کے ہمراہ لکھیں۔
۲-تمام رموز اوقاف کے نام مع علامت، صرف ایک سطری وضاحت کے ساتھ لکھیں۔
۳-جو علامات اردو میں متروک ہو چکیں، وہ کون کون سی ہیں؟
٤-خط اور انسانی نفسیات کے تحت درج نکات سے آپ نے کیا سبق حاصل کیا؟
۵-درج ذیل پیرا گراف اپنی نوٹ بک میں خوش خط لکھ کر درست اعراب لگائیں۔

''حضرات!

یہ بہت ضروری ہے کہ پڑھتے وقت مصنف کا انتخاب کیا جائے خصوصا کچی عمر میں جو انفعال، تاثر، تعلم اور تحصیل و جستجو کی عمر ہوتی ہے بعض دفعہ بہکے ہوئے مصنف کو پڑھ کر آدمی اپنے دین و دنیا کو برباد کر بیٹھتا ہے قلم کی جادو نگاری انسان کو صاحب قلم کا معتقد بنا دیتی ہے اگر وہ ذوق و رجحان کے اعتبار سے صراطِ مستقیم پر ہوتا ہے تو فبہا ورنہ سرمایۂ دین و ایمان و اخلاق کا لٹیرا ثابت ہوتا ہے ثانی الذکر مصنف کی تحریر میں ایک طرح کی ظلمت نحوست و ویرانیت اور وحشت محسوس ہوتی ہے اور شاہ راہِ مضمون کے علاوہ سطروں کی پگڈنڈیوں بین السطور کی گلیوں اور ما بین الالفاظ کے کوچوں میں بھی ہر جگہ دین و ایمان کے تازہ دم ڈاکوؤں اور ستم پیشہ و بے رحم قزاقوں کی ٹولیوں کے قدم ہائے ناپاک کی چاپ صاف طور پر محسوس ہوتی ہے ایک حساس قاری اور باشعور مسلمان اس کی ایک سطر پڑھنے میں بھی بوجھ محسوس کرتا ہے

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پُرکار و سخن ساز ہے نمناک نہیں ہے

جب کہ اول الذکر اہلِ قلم کی سطر سطر روشنی میں نہائی دودھ میں دھلی، قلب میں اترتی دل میں گھر کرتی اور عقل کو شکار کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ کسی فن آرٹ یا ادب وشعر میں

خونِ جگر اگر شامل نہ ہوتو اس میں آب وتاب پیدا نہیں ہوتی چہ جائے کہ اس کا سرچشمہ لادینیت اخلاقی انار کی اباحیت پسندی فکری بے راہ روی اور ذہنی عیاشی ہو آج کا ادب عموماً اسی نوع کا ہے اس لیے تلاش، احتساب اور انتخاب کی ضرورت ہے خدا کی توفیق آپ کی ہم رکاب ہو کہ شاعر کی نوا اور خطیب کے نفس کو بہار آفریں وجاں بخش ہونا چاہیے نہ کہ باعث پژمردگی وافسردگیٔ چمن (مولانا نور عالم خلیل، حرف شیریں:۵۷)

تحریر کی معنوی خوبیاں

پاکستان میں کھانے پینے کا رواج گزشتہ چند سالوں سے بہت بڑھ گیا ہے۔ خاص طور پر کراچی اور لاہور جیسے بڑے شہروں میں پہلے اگر چند مخصوص علاقے کھانوں کے لیے مشہور تھے تو اب ہر گلی محلے میں طرح طرح کے پکوان گھر بن رہے ہیں۔ صرف یہی نہیں، امریکی اور یورپی کمپنیاں بھی اپنی دکانیں سجائے بیٹھی ہیں اور پاکستانی مسلمان حلال اور حرام کی چھان بین کیے بغیر شوق کے اظہار اور خود نمائی کے لیے ان غیر ملکی ریستورانوں میں جا جا کر پیٹ کا دوزخ بھر رہے ہیں۔

لیکن آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا کہ چند خاص پکوانوں کے لیے چند خاص ہوٹل ہی کیوں مشہور ہو جاتے ہیں اور ایک ہی پکوان کا مزہ اس مخصوص دکان پر ''خاص الخاص'' کیوں ہوتا ہے؟ اس کی سب سے بڑی وجہ کھانے کی تیاری کا خاص انداز ہے۔ اس ''انداز'' میں خام مال کا معیار، مصالحوں کی شرح، گھی، پانی اور گوشت وغیرہ کا تناسب، چولہے پر رکھنے کی مدت، دم وغیرہ ہر چیز شامل ہے۔ اس طرح ایک منفرد اور ذائقے دار پکوان تیار ہوتا ہے جو دوسرے ہوٹلوں سے معیار میں کہیں بہتر ہوتا ہے۔

اور کچھ یہی حال تحریر کا بھی ہے کہ گزشتہ کچھ عرصے سے قلم نگاروں کا بھی زور ہے۔ لوگ لکھ رہے ہیں اور بہت سے لکھ تو نہیں رہے لیکن لکھنا چاہتے ہیں...... لیکن پکوان کی طرح تحریر کے بھی چند لوازمات ہوتے ہیں۔ اگر تحریر کے اجزائے ترکیبی مکمل نہ ہوں اور ان کی مقدار کا تناسب درست نہ ہو تو اس تحریر کی حیثیت چند منتشر الفاظ کے سوا کچھ نہ ہوگی۔ جس طرح محض چند مصالحے، پیاز، مرچ، نمک، گوشت، سبزی، پانی، گھی اور تیل ملا دینے اور آگ پر رکھ دینے سے سالن تیار نہیں ہو جاتا، اسی طرح کاغذ قلم تھام کر چند جملے کاغذ پر ''بکھیر'' دینے سے تحریر وجود میں نہیں آتی۔ آج مضمون نگاروں کی اکثریت اسی طرز پر چند جملے کاغذ پر بکھیر دیتی ہے اور پھر ایسے ''مضمون نگاروں'' کا

اصرار یہ ہوتا ہے کہ ان کی تحریر شائع کی جائے۔ رسالوں کے ادارتی عملے کو بھی آئے دن اسی قسم کے تلخ تجربات سے گزرنا پڑتا ہے۔ ایک معروف ماہنامے کے نائب مدیر نے اپنا دلچسپ واقعہ سنایا کہ ایک صاحب نے ایک سیاسی موضوع پر ایک مضمون ان کے ماہنامے میں اشاعت کے لیے بھیجا۔ پھر انہوں نے دفتر سے رابطہ کیا اور اصرار کیا کہ انہوں نے اس مضمون پر بہت محنت کی ہے اور تین سو روپے کی ایک کتاب محض اس مضمون کی تیاری کے لیے خریدی ہے، لہٰذا اس مضمون کو ضرور بالضرور شائع کیا جائے۔ محترم نائب مدیر نے اس گزارش پر اس مضمون کو خاص اہمیت دی اور کوشش کی کہ یہ مضمون اشاعت کے قابل ہو جائے...... لیکن نہایت کوشش کے باوجود وہ مضمون قابل اشاعت نہ ہو سکا، الا یہ کہ اس مضمون کو نئے سرے سے لکھا جاتا یا وہ اصل کتاب ہی چھاپ دی جاتی جس سے یہ مضمون لکھا گیا تھا۔

جب آپ ایک اچھے لکھاری بننے جا رہے ہیں تو اس کے لیے یہی کافی نہیں کہ آپ کی تحریر شائع ہو رہی ہے... یہ بھی ضروری ہے کہ آپ کی تحریر پڑھی بھی جائے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض اخبارات کسی مخصوص کالم کی وجہ سے خریدے جاتے ہیں۔ قارئین کا بڑا حلقہ اخبار یا رسالہ خرید کر پورا اخبار یا رسالہ نہیں پڑھتا بلکہ اپنی پسند کے کالم نگار کا کالم پڑھتا ہے۔

اپنی تحریر کو ''پڑھنے کے قابل'' بنانے کے لیے آپ کو اپنی تحریر میں دلچسپی اور اثر پذیری کی خوبیاں پیدا کرنے کا فن آنا چاہیے ورنہ آپ کی تحریر شاید خوب صورت ہو، شائع بھی ہو جائے...... لیکن پڑھی نہیں جائے گی۔ آپ قلم کار تو بن جائیں گے، لیکن کامیاب قلم کار بننے سے رہ جائیں گے۔

لہٰذا یہ جاننا اور سمجھنا نہایت ضروری ہے کہ محض اپنے خیالات کو الفاظ میں منتقل کر دینے کا نام تحریر نہیں ہے۔ آپ کی تحریر اور تصنیف آپ کو اس وقت کامیاب اہلِ قلم کی صف میں کھڑا کرے گی جب آپ کی تحریر میں درج ذیل چھ خوبیاں موجود ہوں:

۱-تحریری لوازم ۲-موضوع سے مناسبت۔ ۳-وضاحت۔
٤-مقصدیت ۵-اختصار و جامعیت۔ ٦-مکمل بات

آیئے! آپ کو ان خوبیوں کے متعلق تفصیل سے بتاتے ہیں:

پہلی خوبی-تحریری لوازم:

کسی بھی تحریر سے لکھاری کی علمی وسعت، فنی چابکدستی، مہارت تحریر اور تخیل کی قوت وغیرہ کا اندازہ لگانا ہو تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس نے کس قدر تحریری لوازم اپنائے ہیں؟ تحریری لوازم سے مراد کسی بھی زبان کے بنیادی اجزا جنہیں لکھاری اپنے انداز میں استعمال کرتا ہے۔ مثلاً: نحو وصرف کے اصول، تشبیہات واستعارات، محاورات وضرب الامثال، کسی صنف تحریر کی ہیئت اور اس کے مخصوص عناصر واجزا وغیرہ۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی لکھاری غزل کہنا چاہتا ہے اور وہ درست ہیئت اور تکنیک استعمال کرتا ہے یعنی بحر، مطلع، مقطع، ردیف، قافیہ اور وزن وغیرہ درست ہیں تو وہ غزل تسلیم ہوگی۔ اس سے بے توجہی نہیں کی جا سکتی کیونکہ غزل کے لیے جو لوازم ہوتے ہیں وہ پورے ہیں۔ اب یہ بعد کی بات ہے کہ لکھاری نے اس غزل میں کس طرح کے خیالات کو پیش کیا ہے۔

دوسری خوبی-موضوع سے مناسبت:

آپ کون ہیں؟ تحریر لکھنے سے آپ کا مقصد کیا ہے؟ آپ کی بات میں کتنی سچائی ہے...؟ یہ وہ باتیں ہیں جن سے آپ کی تحریر پڑھنے والا یعنی آپ کا قاری واقف نہیں۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ آپ کی بات مستند ہو اور براہِ راست موضوع سے متعلق ہو۔ مثال کے طور پر آپ کسی واقعے کے بارے میں معلومات لکھ رہے ہیں تو آپ کو اسی واقعے سے متعلق جملے لکھنے چاہییں۔ جیسے یہ واقعہ کب ظہور میں آیا؟ اس کی تاریخِ وقوع کیا ہے؟ کہاں پیش آیا؟ کیوں پیش آیا؟ گویا آپ اگر ایک واقعے کے بارے میں معلومات (حقائق) اپنے قاری تک پہنچانا چاہ رہے ہیں تو وہ حقائق آپ کے قاری تک پہنچنے چاہییں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ تذکرہ تو ایک واقعے کا لے کر بیٹھے ہیں مگر آپ کی تحریر میں ہر شے کا تذکرہ ہے اور اس واقعے کا ذکر تحریر میں آ کر نہیں دیتا۔

یہ معاملہ محض رسالے یا اخبار کے لیے لکھے گئے مضمون کے لیے ہی نہیں، عام خط وکتابت بلکہ سرکاری خط وکتابت کے لیے بھی بہت اہم ہے۔ مثال کے طور پر آپ کسی ادارے کو شکایتی خط لکھ رہے ہیں تو اس میں براہِ راست اس واقعے کی طرف اشارہ کیجیے تاکہ آپ کی درخواست پڑھنے والا افسر فوری طور پر سمجھ سکے کہ معاملہ کیا ہے؟ کیا اس سے پہلے آپ نے اس سلسلے میں کوئی

درخواست پیش کی ہے؟ اس کا حوالہ نمبر کیا ہے؟ کیا کوئی پیش رفت ہوئی... وغیرہ۔ اس طرح متعلقہ افسر کو آپ کے مسئلے کی تہہ تک پہنچنے میں آسانی ہوگی اور آپ کا کام بھی نسبتاً جلد ہوگا۔

غور کیجیے کہ آپ کا مضمون یا درخواست پڑھنے والے کو آپ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر آپ کی تحریر میں اضافی یا غیر ضروری باتیں ہیں اور آپ مطلب کی بات پر نہیں آ رہے یا موضوع سے مناسبت کا خیال رکھے بغیر یہاں وہاں سے نظر پڑی چیزیں درج کر رہے ہیں تو اس کے لیے آپ کی تحریر میں کوئی کشش نہیں ہے، لہٰذا اپنی بات کو دوسرے تک پہنچانے کے لیے براہِ راست موضوع پر آئیے اور اس سے متعلق ضروری حقائق و معلومات کو اپنی تحریر میں مرکزی حیثیت دیجیے۔

تیسری خوبی-وضاحت:

قاری اس وقت تک کوئی تحریر نہیں پڑھتا جب تک اس تحریر میں اس کیلیے دلچسپی پیدا نہ ہو اور تحریر میں دلچسپی تب پیدا ہوتی ہے جب تحریر اس کی سمجھ میں آ جائے اور اس کے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کا اسے جواب مل جائے۔ چنانچہ آپ کی تحریر کا واضح ہونا ضروری ہے۔ ایک واضح اور صاف تحریر کو سمجھنا چونکہ قاری کے لیے آسان ہوتا ہے، اس لیے وہ ایسی ہی تحریر پڑھتا ہے۔ غیر واضح تحریر پڑھنے پر آپ قاری کو مجبور نہیں کر سکتے۔

اپنی تحریر کو صاف اور واضح رکھنے کے لیے درج ذیل تین باتوں پر عمل کیجیے:

۱- الفاظ آسان رکھیے۔ یعنی ایسے الفاظ استعمال کیجیے جو زیادہ پیچیدہ نہ ہوں۔ سادہ اور مانوس ہوں۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ لوگ اپنی تحریر کو پُر مغز اور دل کش بنانے کے لیے غیر مانوس اور پیچیدہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جس تحریر کے الفاظ قاری کی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں، وہ تحریر قاری کے لیے بے مزہ اور غیر دلچسپ ہو جاتی ہے۔

۲- جملے مختصر رکھیے۔ چھوٹے جملے تحریر کا حسن ہیں۔ ایک طویل جملے کے مقابلے میں کئی چھوٹے چھوٹے جملوں میں بات کو سمجھنا آسان ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ طویل جملے میں قاری کے لیے اپنی توجہ مرکوز کرنا مشکل ہوتا ہے، اس لیے اپنی بات کو مختلف جملوں میں تقسیم کر کے قاری تک پہنچائیے۔ اگر آپ کا ایک جملہ تین سے چار سطروں کا ہے تو اسے دو یا تین چھوٹے جملوں میں تقسیم کر لیجیے۔

۳- پیراگراف چھوٹے رکھیے۔ پیراگراف سے بات لمبی ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کی روانی بھی متاثر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تحریر کا حسن بھی متاثر ہوتا ہے۔ ایک اوسط پیرا پانچ سے دس سطروں کا ہونا چاہیے۔

یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ تحریر کا مقصد اپنی بات قاری تک پہنچانا ہوتا ہے۔ یہ خوبی کسی تحریر میں جتنی زیادہ ہوگی، قاری کے لیے وہ تحریر اتنی ہی فائدہ بخش ہوگی۔ اسی طرح یہ طریقہ اتنا دل کش ہونا چاہیے کہ قاری کی توجہ تحریر پر مبذول ہو جائے۔ یہ دل کشی اور خوش نمائی نامانوس لفظوں اور ثقیل جملوں سے پیدا نہیں ہوتی۔ عام روزمرہ کے الفاظ اور سادہ جملے تحریر کو پرکشش اور جادو بیاں بنا سکتے ہیں۔ بعض نو آموز اپنی تحریر میں دل کشی اور دلچسپی پیدا کرنے کے لیے اس میں بے تکی اور غیر ضروری لفاظی کی بھرمار کر دیتے ہیں۔ ایک رواج اپنی تحریر کو مولانا ابوالکلام آزاد کے اندازِ تحریر کی نقل کرتے ہوئے ادیبانہ اور پرمغز بنانے کا بھی ہے لیکن یہ چیز مولانا آزاد جیسے عبقری الصفت (Super Genius) قلم کار پر سجتی تھی، آج کے دور میں مولانا آزاد خود ہوں تو بات اور ہے، ورنہ عام قلم کار یہ انداز اپنائے گا تو آج کے قاری کو اپنے سحر میں نہیں لے سکتا، کیونکہ آج کے قاری کا ذخیرۂ الفاظ نہایت محدود ہے۔ مولانا آزاد کی تحریر کردہ ذیل کی عبارت پڑھیے اور سوچیے کہ آج کل کتنے لوگ اس عبارت کو آسانی سے سمجھ لیں گے:

''سبحان اللہ چارہ فرمائے غیبی کی کارسازیاں اور رہ نمائے آوارگانِ غفلت کی دست گیریاں! جاذبۂ توفیق کب سے اپنی طرف کھینچ رہا تھا، مگر غفلت کی درماندگی دامن گیر تھی۔ جمالِ حقیقت کب سے بے نقاب تھا، مگر پردۂ کج نظری حائل تھا۔ کرشمۂ عنایت کب سے پکار رہا تھا، لیکن نفس کے ہنگاموں میں دل غافل تھا۔ عشق حقیقی نے آخری ضرب لگائی تو یکا یک آنکھیں کھل گئیں۔ دیکھا تو ایک دوسرے ہی عالم کی ہوش ربائیاں سامنے تھیں۔ نہ وہ آسمان تھا، نہ زمین تھی۔ نہ وہ آفاق، نہ وہ انفس۔ جس ہاتھ کی رہ نمائی نے یہاں تک پہنچایا تھا، خود اس کو بھی ڈھونڈا تو پتا نہ تھا۔ گویا وہ اک چراغ تھا کہ جب تک رات کی تاریکی میں چلتے رہے، دلیل راہ رہا۔ جب صبح ہو گئی تو ضرورت نہ تھی، بجھا دیا گیا۔

نعرہ زد عشق، دامن ما بگریخت

کفر نیزاز کمینِ ما بگریخت''

چوتھی خوبی-مقصدیت:

تحریر لکھنے کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔لکھاری کس لیے تحریر لکھنا چاہتا ہے؟ لکھنے کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔مثلاً: لکھاری کے من میں جذبات، خیالات اور احساسات کا ہجوم در آیا جس کے باعث وہ گھٹن محسوس کرنے لگا ہے، تب وہ چاہتا ہے کہ ان جذبات، خیالات اور احساسات کی ترسیل کر کے اپنے من کا بوجھ ہلکا کر لے۔لکھاری میں تحقیق کرنے کی صلاحیت ہے، اس کے سامنے نئے خیالات اور نکات ابھرتے ہیں، نئی طرح کی معلومات کا انکشاف ہوتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ ان خیالات اور نکات کو تحریر کے ذریعے دوسروں تک پہنچائے۔لکھاری معاشرے کا ذمہ دار فرد ہونے کے ناطے اپنی تحریروں کے ذریعے اصلاحی خواہش اور تمنا رکھتا ہے، وہ مسائل کے حل کے بارے میں تجاویز اور مشورے دینا چاہتا ہے۔ بہرحال تحریر لکھنے کی بنیاد میں کوئی نہ کوئی وجہ، محرک یا مقصد کارفرما ہوتا ہے۔لکھاری کو چاہیے کہ اس محرک اور مقصد کا واضح تعین کرے تاکہ اس کی تحریر اس کے سچے جذبات کی عکاس ہو۔

پانچویں خوبی-اختصار اور جامعیت:

تحریر کا بنیادی مقصد مختصر الفاظ میں اپنی بات دوسروں تک پہنچانا ہوتا ہے۔اگر تحریر طویل ہے، لیکن اس سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا تو وہ بے مقصد اور بے کار تحریر ہے۔آج سے دوسو سال پہلے ایک مصنف نے اس حوالے سے یہ بات کہی تھی: ''اچھا مصنف وہ ہے جو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات اپنے قاری تک پہنچاتا ہے۔''فی زمانہ یہ بات اور بھی اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ کیونکہ لکھنے والے زیادہ ہیں اور ہر ایک کا لکھا طباعت کی سہولتوں کی وجہ سے فوراً ہی قارئین کے سامنے آجاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اب ناول کے بجائے افسانے اور مختصر کہانی (Short Story) کی طرف رجحان بڑھ گیا ہے۔لوگ ضخیم کتابیں پڑھنے کے بجائے آسان، مختصر اور جامع کتب پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔کوشش کیجیے کہ آپ کم سے کم لفظوں میں پوری بات کہ سکیں۔اگر پانچ الفاظ میں بات پوری ہوسکتی ہے تو سات الفاظ مت استعمال کیجیے۔

چھٹی خوبی۔مکمل بات:

تحریر میں کسی بات اور نکتے کو نامکمل اور ادھورا چھوڑ دینا تحریر کی بڑی خامیوں میں سے ایک ہے۔ یہ اس بات کی علامت بھی ہے کہ لکھنے والے کی تحریر ”مقصدیت“ سے عاری ہے۔آپ کی تحریر میں موضوع کے بارے میں بنیادی یا لازمی باتوں کا تذکرہ ضروری ہے تاکہ قاری کے ذہن میں تحریر پڑھ کر الجھن پیدا نہ ہو۔مثال کے طور پر آپ کی چمڑے کی جیکٹیں بنانے کی فیکٹری ہے اور یہاں آپ کئی ڈیزائن کی جیکٹیں بناتے ہیں۔اگر ایک شخص آپ کو یورپ سے ایک ہزار جیکٹوں کا آرڈر بھیجتا ہے، لیکن جیکٹ کا ڈیزائن نمبر نہیں بھیجتا تو کیا آپ اس کے آرڈر کی تعمیل کر سکیں گے؟ یا مثال کے طور پر آپ کا بھائی آپ کے گھر پیغام بھجواتا ہے کہ وہ آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو اصلاحی بیان میں شرکت کے لیے لے جا رہا ہے، اس کے لیے تیار رہنا...لیکن وقت اور تاریخ کا تعین نہیں کرتا تو کیا آپ اپنے گھر والوں کو اس پیغام کے ملنے کے بعد بیان سننے کی غرض سے لے جانے کے لیے تیار کر لیں گے؟ یا فرض کیجیے آپ کے پاس کراچی شہر کا نقشہ ہے اور اتنا تفصیلی ہے کہ اس میں ہر گلی اور ہر گھر کی وضاحت کی گئی ہے، لیکن آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کراچی کے کس محلے اور کس گلی میں کتنے نمبر مکان میں رہتے ہیں تو کیا آپ اس نقشے میں اپنے مکان کی نشاندہی کر سکیں گے؟

مانا کہ آج کا قاری ذہین اور ہوشیار ہے، لیکن اسے سب کچھ معلوم نہیں، لہٰذا آپ کو اپنی تحریر میں موضوع کے لحاظ سے لازمی پہلوؤں کی وضاحت کرنی چاہیے۔تحریر کو نامکمل نہیں چھوڑنا چاہیے کہ جس سے قاری کو تشنگی محسوس ہو۔تحریر کا اختصار بلاشبہ تحریر کی خوبی ہے، لیکن وہ اختصار جو تحریر میں تشنگی چھوڑ دے، تحریر کے لیے مہلک ہے، کیونکہ اپنی بات کی تکمیل کسی بھی قلم کار کا اصل مقصد ہوتا ہے۔

ساتویں خوبی۔نتیجہ خیزی:

آخری چیز نتیجہ خیزی ہے۔ یہ کسی تحریر کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ یہ درحقیقت مقصدیت سے مربوط اور پیوست ہے۔آپ کے سامنے مقصد تحریر واضح ہوگا تو آپ کی تحریر میں نتیجہ خیزی [illegible] ہوگی۔ آپ کی تحریر سے کوئی نتیجہ نکلنا چاہیے۔اس نتیجے (Conclusion) سے قاری کا

اتفاق کرنا یا نہ کرنا الگ معاملہ ہے، لیکن آپ کی تحریر سے کوئی نتیجہ نکلنا ضروری ہے۔ اگر آپ محض صفحات سیاہ کر رہے ہیں اور اپنا نام چھپا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کی تحریر میں کبھی جان پیدا نہیں ہوسکتی اور آپ کامیاب قلم کار نہیں بن سکتے۔

خلاصہ:

آپ جو کچھ بھی تحریر کرنے جا رہے ہیں، ایک لمحے رک کر یہ دیکھ لیجیے کہ آپ جس صنفِ تحریر پر طبع آزمائی کر رہے ہیں اس کے لوازم سے واقف ہیں؟ آپ کی تحریر موضوع کے گرد گھومتی ہے؟ اس تحریر کو لکھنے کا مقصد کیا ہے؟ کیا آپ کے پاس کوئی واضح اور مکمل پیغام ہے جو آپ دوسروں تک پہنچانا چاہتے ہیں؟ کیا آپ ان الفاظ سے کم اور بہتر الفاظ میں وہ بات کہہ سکتے ہیں جو آپ کہنا چاہتے ہیں؟ کیا آپ دوسروں کے علم میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں یا محض صفحے سیاہ کرنا چاہتے ہیں؟

ایک اچھے قلم کار کی یقیناً یہ خواہش نہیں ہوسکتی کہ وہ صفحے کالے کرتا پھرے، لہٰذا اگر آپ کی تحریر میں مذکورہ خوبیاں نہیں ہیں تو آپ کی تحریر کوئی تاثیر اور نتیجہ ظاہر نہیں کرے گی اگرچہ اس کے لیے آپ نے اچھی خاصی محنت اور وقت صرف کیا ہو۔ دراصل آج کے آدمی کے پاس وقت نہیں ہے (یا وقت کی کمی ہے) اور ایسے میں اپنی تحریر کو قاری کے حافظے تک پہنچانا اور اس کو سمجھانا بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ کی تحریر پڑھنے والا آپ کے لکھے پر یقین بھی کرے۔ آپ کی بات اتنی واضح، مختصر، جامع اور مکمل ہو کہ اسے سمجھنے کے لیے ذہن پر زیادہ زور نہ دینا پڑے۔ گویا ایک اچھی تحریر وہ ہے جو قاری کے لیے آسان ہو، مشکل نہ ہو۔ واضح ہو، مبہم نہ ہو۔ مکمل ہو، ناقص نہ ہو۔ بامقصد اور نتیجہ خیز ہو، بے مقصد اور بے نتیجہ نہ ہو۔ اتنا اختصار بھی نہ ہو کہ الفاظ کسی کنجوس کی زنبیل سے برآمد کیے گئے معلوم ہوں اور نہ اتنی طوالت ہو کہ بگڑے موسم کی ژالہ باری دکھائی دے۔

مشق

١-تحریر کی معنوی خوبیوں کی اہمیت بتلائیں۔

٢-تحریر کی معنوی خوبیاں مختصر وضاحت کے ہمراہ درج کریں۔

٣-اس زمانے میں ''اختصار نویسی'' کی اہمیت پر نوٹ لکھیں۔

٤-''وضاحت'' والی خوبی کے تحت درج تین نکات ''آسان الفاظ، مختصر جملے، مربوط پیرے'' کی مختصر وضاحت کریں۔

٥-تحریر کی ظاہری اور معنوی دونوں طرح کی خوبیوں کو سامنے رکھ کر یہ لکھیے کہ ان کے ذریعے آپ کی اصلاح کس کس پہلو سے ہوئی؟

دوسرا باب

لکھنا سیکھیے

(آغاز، ارتقاء، انتہاء)

- ......لکھنا سیکھیے!
- ......کارآمد مطالعے کے اصول
- ......تحریر سیکھنے کے دس طریقے
- ......فنِ تحریر سیکھنے کا آسان اور مؤثر ترین طریقہ
- ......متضاد و متقابل
- ......مترادف و متقارب
- ......تشبیہات
- ......استعارات
- ......تلمیحات
- ......ذُو معنی الفاظ
- ......محاورات
- ......ضرب الامثال

لکھنا سیکھیے!

لکھنے کی ابتدا کیسے؟

تحریر کا عمل بڑا مفید اور دلچسپ ہے۔ آدھی سے زیادہ دنیا اس کا شوق رکھتی اور اسے سیکھنا چاہتی ہے۔ آپ کو بھی یقیناً لکھنے کا شوق ہوگا اور اس شوق کی تکمیل کے لیے آپ بھی دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح یہ سمجھتے ہوں گے کہ لکھنے کے عمل کی ابتدا لکھنے سے ہوتی ہے۔ بس قلم انگلیوں میں پکڑا، کاغذ ہاتھ میں لیا اور لکھنا شروع ہو گئے...... نہیں! میرے عزیز نہیں......! لکھنے کی ابتدا لکھنے سے نہیں، مطالعے سے ہوتی ہے۔ لکھنے سے پہلے آپ ادبی مطالعے کی عادت ڈالیں۔ اچھی تحریر کا فن اور خوبصورت تقریر کا ہنر مطالعے سے ہی آتا ہے۔ مطالعہ کے بغیر لکھنے میں نکھار آتا ہے نہ بولنے میں سنوار۔ مستند اہلِ قلم کی نگارشات کے مطالعے کے دوران آپ کو ان کی تحریر کے مختلف اجزا، عناصر، اسلوب اور محاسن سے شناسائی ہوگی۔ آپ کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوگا۔ تحریر کا سلیقہ اور ذوقِ سلیم پیدا ہوگا۔ لاشعور میں ملکۂ تحریر راسخ ہوتا جائے گا اور کچھ عرصے بعد جب آپ مطالعہ اور حاصل مطالعہ کا اندراج سیکھ جائیں گے (جس کا طریقہ آگے آرہا ہے) تو ان شاء اللہ وہ دن بھی جلد آجائے گا جب آپ اللہ کے فضل سے قلم کی طاقت کو دعوت وارشاد جیسے اعلیٰ مقصد کے لیے استعمال کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

یہ غلط فہمی عام ہے کہ مضمون یا کالم لکھنے کا آغاز مضمون یا کالم لکھنے سے کیا جائے۔ دنیا کے تمام دوسرے علوم وفنون سیکھنے کے لیے نیچے سے اوپر جایا جاتا ہے، بس یہ ایک ایسا فن رہ گیا ہے کہ اس میں براہ راست ایک ہی چھلانگ میں چوٹی تک پہنچ جانے کا شوق بے تاب کرتا اور کامیابی سے محروم رکھتا ہے۔ آپ خود سوچیے کہ ایک نوآموز اور ناتجربہ کار لکھاری براہِ راست اچھا مضمون

کیسے لکھ سکتا ہے؟ مضمون تو چند پیراگرافوں سے، پیراگراف جملوں سے اور جملے حروف والفاظ سے بنتے ہیں۔اب اگر کوئی شخص اینٹیں اکٹھی نہ کرے، نہ ان کو جوڑنے کے لیے مسالہ مہیا کرے تو وہ کس طرح سے دیوار کھڑی یا مکان تعمیر کر سکتا ہے؟ بالکل اسی طرح جس طالبعلم کے پاس الفاظ کا ذخیرہ نہ ہو یا اس نے الفاظ جوڑ کر جملے بنانے کی مشق نہ کی ہو، وہ پیراگراف کس طرح پورا کرے گا اور اگر پیراگراف میں بے ربطی یا جھول ہوگا تو وہ اچھا مضمون لکھنے میں کیونکر کامیاب ہوگا؟

اس لیے میرے عزیز! قلم کی نوک کو کاغذ کے سینے پر چلانے سے پہلے آپ ''ادبی طریقِ مطالعہ'' کی عادت ڈالیے۔اس مطالعے کے نتیجے میں جو موتی اور جواہرات ہاتھ آئیں انہیں اپنی ''حاصلِ مطالعہ کی بیاض'' یا ''سکیننگ چارٹ'' میں محفوظ رکھیے۔ان کی تراش خراش اور انہیں نگینوں کی شکل میں جڑنے کا سلیقہ سیکھیے۔یعنی مطالعے کے دوران منتخب کیے گئے الفاظ سے پہلے جملے بنائیے اور پھر چھوٹے چھوٹے پیراگراف لکھیے۔کچھ عرصہ کی مشق کے بعد آپ یقیناً ایک اچھے قلم کار بن جائیں گے۔

''ادبی طریقِ مطالعہ'' کیا ہے؟ آیئے ایک نظر اس پر ڈالتے ہیں......لیکن پہلے یہ اطمینان کر لیجیے کہ یہ مطالعہ شروع کرنے سے پہلے آپ کے پاس آگے دیا گیا ''مطالعاتی جدول'' (اسکیننگ چارٹ) یا ایک صاف ستھری ''بیاض'' (نوٹ بک، کاپی یا رجسٹر) تیار موجود ہونی چاہیے۔ بیاض تیار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر چھوٹی کاپی یا نوٹ بک ہے تو آپ نے اس میں بارہ مختلف صفحات پر وہ بارہ عنوانات لکھ رکھے ہوں جو آگے دیے جا رہے ہیں۔اگر بڑے صفحات والا رجسٹر ہے تو ایک صفحے پر تین یا چار کالم بنا کر ہر کالم کے اوپر آگے دیے گئے عنوانات لکھے جا چکے ہوں تا کہ مطالعہ شروع کرنے کے بعد ہر لفظ کو اس کے متعلقہ مقام پر آسانی سے درج کیا جا سکے۔

ادبی طریقِ مطالعہ

ادبی مطالعہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ جس تحریر کا مطالعہ کریں اس میں موجود موتیوں کو چن کر حاصل مطالعہ کے طور پر اپنے پاس محفوظ کرتے جائیں۔ اس غرض کے لیے آگے دیے گئے ''اسکیننگ چارٹ'' سے مدد لیں؛ یا ذاتی بیاض بنائیں اور اس میں بارہ صفحات پر درج ذیل بارہ عنوانات درج کریں۔اگر ایک ہی صفحے پر لکیریں کھینچ کر تین تین چار چار کالم بنا لیے جائیں تو یہ

بھی درست ہے۔ وہ بارہ عنوانات یہ ہیں:

۱- نئے اور اچھوتے الفاظ
۲- شگفتہ تراکیب اضافی
۳- حسین تراکیب وصفی
٤- انوکھی تراکیب عطفی
۵- متضاد و متقابل
٦- مترادف و متقارب
۷- محاورات وضرب الامثال
۸- تشبیہات واستعارات
۹- تلمیحات وذو معنی الفاظ
۱۰- خیال انگیز اور مؤثر جملے اور فقرے
۱۱- پسندیدہ مصرعے اور اشعار
۱۲- تحقیق طلب الفاظ (پھر لغت یا لغت دانوں سے ان کی تحقیق)

ان عنوانات میں جو اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں، ان سب کی تشریح اور مثالیں دوسرے باب میں دی جا چکی ہیں۔ وہاں دوبارہ دیکھ لیں اور انہیں اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے بعد مطالعے کا عمل شروع کریں۔

مطالعے کے بارے میں تین سوال:

مطالعے کے بارے میں لوگ عموماً تین طرح کے سوال کرتے ہیں:

۱- مطالعہ کتنا کیا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ذوقِ مطالعہ اصل بات ہے۔ اگر یہ پیدا ہو جائے تو نہ دماغ تھکتا ہے اور نہ دل بھرتا ہے۔ اگر ذوق نہ ہو تو کتاب سامنے بھی دھری ہو تو یا ابا سی آنے لگتی ہے یا تھکن طاری ہو جاتی ہے یا سر بوجھل محسوس ہونے لگتا ہے۔

۲- کس طرح کا مطالعہ کرنا چاہیے؟ اس کا جواب ہے وسعتِ مطالعہ اصل چیز ہے۔ اپنے بڑوں کے مشورے سے منتخب کر کے مختلف قسم کی کتابیں پڑھنی چاہیے چاہییں۔ اخباری مضامین سے لے کر ٹھوس تحقیقی مواد تک سبھی کچھ سے واقف ہونا چاہیے۔ ایک مدت بعد یہ ذوق پیدا ہوتا ہے کہ کتاب دیکھ کر یا سونگھ کر اس کا پورا متن سمجھ میں آجائے۔

۳- کتنی دیر اور کب تک مطالعہ جاری رکھنا چاہیے؟ جواب ہے: عمر بھر! وہ شخص کبھی عالم نہیں ہو سکتا جو زندگی کے کسی مرحلے میں مطالعہ سے خود کو بے نیاز سمجھ لے۔ ایک سچا عالم بسترِ مرگ پر بھی

کتاب سے مستغنی نہیں ہوتا۔ درجن ڈیڑھ درجن کتابیں پڑھنے اور سال چھ مہینے مطالعہ کر لینے سے کوئی اچھا ادیب اور اچھا خطیب نہیں بن سکتا۔

مطالعے کے قابل تین چیزیں:

ذوقِ ادب کی آبیاری، فکر و نظر کی تربیت اور ادبی استعداد کی نمو کے لیے درج ذیل تین چیزوں کا مطالعہ مستقل مزاجی اور عمیق الفکری سے کرتے رہیں:

۱- انسانوں کا مطالعہ:

آپ کے آس پاس معاشرے میں مختلف قسم کے کردار پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر انسان ایک مکمل داستان ہے۔ اس داستان کے پرت کھولیے، ورق الٹیے، انسانی کرداروں کے مطالعے کا لطف اٹھائیے اور اپنی تحریروں کے لیے مواد مہیا کیجیے۔

اسی طرح عالم، خطیب، ادیب، شاعر، مصنف، مترجم یہ سب آپ کے مطالعے کے لیے کھلی کتاب ہیں۔ ایک عام انسان کی بہ نسبت ان کی شخصیت کا مطالعہ زیادہ بصیرت افروز ہوتا ہے۔ آپ ان سے ملاقات کریں۔ ان کی گفتگو سنیں اور تجربات سے فائدہ اٹھائیں۔ اگر آپ ان سے بہ نفسِ نفیس ملاقات نہیں کر پاتے تب بھی پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ آپ ان کی شاہکار کاوشوں سے لطف اندوز ہوں۔ ان کی تحریریں پڑھیں، سمجھیں اور ان پر غور کریں۔ ان کے خیالات سے استفادہ کریں۔ یہ بھی ان سے ملاقات کا بہترین ذریعہ اور ان کی شخصیت کے مطالعے کا متبادل ہے۔

۲- فطرت کا مطالعہ:

فطرت کیا ہے؟ یہ کیسے وجود میں آئی؟ اس کا رابطہ انسانی زندگی سے کتنا ہے؟ انسان اور اس کے رویے، جذبات، امیدیں، خواہشیں، قدرتی مناظر، چاند تاروں کی روشنی، سورج کی تب وتاب، درخت، پھل، پھول، خوشبو...... یہ سب فطرت کے دل نشین مظہر ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ دن کی صبح کا ظہور اور شام کی آمد نئے انداز سے ہوتی ہے؟ کھلے کھیتوں میں ہوا محسوس کرنا، کسی اجنبی سے مل کر عام سی باتیں کرنا، معصوم بچوں کے ساتھ وقت گزارنا، انہیں محسوس کرنا کیسا لگتا ہے؟ یہ اور

ایسے کئی فطرت سے ملاقات کے تجربے نہ صرف آپ کی فطری صلاحیتوں میں ہیجان برپا کردیں گے بلکہ آپ کی تسکین کا باعث بھی بنیں گے۔

۳- علمی وادبی کتابوں کا مطالعہ:

اللہ پاک نے فرمایا ہے: "پڑھ! اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔" قلم کے ذریعے سکھایا گیا علم کتابوں کے ذریعے آگے پھیلتا ہے۔ آپ اس علمی سلسلے سے جڑنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو مطالعے کی عادت بنائیے۔ کوئی بھی لکھی ہوئی چیز ہاتھ لگے....... اچھی کتاب سے لے کر کاغذ کی پڑیا تک ....تو ایک نظر تو ڈال ہی لیجیے۔ مزید پڑھنے کے قابل محسوس ہو تو مطالعے کا کارآمد طریقہ اپناتے ہوئے اس کے ساتھ بھرپور وقت گذاریے۔

یہاں پہنچ کر ہم آپ کو پہلے اہلِ علم کے ہاں مطالعے کے متعارف طریقہ کو ایک صاحبِ علم کی زبانی سنواتے ہیں۔ پھر کارآمد مطالعے کے اصول بتاتے ہیں۔

ایک صاحبِ علم کا طریقِ مطالعہ

"میرے مطالعہ کا طریقہ یہ تھا کہ ایک پنسل ہاتھ میں اور ایک نوٹ بک جیب میں ہوتی۔ میرے کتاب خانہ میں مشکل سے کوئی کتاب ہوگی جس پر تاریخ ابتدا اور انتہائے مطالعہ درج نہ ہو۔ جو فقرے ادبی، تاریخی یا کسی اور حیثیت سے پسندیدہ ہوتے ان پر یا تو کتاب ہی میں نشان لگادیا جاتا اور بار بار اس پر نظر ڈالی جاتی یا پھر نوٹ بک میں درج کرلیا جاتا اور اس کو یاد کرنے کی کوشش کی جاتی۔

والدِ مرحوم کی خدمت میں شمالی ہند کے اکثر اصحابِ علم تشریف لایا کرتے تھے۔ ان کی گفتگو سن کر اپنی زبان کے نقائص کا احساس بڑھتا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب سے زیادہ توجہ زبان کی درستی پر مرکوز رہی۔ کوئی اچھی ترکیب، کوئی نئی تشبیہ، کوئی انوکھا استعارہ، نظر سے گزرتا تو سب سے بڑی فکر یہ دامن گیر ہوجاتی تھی کہ اس کو جلد سے جلد صحیح طریقے پر اپنی گفتگو میں استعمال کرلیا جائے۔ ابتداءً یہ تمنا صرف جذبۂ خودنمائی کا نتیجہ تھی، لیکن بعد میں ثابت ہوا کہ حافظہ کسی بات کو اس وقت تک صحیح طور پر محفوظ نہیں رکھ سکتا جب تک ایک مرتبہ زبان یا قلم اس کو استعمال نہ کرلے۔ آج اپنی زندگی

میں اپنی اس ابتدائی عادت کے نتائج کو پوری طرح کارفرما دیکھتا ہوں۔اس عادت نے رفتہ رفتہ اتنی شدت اختیار کرلی تھی کہ میں اچھے ادیبوں کے کئی کئی فقرے، بے تکلف اور بلاکم وبیش استعمال کرتا تھا اور یہی میری زبان کی درستی کا سب سے بڑا آلہ ثابت ہوا۔

جب ہم اپنے گھر میں جوان اور بڑے سمجھے جانے لگے تو ہماری بیٹھک کے کمرے الگ کردیے گئے اور احباب کی محفلیں جمنے لگیں۔لغویات سے فطرتاً نفرت تھی۔علم وادب زندگی کا سب سے دلچسپ مشغلہ بن گئے تھے۔ابتداءً محض تفریح کے طور پر میں نے اپنے احباب کے ساتھ مل کر مطالعہ کرنا شروع کیا،یعنی یہ ہوتا کہ الہلال، ہمایوں، ہزارداستان،معارف، زمانہ، یا کوئی اور معیاری ادبی وعلمی رسالہ یا کوئی اچھی کتاب کسی ایک صاحب کے ہاتھ میں ہوتی۔اکثر میں ہی قاری کی خدمت انجام دیا کرتا تھا۔ایک ایک فقرے پر ہم اکٹھے خیال آرائیاں کرتے۔اختلاف واتفاق ہوتا۔بحث وتکرار ہوتی اور یہ بحث دماغ کے صفحہ پر خیالات کے کبھی نہ مٹنے والے نقوش ثبت ہونے کا باعث بنتی۔تجربے نے بتلایا کہ خاموشی اور انفرادی مطالعہ سے یہ مشترکہ مطالعہ کا طریقہ زیادہ مفید اور زیادہ کارآمد ہے۔

جب سیر وتراجم،تذکرہ وتاریخ سے آگے بڑھ کر ذوقِ مطالعہ نے ٹھوس اور سنجیدہ، فلسفیانہ و سیاسی، اخلاقی و مذہبی علوم کی طرف توجہ کی تو ایک اور طریقے نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا۔فلسفہ اور علمِ کلام یا مذہب وسیاست کا کوئی مقام اگر سمجھ میں نہ آتا تو میں اس کو اپنی اس چھوٹی نوٹ بک میں جو میری جیب کا مستقل سرمایہ بن گئی تھی،نوٹ کرلیتا تھا اور جن بزرگوں کی نظر ان علوم پر میرے نزدیک عمیق ہوتی تھی،ان سے ملاقات کے جلد سے جلد مواقع تلاش کرتا اور ان سے ان اشکالات کو حل کرنے کی کوشش کرتا۔آج اپنے ان لمحات کو اپنی حیاتِ گزشتہ کا سب سے قیمتی سرمایہ سمجھتا ہوں۔

لوگ صرف کتاب پڑھنے کو مطالعہ سمجھتے ہیں۔میرے نزدیک کسی مطالعہ کا یہی سب سے اچھا طریقہ ہے جو بیان ہوا۔جب والدِ مرحوم کے انتقال کی وجہ سے اٹھارہ برس کی ابتدائی عمر ہی میں میرے سر پر گھر کی ساری ذمہ داری کا بوجھ پڑ گیا اور مدرسہ کی تعلیم ناقص حالت میں ختم ہوگئی تو میرے مطالعہ کا سب سے بہترین طریقہ یہ تھا کہ جن لوگوں نے مختلف اصنافِ علم میں زیادہ سے زیادہ مطالعہ کیا ہو ان کو اپنے اطراف جمع کردوں یا ان کی خدمت میں حاضر ہوجاؤں اور ان کے عمر بھر

کے مطالعہ کا نچوڑ ان سے سنوں اور پھر کانوں کے ذریعے اس کا مطالعہ کروں۔ اس تمنا نے آوارہ گردی وصحرانوردی پر آمادہ کیا۔ مصر، شام، عراق، ترکی، ایران وافغانستان کی مشکل سے کوئی اہم ہستی ایسی ہوگی جس سے شرفِ تقرب کی کوشش نہ کی ہو اور آج اپنے قلب و دماغ کو ان کے مطالعہ کے نتائج کا مرہونِ منّت پاتا ہوں۔ لوگ اوراق اور کاغذ کے مجموعے کو الٹنے اور اس میں لکھی ہوئی سیاہ لکیروں کو پڑھنے کا نام مطالعہ سمجھتے ہیں، میرے پیشِ نظر ہمیشہ سے ایک اور کتاب رہی ہے جس کے صرف دو ورق ہیں، لیکن جس میں سب کچھ ہے اور یہ کتاب ''صحیفۂ کائنات'' ہے۔ آسماں اور زمین کے ان دو اوراق کے درمیان مہر وماہ، کواکب وسیارات، شفق، قوسِ قزح، ابر وباد، کوہ وصحرا، سمندر اور ریگستان نے ایسے ایسے خطوط کھینچے ہیں جن میں فکر کرنے والی نگاہ اپنے لیے بہت کچھ حاصل کرسکتی ہے۔ مجھے اس کتاب کی طرف آزر کے بیٹے نے متوجہ کیا جس نے ڈوبتے سورج کو دیکھ کر فاطر السموات والارض کا پتہ چلا لیا تھا۔ میرے اس خیال کی تصدیق حرا کے بیٹھنے والے صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کی ہے اور یہی دو ورق مجھے اس مطالعہ کی طرف متوجہ کرنے کا باعث ہوئے اور یہ پہچاننے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ کس طرح دنیا میں اگنے والے درختوں کا ہر ورق معارف کردگار کا ایک دفتر ہے۔''

کارآمد مطالعے کا اصول

اہم، زیادہ اہم، اہم ترین:

اب آپ اس طریقِ مطالعہ کا اصولی خلاصہ سمجھ لیجیے۔ جب آپ کسی کتاب کا مطالعہ شروع کریں تو کتاب کھولنے سے پہلے کچی پینسل ہاتھ میں لے لیں یا کان میں اڑس لیں۔ دورانِ مطالعہ آپ تین طرح کی چیزوں پر چونکیں گے یا انہیں نمایاں ومحفوظ کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے: اہم، زیادہ اہم، اہم ترین۔

جو لفظ، جملہ یا نکتہ اہم لگے اس کو خط کشیدہ (انڈر لائن) کر لیں۔

جو زیادہ اہم محسوس ہو اس کے متوازی حاشیے پر آپ کوئی علامتی نشان لگا دیں۔ یہ نشان آپ خود سے بھی وضع کر سکتے ہیں۔ مثلاً: ضرب یا جمع کا نشان، ضرب کی علامت جس کے چار خالی زاویوں میں ایک ایک نقطہ لگا ہو، ستارہ یا کچھ اور۔

جو اہم ترین معلوم ہو اس پر خط کھینچنے کے ساتھ اس کا مختصر سا اشاراتی عنوان کتاب کے شروع یا آخر میں یادداشتی صفحے پر درج کریں۔ یہ وہ خالی صفحات ہیں جو کتاب کی جلد کے ساتھ ہوتے ہیں۔ آج کل بعض کتابوں کے آخر میں یادداشت کے عنوان سے مستقل صفحات بھی دیے جاتے ہیں۔ انہیں اسی مقصد کے لیے کام میں لانا چاہیے۔

مطالعہ کن کتابوں کا کیا جائے؟

مستند و معتبر اردو اہل قلم کی ممتاز تصانیف اور دواوین (یہ دیوان کی جمع ہے) کا ادبی ولسانی نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کو معمول بنائیں اور انوکھی تراکیب و جملے اپنی بیاض میں نقل کرتے رہیں۔ اردو کی جو نصابی کتب ثانوی واعلیٰ درجات (میٹرک، بی اے) کے طلبہ کے لیے لکھی گئی ہیں، ان میں نثر و نظم کی

مختلف اصناف پر اردو کے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی معیاری نگارشات جمع کی گئی ہیں۔ان کی شروحات میں بھی اچھا خاصا ادبی مواد ہوتا ہے۔ان کا مطالعہ بہت سی کتب سے مستغنی کردے گا۔ان کے علاوہ ذیل میں چند مفید ادبی تصانیف اور شعری دَواوِین کی فہرست دی جاتی ہے۔انہیں مطالعہ میں رکھیے اور اپنے اساتذہ کے مشورے سے اس جیسی ''معیاری دینی وعصری ادب'' پر مشتمل کتابیں ڈھونڈ کر انہی سے اپنے دل ودماغ کو ادبی وفکری غذا مہیا کیجیے۔بعض نو آموز ادب سیکھنے کے شوق میں بے ادیبوں کے لکھے ہوئے ناول افسانے پڑھنا شروع کردیتے ہیں۔ان سے آدمی ادب تو نہیں سیکھ پاتا، رہے سہے ادب وتقوی سے بھی محروم ہوجاتا ہے۔لہٰذا کتابوں کے انتخاب میں احتیاط کیجیے۔

تصانیف:

مولانا شبلی نعمانی: الفاروق، سیرۃ النعمان	مولانا سید سلیمان ندوی: خطباتِ مدراس، یادِ رفتگاں
مولانا شبیر احمد عثمانی: تفسیری حواشی	مولانا مناظر احسن گیلانی: النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم، ہزار سال پہلے
مولانا محمد منظور نعمانی: دین وشریعت، اسلام کیا ہے؟	مولانا ابوالکلام آزاد: غبارِ خاطر
مولانا عبدالماجد دریا آبادی: آپ بیتی، تصوفِ اسلام	مولانا ابوالحسن علی ندوی: پرانے چراغ، المرتضیٰ، پاجا سراغِ زندگی
مولانا محمد ادریس کاندھلوی: سیرۃ المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم	شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا: آپ بیتی
مولانا محمد یوسف لدھیانوی: اختلافِ امت اور صراطِ مستقیم	مولانا محمد تقی عثمانی: جہانِ دیدہ، دنیا مرے آگے
حضرت مولانا حافظ پیر ذوالفقار احمد نقشبندی: خطباتِ فقیر	مولانا طارق جمیل: خطباتِ جمیل
جناب شورش کاشمیری: فنِ خطابت، پسِ دیوارِ زنداں	قدرت اللہ شہاب: شہاب نامہ، یا خدا، ماں جی

الطاف حسن قریشی: اردو ڈائجسٹ	اشفاق احمد اور اشتیاق احمد: متفرق کتابیں
مختلف ٹیکسٹ بک بورڈ: اردو لازمی و اختیاری برائے ثانوی و اعلیٰ درجات (میٹرک، بی اے) بمع شروحات	

شعری مجموعے:

کلیاتِ اقبال (اقبال) مُسدّس حالی (مولانا الطاف حسین حالی) سرودِ زندگی (اصغر) آتشِ گل (جگر) شاہنامۂ اسلام (حفیظ جالندھری) گفتۂ مجذوب (حضرت خواجہ مجذوب) صہبائے سخن (حضرت عارفی) کیفیات (زکی کیفی) صبح ہونے والی ہے (تائب اقبال) نالۂ پُر اثر، راہِ سلوک (شاہین اقبال)

تحریر سیکھنے کے دس طریقے

مطالعہ کا طریقہ تو آپ نے معلوم کرلیا، اب آیئے! اس مطالعہ کو کارآمد بناتے ہوئے تحریر کی مشق کا طریقہ سیکھتے ہیں۔

شروع شروع میں از خود خالص طبع زاد تحریر لکھنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں چند ایسے طریقے تجویز کیے جاتے ہیں جن کی مدد سے نو آموز لکھاری بھی رفتہ رفتہ استعداد اور تجربہ حاصل کر سکتے ہیں:

۱-مطالعاتی جدول یا اسکیٹنگ چارٹ:

فن تحریر سیکھنے کا پہلا اور سب سے آسان طریقہ ''حاصلِ مطالعہ کا جدول'' تیار کر کے اس میں محفوظ الفاظ وتراکیب کے ذریعے جملے اور پیراگراف لکھنے کی مشق کا ہے۔ شروع شروع میں چونکہ مبتدی کے پاس الفاظ کا ذخیرہ کم ہوتا ہے، نیز اسے ان کے برتنے کا طریقہ بھی معلوم نہیں ہوتا، اس لیے نامور ادیبوں کی تحریر لے کر اس سے الفاظ کی ان دس اقسام کو الگ کرنے کی مشق کروائی جاتی ہے جو کسی بھی معیاری تحریر کا بنیادی عنصر ہوتے ہیں۔ پھر ان الفاظ سے یک سطری، دوسطری، سہ سطری جملے بنوائے جاتے ہیں۔ جب جملے بنانے کی مشق پکی ہو جائے تو کسی نئی تحریر سے نیا جدول تیار کر کے اس میں درج ہونے والے الفاظ سے پیراگراف لکھوائے جاتے ہیں۔ اس طرح نو آموز طالبعلم رفتہ رفتہ جملے بنانا اور پیراگراف لکھنا سیکھ جاتا ہے۔ تب اس کے لیے اگلا مرحلہ یعنی مضمون یا کالم لکھنا نامانوس یا مشکل چیز نہیں رہتی۔

یہ طریقہ انتہائی آسان اور مؤثر ہے۔ فنِ تحریر (وتقریر) سیکھنے کے تمام طریقوں میں عقل وفطرت کے سب سے زیادہ قریب اور فنی اعتبار سے مؤثر ومفید ہے۔

۲-کہانی لکھنا:

دوسرا طریقہ خاکے کی مدد سے کہانی لکھنے کا ہے۔ ننھی منی، چھوٹی چھوٹی، مختصر اور دلچسپ کہانیاں لکھنے سے آہستہ آہستہ لمبی اور طویل تحریر لکھنے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے۔ آپ شروع شروع میں مختصر اخلاقی کہانیاں لکھنے کی مشق کیجیے۔ اس کا طریقہ اگلے صفحات میں دیا گیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو رفتہ رفتہ آپ ازخود روانی سے لمبے لمبے مضمون لکھنے پر قادر ہوجائیں گے۔

۳-تطبیقی خاکہ لکھنا:

یہ طریقہ کہانی لکھنے کی مشق سے ملتا جلتا، لیکن اس سے زیادہ مفید اور کامیاب ہے۔ اس میں طالب علم کو چند عناصر اور اشارات دے کر ان کی مدد سے مضمون مکمل کرنے کی مشق کروائی جاتی ہے۔ اس طریقے کی تفصیل اور مشق ''مضمون نگاری'' والے عنوان میں دی گئی ہے۔ وہاں اس طریقے کے درجہ بہ درجہ تین مرحلے بھی وضاحت سے بیان کیے گئے ہیں۔

٤-چربہ اتارنا:

کسی اچھے ادیب کا مضمون یا کالم لے کر اس کا چربہ اتارنے کی کوشش کیجیے۔ یعنی اس کا مطالعہ کیجیے۔ اس میں استعمال ہونے والے عمدہ الفاظ وتراکیب، محاورات وضرب الامثال وغیرہ کو نوٹ کیجیے۔ پھر اس کے مرکزی خیال سے ملتا جلتا خیال لیجیے اور اس کے ابتدائیہ سے ملتا جلتا ابتدائیہ لکھ کر اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تحریر کو آگے بڑھائیے۔ بنیادی سوچ، خاکہ وڈھانچہ اس تحریر کا ہو۔ الفاظ وتراکیب بھی اس جیسی ہوں یا اس کے وزن پر پوری اترتی ہوں اور اسلوب و انداز میں بھی اس کی عکاسی کرتے ہوئے اس کی بات میں اپنی بات ڈالتے ہوئے اختتامیے تک جا پہنچے۔ چند مرتبہ ''نقل بمطابق اصل'' کی اس مشق سے آپ ان شاء اللہ ازخود اچھے قلم کاروں جیسی تحریر لکھنے کی ہمت اور سلیقہ اپنے اندر پروان چڑھتا محسوس کرنے لگیں گے، لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنا اشد ضروری ہے کہ یہ عمل مشق کی حد تک رہے، علمی سرقہ نہ بن جائے۔ کہیں آپ دوسروں کی تحریروں کو اپنا رنگ دے کر اپنے نام سے شائع کرنا نہ شروع کردیں۔ یہ قبیح خیانت اور علمی بددیانتی

ہے۔ ''مضمون نویسی'' والے مضمون کے آخر میں مضمون نگاری کی مشق کے ضمن میں نمونے کا مضمون دے کر اس کے وزن پر ''جڑواں تطبیقی مضمون'' لکھنے کی مشق کروائی گئی ہے۔ اس سے استفادہ کیجیے۔

۵- تلخیص و تسہیل:

کسی بڑے ادیب کی تحریر کو غور سے پڑھ کر اس کا ایسا خلاصہ نکالنا جس میں معنی و مفہوم تو اصل تحریر کا ہو، البتہ الفاظ اور اندازِ بیان نو آموز لکھاری کا اپنا ہو، تحریر کی مشق کا کارآمد ذریعہ ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی بھی معیاری تحریر کو لے کر اسے تین مرتبہ پڑھا جائے۔ پہلی مرتبہ سمجھنے کے لیے، دوسری مرتبہ سمجھانے کے قابل ہونے کے لیے اور تیسری مرتبہ آسان اور مختصر و دلچسپ انداز میں تلخیص و تسہیل کے لائق ہونے کے لیے۔ تین مرتبہ مطالعہ کر لینے اور اہم چیزوں پر نشان لگانے کے دوران اگر کوئی مشکل یا تحقیق طلب لفظ آ جائے تو اس کا معنی دیکھ کر متبادل آسان لفظ منتخب کیا جائے۔ پھر تحریر کا ایک ایک پیرا لے کر اس کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھا جائے۔ اس بات کا دھیان رکھا جائے کہ تحریر کے اصل معنی و مفہوم اور غرض و غایت میں کسی قسم کی تحریف نہ ہونے پائے۔ بس اتنا ہو کہ کلام ان کا ہو اور بیان آپ کا۔ تلخیص مکمل کرنے کے بعد اصل اور خلاصے کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔ اصل تحریر کی خوبیوں اور اپنی تحریر کی خامیوں کو جانچا جائے۔ بڑے ادیبوں کی تحریریں سامنے رکھ کر ایسی مشق کرنے سے تحریر کی صلاحیت جلد نکھرتی اور سنورتی ہے۔ ''تبصرہ و تلخیص نگاری'' والے مضمون میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

٦- ترجمانی کرنا:

ایک طریقہ یہ ہے کہ کسی دوسری زبان میں لکھی گئی تحریر کی اپنے الفاظ میں ترجمانی کی جائے۔ انگریزی زبان میں اب ترجمہ نگاری کے لیے ٹرانسلیشن کا نہیں، بلکہ ''Trans creating'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ عربی یا انگریزی کے اچھے رسائل و جرائد لے لیجیے۔ ان میں معیاری اور مشہور مقالات و مضامین کا مطالعہ کیجیے۔ پھر جو تحریر آپ کو زیادہ بھائے اور آپ اسے اپنے شعور و احساس کے قریب محسوس کریں، اس کو سامنے رکھ کر اس کی ترجمانی اپنے الفاظ میں کیجیے، یعنی اس

کی روشنی میں اسی موضوع پر اپنے الفاظ میں اردو میں مضمون لکھیے۔ ضروری ہے کہ آپ کی تحریر لفظی ترجمہ نہ ہو، آزاد ترجمانی ہو۔ گویا آپ کسی کی بات اپنے الفاظ میں کہنے کی ایسی مشق کر رہے ہیں جس میں اصل کی چھاپ اتنی واضح نہیں کہ اس کا لفظ لفظ کسی دوسری تحریر سے بندھا ہوا یا اس کے بندھن میں جکڑا ہوا محسوس ہو، بلکہ اس میں آپ کی سوچ، آپ کی محنت اور انفرادیت جھلک رہی ہو۔ کسی لکھے ہوئے مضمون کو اس طرح گھٹا بڑھا کر لکھنے اور بقول بعض ایسی ''ہیرا پھیری'' کرنے سے بھی لکھنا آجاتا ہے۔ دس بیس مضامین کے ساتھ ہیرا پھیری، جراحی وصناعی اور بناؤ سنگھار کا یہ عمل جو کاٹ پیٹ، حذف وترمیم، ترتیب وتنسیق، نا تمام گوشوں کی تکمیل، طوالت کا خاتمہ اور حوالہ جات وغیرہ کے اندراج پر مشتمل ہوتا ہے، آپ کے قلم کو ایسا حوصلہ دے گا کہ آپ ان شاء اللہ آگے بڑھتے چلے جائیں گے۔ یہاں بھی اس بات کا اہتمام لازم ہے کہ کسی اور کی محنت کو اپنے نام منسوب نہ کیا جائے۔ مشق کو مشق کی حد تک رکھا جائے۔

۷- مکالمہ، مباحثہ اور مناظرہ:

فنِ تحریر سیکھنے کا ایک طریقہ دو چیزوں کے بیان فرضی مکالمہ یا مباحثہ کروانا ہے۔ مثلاً ایک آدمی شہر میں رہنے کو ترجیح دیتا ہے، دوسرا دیہاتی زندگی کا دلدادہ ہے۔ یا ایک سرکاری ملازمت کو پسند کرتا ہے اور دوسرا ملازمت کی جکڑ بندیوں سے آزاد کام یا تجارت کے فوائد گنواتا ہے۔ یا ایک چھٹی کا دن گھر پر ستاتے ہوئے گزارنے کا عادی ہے اور دوسرا فارغ وقت میں باہر جا کر شکار یا تفریح کا شوقین ہے۔ ایک خواتین کی جدید تعلیم کی افادیت کا قائل ہے جبکہ دوسرا اسے تباہ کن اور مضر سمجھتا ہے۔ ایک کو گرمی کا موسم اچھا لگتا ہے اور دوسرے کو کڑاکے کے جاڑے میں زندگی کا لطف آتا ہے۔ اس طرح کے دو متضاد نظریات کے حامل افراد یا اشیا کے درمیان مناظرہ یا مفاخرہ لکھنے سے مافی الضمیر کے اظہار اور تقریر وتحریر کی بہترین مشق ہو جاتی ہے۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ باری باری دونوں فریقوں کی طرف سے اس کا مؤقف بمع دلائل بیان کریں۔ جب کسی ایک فریق کی طرف سے گفتگو کر رہے ہوں تو اپنے اوپر اس مؤقف اور نظریے کو یوں طاری کر لیں جیسے وہ آپ کا اپنا مؤقف ہے اور پھر ''زبان ان کی، کلام آپ کا'' کے

اصول کے مطابق اس کے فوائد اور دوسرے کے نقصانات گنوائیں۔ اس کی طرف سے دلیل دیں اور اقدامی حملہ کریں اور دوسرے کے دلائل کا جواب دیں اور اعتراضات کا دفاع کریں۔ اس مجادلانہ گفتگو اور مناظرانہ مکالمے کو حقیقت کا رنگ دینے کے ساتھ انصاف پسندی کے ساتھ آگے بڑھانا ضروری ہے۔ نہ مبالغہ کریں اور نہ عامیانہ پن کا اظہار۔ اعتدال اور انصاف پسندی سے دلائل اور جواب، اعتراض اور دفاع کا مربوط و معقول سلسلہ جوڑے رکھیں، یہاں تک کہ گفتگو آخر تک پہنچ جائے۔

۸- روزنامچہ نویسی (ڈائری لکھنا):

انسان کی زندگی ایک داستان ہے تو اس کی زندگی کا ہر دن اس داستان کا ایک ورق۔ اگر کوئی انسان اس ورق میں روزمرّہ پیش آنے والی کہانی کا خاکہ بنانا اور اس میں رنگ بھرنا سیکھ جائے تو وہ اچھا لکھاری بن سکتا ہے۔ آپ ایک اچھی سی بیاض (ڈائری) لیجیے اور ہر روز وقت مقرر کر کے اس میں روز کی کارگزاری روز لکھنے کی عادت ڈالیے۔ خواہ ایک صفحہ ہی سہی کوشش کیجیے کہ تحریر کا رنگ ادب کی چاشنی لیے ہوئے ہو۔ اس سے آپ کی تحریر بھی نکھرے گی اور آپ کو اپنا احتساب خود کرنے اور اپنی زندگی سے لایعنی چیزیں نکال کر اسے کام کی باتوں میں صرف کرنے کا احساس پیدا ہوگا۔ ادب کی دنیا کے بہت سے بڑے نام ایسے ہیں جن کی خودنوشت یادداشتوں نے زبردست مقبولیت حاصل کی اور ادبی شاہکار قرار دیے گئے۔ آپ ان کو (یعنی مشاہیر کی یادداشتوں، خودنوشت آپ بیتیوں اور سوانحی خاکوں کو) سامنے رکھ کر اپنی مشق کا آغاز کر سکتے ہیں۔

۹- منظر نگاری:

منظر نگاری یا سراپا نگاری تحریر سیکھنے کا فطری اور منطقی طریقہ ہے۔ یعنی جو چیز جس طرح ہے، اسی طرح بیان کرنے اور قلم سے اس کا نقشہ کھینچنے پر توجہ دی جائے۔ آپ کو ٹھٹھہ یا لاہور کی شاہی جامع مسجد کیسی لگی؟ آپ نے مینار پاکستان یا شالامار باغ کو کیسا پایا؟ پرانا لاہور اور نیا لاہور کیسا ہے؟ صدر بازار میں کوئی حادثہ ہوا، تب آپ نے وہاں کیا کچھ دیکھا، سنا اور مشاہدہ کیا؟ کوئی شہر یا دیہات کس خوبی یا خرابی کا حامل ہے؟ کسی سرسبز علاقے میں پہنچنے پر آپ اپنے دل میں کیا

احساسات پاتے تھے؟

کوئی خیال، کوئی نظریہ، کوئی تاثر جو آپ کے دل میں ابھرے، اپنے الفاظ میں اس کو ضرور لکھ لیجیے۔ اپنی بات کو اپنی زبان میں کہنا بہت آسان ہوتا ہے، اس لیے اس آسان نسخے کو ہاتھ سے جانے نہ دیجیے۔ روز نامچہ نویسی کے دوران آپ منظر نگاری سے بھی مدد لے سکتے ہیں۔ آپ کا روزانہ مشاہدہ اور مذکورہ طرز پر روزانہ کی تحریر، آپ کو جلد ایک کامیاب لکھنے والا بنا سکتی ہے۔ پھر آپ کا ذوقِ طلب اور شوقِ سفر آپ کو ایک صاحبِ طرز ادیب اور اعلیٰ درجے کا مؤلف و محقق بنا سکتا ہے۔

۱۰-خبر، مراسلہ و مکتوب نگاری:

خبر نگاری فنِ تحریر سیکھنے کا ایک آسان طریقہ ہے۔ کسی قومی و ملّی مسئلہ پر اخبارات میں مراسلہ بھیجنا یا اپنے احباب کو سنجیدہ گپ شپ کے انداز میں خط لکھنا (گویا آپ ان کے سامنے بیٹھے بے تکلف گفتگو کر رہے ہیں) بھی تحریر کی تربیت کا بہترین ذریعہ ہے۔ مختصر، بامعنی اور جاندار انداز میں تحریر کیے گئے مراسلے اور مکاتیب تحریر کی صلاحیت پروان چڑھانے کا مؤثر طریقہ شمار ہوتے ہیں۔ نوآموز طلبہ اسی سے اپنی مشق کا آغاز کر سکتے ہیں۔

مثلاً: آپ اپنے یہاں رونما ہونے والے واقعات کی خبریں مرتب کر کے اخبارات میں بھیجیے۔ اپنے شہر میں ہونے والی محفلوں، تقریبات اور واقعات کی کسی اخبار یا جریدے میں نامہ نگاری شروع کر دیجیے۔ آپ کے مدرسہ میں سالانہ جلسہ ہوا، اس کی خبر اخبار میں روانہ کیجیے۔ کسی اہم مہمان کی آمد و استقبال کی روداد بھیجیے۔ کسی ملّی مسئلہ پر اخبار کو مراسلہ لکھیے۔ اپنے دوست کو خط کے ذریعے ادبی انداز میں کسی تقریب کا احوال یا کسی اجتماعی مسئلے کے حل کے لیے ترغیب دیجیے، تجاویز مانگیے اور پیش کیجیے۔ وغیرہ وغیرہ۔

آگے کے صفحات میں ہم پہلے تین طریقوں کو تفصیل سے لکھتے ہیں۔ آپ ''تبصرہ و تلخیص نگاری''، ''ترجمہ نگاری''، ''مکالمہ نویسی'' اور ''خبر نگاری'' کے اصول پڑھ کر بقیہ طریقوں کی مشق خود سے کر سکتے ہیں۔

مشق

۱-ادبی طریق مطالعہ پر روشنی ڈالیے
۲-ایک صاحب علم کے طریق مطالعہ کے بنیادی نکات مختصرا لکھیں۔
۳-کارآمد مطالعے کا اصول اپنے الفاظ میں لکھیں۔
٤-ابتدائی طور پر قلم چلانے کے لیے سیکھنے کے چند طریقے مختصر وضاحت کے ساتھ لکھیں۔
۵-آپ نے ذاتی لائبریری تیار کر رکھی ہے؟مختصر تعارف کروائیں۔

فنِ تحریر سیکھنے کا آسان اور مؤثر ترین طریقہ

مطالعاتی جدول یا اسکیننگ چارٹ

تحریر کی مشق کا پہلا اور آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ آپ کسی بھی مشہور ادیب کی تحریر یا کالم لے لیجیے اور ''ادبی طریقِ مطالعہ'' کو کام میں لاتے ہوئے اس میں سے تحریر کے بارہ بنیادی عناصر الگ الگ کر کے ''مطالعاتی جدول'' (اسکیننگ چارٹ) میں درج کیجیے۔ جب یہ چارٹ بھر جائے تو اس میں جو ادبی مواد محفوظ ہو چکا ہے، اس کی مدد سے پہلے پہل جملے اور پھر پیراگراف بنایئے۔ ان دو مرحلوں سے بخیریت گزرنے کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ تیسرا مرحلہ مضمون نگاری یا کالم نویسی کا ہوگا۔ تینوں مرحلوں کی ترتیب کچھ یوں ہوگی:

۱- جملہ سازی:

ہر کالم میں درج مندرجات کو ایک ایک کر کے اپنے جملوں میں استعمال کریں۔ شروع شروع میں یک سطری جملہ کافی ہے۔ بعد ازاں رفتہ رفتہ بڑھا کر دو سطری اور سہ سطری جملوں تک لے جائیں۔ یہ جملے خیال انگیز اور بامعنی ہونے چاہییں۔

۲- پیرانویسی:

دس نئی تحریروں سے دس نئے چارٹ تیار کریں اور اُن میں منتخب کیے گئے الفاظ کی مدد سے ایسے بامعنی پیراگراف لکھیں جن میں یہ الفاظ ملے جلے استعمال ہوئے ہوں۔ ابتدا میں یہ پیراگراف تین سے پانچ سطروں پر مشتمل ہوں۔ بعد میں آپ انہیں سات سطروں تک بھی لے جاسکتے ہیں۔ ان پیراگرافوں کی سطریں باہم مربوط اور کسی مکمل پیغام پر مشتمل ہونی چاہییں۔

اس طرح کی مشق آپ چھوٹی ننھی منی کہانیاں یا سبق آموز واقعات لکھ کر بھی کر سکتے

ہیں۔ یہ کہانی یا واقعہ دو سے تین پیراگراف سے زیادہ نہ ہو۔

جب آپ بیس مختلف تحریروں سے بیس چارٹ تیار کر کے جملے اور پیراگراف بنانے کی خوب مشق کرلیں گے تو آپ کی تحریری استعداد میں روانی اور نکھار پیدا ہونا شروع ہو جائے گا اور آپ تدریجی طور پر مضمون لکھنے کے لیے ذہناً وعملاً تیار ہو جائیں گے۔ مشق جاری رکھیے۔ ان شاء اللہ کامیابی جلد ہی آپ کے قدم چومے گی۔

۳- مضمون یا کالم نگاری:

تیسرا مرحلہ مضمون نگاری نویسی کا ہے۔ ''تحریر کے مراحل'' نامی مضمون میں دی گئی ہدایات کے مطابق مضمون کا موضوع اور مرکزی خیال سوچیے اور پھر مرحلہ وار آگے بڑھتے جائیے۔ اگر آپ جملوں اور پیراگراف کی بیس مشقیں اچھی طرح کر چکے ہیں تو آپ کے پاس الفاظ کا اتنا ذخیرہ یقیناً جمع ہو چکا ہوگا کہ الفاظ خود بخود نوکِ قلم سے برآمد ہو کر کاغذ پر گل بوٹے بناتے جائیں گے اور ''نقطے سے کالم تک کا سفر'' ان شاء اللہ بخیر وخوبی طے پا جائے گا۔

اسکیننگ چارٹ پُر کرنے کا طریقہ:

''اسکیننگ چارٹ'' یا ''حاصل مطالعہ کا جدول'' اگلے صفحے پر دیا جا رہا ہے۔ اس کو بھرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ کسی مشہور ادیب یا کالم نگار کی تحریر لیجیے اور درج ذیل امور کا لحاظ رکھتے ہوئے پہلے زیر لب اور پھر بلند آواز سے اس کی خواندگی کیجیے:

۱- تلفظ کی صحت

۲- لب ولہجہ کی عمدگی

۳- آواز کا اتار چڑھاؤ۔ (اس کا مطلب ہے ہلکے پھلکے اور زور دار جملوں میں فرق کرتے ہوئے آواز میں دھیماپن یا زور واٹھان ہونا، دوسرے لفظوں میں الفاظ کے معانی کے ساتھ آواز کی مناسبت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس میں نشیب وفراز پیدا کرنا)

۴- وصل ووقف یعنی اس بات کا لحاظ کہ کہاں بالکل نہیں رکنا، کہاں لمحہ بھر کو رکنا ہے اور کہاں پورا سانس توڑنا ہے۔

آپ دو مرتبہ عبارت پڑھ چکے۔ ایک مرتبہ زیرِ لب اور ایک مرتبہ قدرے بلند آواز سے۔ ایک مرتبہ آپ کی آنکھوں نے اسے پڑھا اور ایک مرتبہ آپ کے کانوں نے بھی اسے سنا۔ بصارت اور سماعت کے اس مشترکہ استعمال کا مطلب ہے آپ اس کے جوہر اور ترکیبی عناصر سے اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں۔ اب تیسری مرتبہ اس کو بغیر آواز کے پڑھتے جایئے اور الفاظ منتخب کر کے چارٹ کو بھرتے جایئے۔ چارٹ بھر لینے کے بعد اللہ کا نام لے کر کاغذ قلم سنبھالیے اور اوپر دیے گئے طریقے کے مطابق چارٹ میں درج منتخب الفاظ کو اپنے جملوں اور پیراگرافوں میں استعمال کیجیے۔ ایک کے بعد دوسرا چارٹ بھرتے جایئے اور جملے اور پیراگراف بناتے جایئے۔ اللہ کرے کے آپ کو کسی مشفق استاد کی رہنمائی حاصل ہو اور وہ آپ کی مشق دیکھ کر اصلاح دیتے جائیں۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو بھی کام میں جُتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ نیک نیت اور بلند مقصد رکھنے والوں کی محنت ضائع نہیں کرتا۔ اللہ نے چاہا اور اس کا فضل وکرم شامل حال رہا تو آپ چند دنوں میں نتائج خود ملاحظہ کر لیں گے۔ آپ میں اتنی خود اعتمادی پیدا ہو جائے گی کہ آپ تحریر لکھنے کو معمول کا کام سمجھتے ہوئے بے جھجک لکھنے کا آغاز کریں گے اور خوبصورت انداز میں اس کے اختتام تک جا پہنچیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مُتضاد و متقابل

بعض الفاظ معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے کے اُلٹ اور ضد ہوتے ہیں، جیسے: رات کا اُلٹ دِن اور امیر کی ضد غریب ہے۔ انہیں "متضاد" الفاظ کہا جاتا ہے۔ جبکہ بعض الٹ یا ضد تو نہیں ہوتے البتہ ایک دوسرے کے مقابلے میں بولے جاتے ہیں۔ انہیں ''متقابل'' کہا جاتا ہے۔ خالقِ کائنات کے فصیح و بلیغ کلام میں یہ دونوں بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ ثواب وعذاب، جزا و سزا، جنت وجہنم، وعد وعید، ترغیب وترہیب، کافر ومؤمن، صالح وفاسق، عالم وجاہل سب اسی کی مثالیں ہیں۔ ذیل کی آیت پر غور کیجیے:

''اور اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں ہو سکتے؛ اور نہ اندھیرے اور روشنی؛ اور نہ سیاہ اور دھوپ؛ اور زندہ لوگ اور مردے برابر نہیں ہو سکتے.....''(الفاطر:۱۹-۲۲)

متضاد و متقابل الفاظ کا صحیح اور موزوں استعمال تحریر میں حسن اور جان پیدا کر دیتا ہے۔ ذرا ایک نظر ذیل کے اقتباسات پر ڈالیے اور دیکھیے کہ نامور ادیب اس صُنعت کا استعمال کس خوبی سے کرتے تھے:

متضاد کی لڑیاں:

(۱) "ہمارے سامنے تو صرف دو ہی راستے ہیں: "من شاء فليؤمن، ومن شاء فليكفر." کفر واسلام، شرک وتوحید، نور وظلمت، صداقت وکذب، حق وباطل۔ ہر شخص مختار ہے کہ دونوں میں سے ایک اختیار کر لے۔ "لا إكراه في الدين، قد تبيّن الرشد من الغيّ." لیکن جدید فنِ اخلاق کے ماہرین کہتے ہیں کہ گو یہ سچ ہو مگر ان دونوں کے درمیان ایک برزخی اور بین بین راہ بھی ہے اور وہی ہم کو بھی اختیار کرنی چاہیے۔ اسی میں فلاح اور اسی میں ہر دلعزیزی ہے۔ کفر واسلام دونوں کو ساتھ لیجیے، بت پرستی وتوحید دونوں کو دل میں رکھیے، اہرمن اور یزداں

دونوں کو رام کیجیے۔ ایک ہی طرف کیوں جھکیے، جب دونوں دروازے کشادہ ہو سکیں۔ صرف کعبے ہی کے کیوں ہو رہیے، جب بت کدے سے بھی راہ ورسم قائم رہ سکے۔"

(۲)" ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں، بلکہ تلاشِ زیاں ونقصان میں آئے ہیں۔ صلہ وتحسین کے نہیں، بلکہ نفرت ودشنام کے طلب گار ہیں۔ عیش کے پھول نہیں، بلکہ خلش واضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔ دنیا کے زر وسیم کو قربان کرنے کے لیے نہیں، بلکہ خود اپنے تئیں قربان ہونے آئے ہیں۔''

متقابل کا کمال:

کامیابی کا راز

''صلیبی جہاد نے ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ کو مشرق وسطیٰ کے دوش بدوش کھڑا کر دیا تھا۔ یورپ اس عہد کے مسیحی دماغ کی نمایندگی کرتا تھا، مشرق وسطیٰ مسلمانوں کے دماغ کی۔ اور دونوں کی متقابل حالت سے ان کی متضاد نوعیتیں آشکارا ہوگئی تھیں۔ یورپ مذہب کے مجنونانہ جوش کا علم بردار تھا، مسلمان علم ودانش کے علمبردار تھے۔ یورپ دعاؤں کے ہتھیار سے لڑنا چاہتا تھا، مسلمان لوہے اور آگ کے ہتھیاروں سے لڑتے تھے۔ یورپ کا اعتماد صرف خدا کی مدد پر تھا، مسلمانوں کا خدا کی مدد پر بھی تھا لیکن خدا کے پیدا کیے ہوئے سروسامان پر بھی تھا۔ ایک صرف روحانی قوتوں کا معتقد تھا، دوسرا روحانی اور مادّی دونوں کا۔ پہلے نے معجزوں کے ظہور کا انتظار کیا، دوسرے نے نتائج عمل کے ظہور کا۔ معجزے ظاہر نہیں ہوئے لیکن نتائجِ عمل نے ظاہر ہو کر فتح وشکست کا فیصلہ کر دیا۔ ژواین ویل کی سرگزشت میں بھی یہ متضاد تقابل ہر جگہ نمایاں ہے۔ جب مصری فوج نے منجنیقوں کے ذریعہ آگ کے بان پھینکنے شروع کیے تو فرانسیسی جن کے پاس پرانے دستی ہتھیاروں کے سوا اور کچھ نہ تھا، بالکل بے بس ہوگئے۔ ژواین ویل اس سلسلے میں لکھتا ہے: ''ایک رات جب ہم ان برجیوں پر جو دریا کے راستے کی حفاظت کے لیے بنائی گئی تھیں، پہرہ دے رہے تھے تو اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے ایک انجن جسے پٹریری یعنی منجنیق کہتے ہیں، لاکر نصب کر دیا اور اس سے ہم پر آگ پھینکنے لگے۔ یہ حال دیکھ کر میرے لارڈ والٹر نے جو ایک اچھا نائٹ تھا، ہمیں مخاطب کیا:

''اس وقت ہماری زندگی کا سب سے بڑا خطرہ پیش آگیا ہے، کیونکہ اگر ہم نے ان برجیوں کو نہ چھوڑا اور مسلمانوں نے ان میں آگ لگادی تو ہم بھی برجیوں کے ساتھ جل کر خاک ہو جائیں گے لیکن اگر ہم برجیوں کو چھوڑ کر نکل جاتے ہیں تو پھر ہماری بے عزتی میں کوئی شبہ نہیں، کیونکہ ہم ان

کی حفاظت پر مامور کیے گئے تھے۔ ایسی حالت میں خدا کے سوا کوئی نہیں جو ہمارا بچاؤ کر سکے۔ میرا مشورہ آپ سب لوگوں کو یہ ہے کہ جونہی مسلمان آگ کے بان چلائیں، ہمیں چاہیے کہ گھٹنے کے بل جھک جائیں اور اپنے نجات دہندہ خداوند سے دعا مانگیں کہ اس مصیبت میں ہماری مدد کرے۔"

چنانچہ ہم سب نے ایسا ہی کیا۔ جیسے ہی مسلمانوں کا پہلا بان چلا، ہم گھٹنوں کے بل جھک گئے اور دعا میں مشغول ہو گئے۔ یہ بان اتنے بڑے ہوتے تھے جیسے شراب کے پیپے اور آگ کا شعلہ جو ان سے نکلتا تھا اس کی دُم اتنی لمبی ہوتی تھی جیسے ایک بہت بڑا نیزہ۔ جب یہ آتا تو ایسی آواز نکلتی جیسے بادل گرج رہے ہوں۔ اس کی شکل ایسی دکھائی دیتی تھی جیسے ایک آتشیں اژدہا ہوا میں اُڑ رہا ہے۔ اس کی روشنی نہایت تیز تھی۔ چھاؤنی کے تمام حصے اس طرح اجالے میں آجاتے جیسے دن نکل آیا۔ ہو اس کے بعد خود لوئس کی نسبت لکھتا ہے ہر مرتبہ جب بان چھوٹنے کی آواز ہمارا ولی صفت بادشاہ سنتا تھا تو بستر سے اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور روتے ہوئے ہاتھ اٹھا اٹھا کر ہمارے نجات دہندہ سے التجائیں کرتا: "مہربان مولیٰ! میرے آدمیوں کی حفاظت کر۔" میں یقین کرتا ہوں کہ ہمارے بادشاہ کی ان دعاؤں نے ہمیں ضرور فائدہ پہنچایا۔"

لیکن فائدہ کا یہ یقین خوش اعتقادانہ وہم سے زیادہ نہ تھا کیونکہ بالآخر کوئی دعا بھی سودمند نہ ہوئی اور آگ کے بانوں نے تمام برجیوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ یہ حال تو تیرھویں صدی مسیحی کا تھا لیکن چند صدیوں کے بعد جب پھر یورپ اور مشرق کا مقابلہ ہوا تو اب صورت حال یکسر الٹ چکی تھی۔ اب بھی دونوں جماعتوں کے متضاد خصائص اسی طرح نمایاں تھے جس طرح صلیبی جنگ کے عہد میں رہے تھے، لیکن اتنی تبدیلی کے ساتھ کہ جو دماغی جگہ پہلے یورپ کی تھی وہ اب مسلمانوں کی ہو گئی تھی اور جو جگہ مسلمانوں کی تھی اسے اب یورپ نے اختیار کر لیا تھا۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو مُراد بک نے جامع ازہر کے علما کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ علماء ازہر نے بالاتفاق یہ رائے دی تھی کہ جامع ازہر میں صحیح بخاری کا ختم شروع کر دینا چاہیے کہ انجاحِ مقاصد کے لیے تیر بہ ہدف ہے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا لیکن ابھی صحیح بخاری کا ختم ختم نہیں ہوا تھا کہ اہرام کی لڑائی نے مصری حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ شیخ عبدالرحمٰن الجبرتی نے اس عہد کے چشم دید حالات قلم بند کیے ہیں اور بڑے ہی عبرت انگیز ہیں۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جب روسیوں نے بخارا کا محاصرہ کیا تھا تو امیرِ بخارا نے حکم دیا کہ

تمام مدرسوں اور مسجدوں میں ختم خواجگان پڑھا جائے۔ادھر روسیوں کی قلعہ شکن توپیں شہر کا حصار منہدم کر رہی تھیں، ادھر لوگ ختمِ خواجگان کے حلقوں میں بیٹھے ''یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ! یَا مُحَوِّلَ الْأَحْوَالِ!'' کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ بالآخر وہی نتیجہ نکلا جو ایک ایسے مقابلہ کا نکلنا تھا جس میں ایک طرف گولہ بارود ہو دوسری طرف ختمِ خواجگان۔ دعائیں ضرور فائدہ پہنچاتی ہیں مگر انہی کو پہنچاتی ہیں جو عزم و ہمت رکھتے ہیں۔ بے ہمتوں کے لیے تو وہ ترکِ عمل اور تعطلِ قویٰ کا حیلہ بن جاتی ہیں۔''

آپ غور کیجیے کہ اگر ان عبارات سے تضاد وتقابل کے حُسن کو چھین لیا جائے تو ان میں کچھ نہیں بچے گا۔ذیل میں دونوں قسم کے الفاظ کی ایک فہرست دی جاتی ہے۔

متضاد الفاظ

الفاظ	مُتضاد		الفاظ	مُتضاد
آس	یاس		آزاد	غلام
آسان	مشکل، دشوار		آزادی	غلامی
اگاڑی	پچھاڑی		اصل	نقل
آشنا	بیگانہ		اندھیرا	اُجالا
اندرونی	بیرونی		امانت	خیانت
آباد	ویران		اپنا	غیر
اجنبی	واقف		اُتار	چڑھاوَ
اوج	پستی		اچھا	بُرا
انسانیت	حیوانیت		امیر	غریب
امارت	غربت		اہل	نااہل
اتفاق	اختلاف		اقرار	انکار
اندر	باہر		اقبال	ادبار

مشق

۱- ذیل میں دی گئی عبارت سے متضاد و متقارب الفاظ چن کر نکالیے اور پھر انہیں اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

"ایک طبقہ کا خیال ہے کہ کافرانہ قوتوں کا جہاں جہاں غلبہ، ہے وہاں مسلمان حالات سے سمجھوتہ کرلیں۔ مصلحت پسندی کی لگام سے حالات قابو کریں۔ شدت پسندی کی باگ تیاگ دیں۔ ہواؤں کا رخ پہچانیں اور بدلتے موسموں کا ساتھ دیں۔ اس طرح وہ ظلم کے شکنجوں سے محفوظ اور کفر کی یلغار سے بچے رہیں گے۔

لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال درست نہیں۔ کفر کی آغوش میں چلے جانے، کافرانہ تسلط کو قبول کر لینے اور ابلیسانہ نظام کا ساتھ دے لینے سے وہ ظلم کے شکنجوں سے تو شاید محفوظ رہ جائیں، لیکن کفر کے جھٹکوں سے ان کے ایمان کی عمارت زمیں بوس ہو جائے گی اور یہ بڑے گھاٹے کا سودا ہو گا۔ بحیثیت مسلمان ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ حق و باطل کے معرکے جاری رہیں گے۔ ظلم و انصاف کی جنگ برپا رہے گی۔ کفر و اسلام کی کشمکش سدا رہے گی۔ صداقتوں کی صدا لگانے والے فنا ہو سکتے ہیں، لیکن صدائے حق باقی رہتی ہے۔ جفا کی تیغ وفا شعاروں کی گردن کاٹ سکتی ہے، جھکا نہیں سکتی۔ اس لیے ہمیں ان کے ہاتھوں کو مضبوط کرنا چاہیے جنھوں نے اسلام کا پرچم اٹھایا ہے۔ ان قدموں کو سہارا دینا چاہیے جو راہ حق کی رکاوٹوں کو عبور کرنے کے لیے بڑھ رہے ہیں۔ اُن اہلِ جنوں کو استحکام بخشنا چاہیے جو کفر کے خلاف مزاحمت کا نشاں بنے ہوئے ہیں۔ جو حالات کے جبر سے ابدی حقیقتوں پر سمجھوتا کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جن کے ایمان و تمنا کی شاخ تازہ ظلم کی دشتِ بے اماں میں لہرا رہی ہے۔ جو شبِ ظلمت میں بانگِ سحر کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ اُن کی جانی مدد نہ ہو تو مالی مدد کی جائے۔ اُن کے ساتھ اخلاقی اور نظریاتی تعاون کیا جائے اور ان کی استقامت کے لیے دعا کی جائے۔"

۲- کسی مشہور ادیب کے مضمون سے متضاد و متقابل الفاظ الگ کر کے انہیں جملوں میں استعمال کیجیے۔

۳- اسکینگ چارٹ کیا ہے؟ اور اس کی اہمیت کیا ہے؟

٤-''متقابل'' کی وضاحت کریں اور مثالیں لکھیں۔

٥-تحریر کو ابتدائی طور پر سمجھنے کے لیے اس کی زبانی قراءت کی اہمیت اور طریقہ درج کریں۔

مترادف ومتقارب

ہم معنی الفاظ کو ''مترادف'' اور قریب المعنی الفاظ کو ''متقارب'' کہتے ہیں، جیسے: آرائش وزیبائش، حریت وآزادی اور ظلم وستم میں ''ترادف'' اور حق وصداقت، عزت ونیک نامی اور متحد ومنظم میں ''تقارب'' ہے۔ تضاد وتقابل کی طرح ترادف وتقارب کی ''صنعت'' بھی تحریر وتقریر میں حسن ورعنائی، زور واٹھان اور دلچسپی وشگفتگی پیدا کرنے کی ضامن ہے۔ مثلاً ذیل کی عبارات کو پڑھیے اور دیکھیے کہ جہاں ردھم، ہم آہنگی اور زور ہے، وہ دراصل ترادف یا تقارب کا مرہون منت ہے۔

ترادف کا حسن:

(۱) ''ہم کس طرح اپنے دل کے خونچکاں ٹکڑوں کو دنیا کے سامنے رکھ دیں کہ ایک ایک آنکھ میں اشک ہائے غم کے دریا موجزن ہوجائیں!؟ ہم کس طرح اپنے زخم ہائے جگر کے ٹانکے کھول دیں کہ ایک ایک قلب، جذبات۔ درد والم کے طوفان سے معمور ہوجائے!؟ ہم کس طرح اپنے سینے کو چیر کر اس کے داغوں کی قیامت خیز بہار کو وقفِ تماشا کردیں کہ ایک ایک زبان آہ وفغاں کی شورشوں کا محشرستان بن جائے!؟

آہ! کہاں ہیں وہ آنکھیں جو کاروانِ اسلام کی مصیبتوں پر خوں فشانی کرنے کی دعویدار ہیں؟ کہاں ہیں وہ قلب جو قافلۂ حق وصداقت کے مٹنے پر تڑپنے اور لوٹنے کے لیے مضطرب ہیں اور کہاں ہیں وہ زبانیں جو حریت وآزادی کی آرائش وزیبائش چھن جانے پر اپنے نالہ وشیون سے عرش کے کنگروں کو ہلا دینا چاہتی ہیں...... کہ جبر وتشدد کے طاغوت نے قیامت برپا کردی، ظلم وجبر کے شیطانوں کی زنجیریں اتار دی گئیں، غضب ودشنام کا جہنم بھڑک اٹھا اور ستم وتعدی کا سمندر تلاطم پر اتر آیا......''

تقارب کا زور:

کبھی ہم معنی کے بجائے قریب المعنی الفاظ استعمال کر کے کلام میں زور پیدا کیا جاتا ہے:

''کیا کبھی مسلمانوں نے سوچا ہے کہ وہ اس ملک میں اتنے کمزور، اتنے ذلیل، اتنے رسوا کیوں ہیں؟ ان کی اس ذلت ورسوائی کا راز یہ ہے کہ ان میں اتحاد نہیں۔ ان کی طاقتوں میں تنظیم نہیں۔ آؤ! ایک دفعہ فیصلہ کرلو کہ تمہیں اس دنیا میں عزت واقتدار کے ساتھ رہنا ہے اور یاد رکھو کہ عزت واقتدار کی نعمت صرف اس قوم کو ملتی ہے جو متحد ومنظم ہو۔ آپس میں بھی لڑو اور دشمن پر بھی فتح پاؤ، یہ دنیا میں نہ آج تک کہیں ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ تم بہت آزما چکے ہو۔ جی چاہے تو اور آزما دیکھو.....''

''پاکستان میں ہم نے بدقسمتی سے کوئی ایسا ادارہ نہیں چھوڑا جس پر ہم فخر کرسکیں۔ اس ملک کے سیاستدان کرپٹ ثابت ہوئے۔ بیوروکریٹ رسوا ہوئے۔ پولیس بے اعتماد ہوئی۔ اساتذہ کرام سے یقین اٹھا اور آخر میں عدلیہ کے میناروں سے بھی مٹی جھڑنا شروع ہوگئی۔''

(۲) ''یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سرفروشی وجاں بازی، جہاد وقربانی اور تجدید وانقلاب وفتح وتسخیر کے لیے جس روحانی وقلبی قوت، جس وجاہت وشخصیت، جس اخلاق وللہیت، جس جذب وکشش اور جس حوصلہ وہمت کی ضرورت ہے، وہ بسا اوقات روحانی ترقی، صفائی باطن، تہذیب نفس، ریاضت وعبادت کے بغیر نہیں پیدا ہوتی، اس لیے آپ دیکھیں گے کہ جنہوں نے اسلام میں مجددانہ یا مجاہدانہ کارنامے انجام دیئے ہیں، ان میں سے اکثر افراد روحانی حیثیت سے بلند مقام رکھتے تھے، ان آخری صدیوں پر نظر ڈالیے، امیر عبدالقادر الجزائری، مجاہد جزائر، محمد احمد السوڈانی (مہدی سوڈانی)، سید احمد شریف السوسی (امام سنوسی) کو آپ اس میدان کا مرد پائیں گے، حضرت سید احمد ایک مجاہد قائد کے علاوہ اور اس سے پہلے ایک عزیز القدر روحانی پیشوا اور بے مثل شیخ الطریقت تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مجاہدات وریاضت، تزکیہ نفس، قرب الٰہی سے عشق الٰہی اور جذب وشوق کا جو مرتبہ حاصل ہوتا ہے، اس میں ہر رونگٹے سے یہی آواز آتی ہے۔

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر
مگر یہ زندگئ مستعار رکھتے ہیں

اس لیے روحانی ترقی اور کمال باطنی کا آخری لازمی نتیجہ شوق شہادت ہے، اور مجاہدے کی تکمیل جہاد ہے۔ (سیرت سید احمد شہیدؒ)

آپ نے غور کیا کہ اگر ان عبارتوں سے ترادف وتقابل پر مبنی الفاظ نکال لیے جائیں تو یہ کس قدر بے جان اور بے روح ہو جائیں گی؟

تحریر وتقریر کا حسن:

یاد رہے کہ تحریر کی طرح تقریر میں بھی ''تضاد وتقابل'' اور ''ترادف وتقارب'' اپنا کمال دکھاتے ہیں۔ آگے دی گئی ایک عبارت امیر شریعت حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کی ایک معرکۃ الآراء تقریر سے اقتباس ہے۔ اس میں حضرت کی خطابت اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ آپ کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہونا چاہیے کہ اس کی اٹھان، اس کے زور اور اس کی سحر آفرینی کا راز ''تضاد وتقابل'' اور ''ترادف وتقارب'' میں پوشیدہ ہے۔

تصویر کا دوسرا رخ

"تصویر کا ایک رخ تو یہ ہے کہ مرزا غلام قادیانی میں یہ کمزوریاں اور عیوب تھے: اس کے نقوش میں توازن نہ تھا۔ قد وقامت میں تناسب نہ تھا۔ اخلاق کا جنازہ تھا۔ کیریکٹر کی موت تھی۔ سچ کبھی نہ بولتا تھا۔ معاملات کا درست نہ تھا۔ بات کا پکا نہ تھا۔ بزدل اور ٹوڈی تھا۔ تقریر وتحریر ایسی ہے کہ پڑھ کر متلی ہونے لگتی ہے..... لیکن میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ اگر اس میں کوئی کمزوری بھی نہ ہوتی۔ وہ مجسمۂ حسن و جمال ہوتا۔ قویٰ میں تناسب ہوتا۔ چھاتی ۴۵ انچ کی، کمر ایسی کہ سی آئی ڈی کو بھی پتہ نہ چلتا۔ بہادر بھی ہوتا۔ مرد میدان ہوتا۔ کیریکٹر کا آفتاب اور خاندان کا ماہتاب ہوتا۔ شاعر ہوتا۔ فردوسی وقت ہوتا۔ ابوالفضل اس کا پانی بھرتا۔ خیام اس کی چاکری کرتا۔ غالب اس کا وظیفہ خوار ہوتا۔ انگریزی کا شیکسپیئر اور اُردو کا ابوالکلام ہوتا۔ پھر نبوت کا دعویٰ کرتا تو کیا

ہم اُسے نبی مان لیتے ؟ میں تو کہتا ہوں کہ اگر علی دعویٰ کرتے کہ جسے تلوار حق نے دی اور بیٹی نبی نے دی، سیدنا ابوبکر صدیق سیدنا فاروق اعظم اور سیدنا عثمان غنی بھی دعویٰ کرتے تو کیا بخاری انہیں نبی مان لیتا؟ نہیں اور ہرگز نہیں! میاں صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کائنات میں کوئی انسان ایسا نہیں جو تختِ نبوت پر سج سکے اور تاجِ امامت ورسالت جس کے سر پر ناز کرے۔ والصلاۃ والسلام علیٰ سید الرسل و خاتم الانبیاء۔"

آپ ہی بتائیے!

"آپ ہی بتائیے کہ اس طرح کی جامد، لایعنی اور بے معنی زندگی، آپ حضرات کے لیے زیبا ہے؟ ہم اگر اس علم وفن کو بھی نہ سمجھیں اور نہ سمجھنے کی کوشش کریں، جس کے پڑھنے، سمجھنے، سمجھانے بتانے اور اس کی روشنی میں اپنی، اپنے لوگوں کی، پھر خلقِ خدا کی زندگی کی چول بٹھانے کے مقصد سے ہی ہم اسلامی تعلیم کے ان قلعوں کا رخ کرتے ہیں، تو آپ ہی بتائیے کہ کیا اس سے دین کی خدمت اور اسلام کا کلمہ بلند کرنے کا کوئی عمل اس ترقی یافتہ دنیا میں انجام دیا جا سکتا ہے، جس میں لوگ چاند پر بسنے، ستاروں پر کمند ڈالنے اور فضا میں آبادی بسانے کی سوچ رہے ہیں، جس میں دنیا کے آخری سرے کی تازہ ترین معلومات آن کی آن میں معلوم کی جا سکتی ہے، جس میں گھر بیٹھے بٹھائے کمپیوٹر کی ترقی یافتہ شکل کے ذریعے کسی بھی علم وفن کی کوئی بھی جان کاری حاصل کی جا سکتی ہے، جس میں تمام سرگرمیاں برقِ خاطف کی طرح انجام پذیر ہوتی ہیں، جس میں کامیابی وناکامی کے طریقے، سازش کے عناوین اور دشمنی کے اسالیب بدل گئے ہیں اور ہر چیز کا پیمانہ ومیزان از سرِ نو بنایا گیا ہے۔ یہ دور اسلام کے خدام سے اس بات کا متقاضی ہے کہ اصولِ اسلام اور ثوابتِ دین پر باقی رہتے ہوئے وہ زمانے سے ہم آہنگ ہوں، اس کی دوڑ میں شریک ہوں، ہواؤں کا رخ سمجھیں، حالات کے اشاروں کو باور کریں، ترقی کے قافلوں کو نہ صرف چھونے پر اکتفا کریں، بلکہ انہیں زیادہ ترقی کے ساتھ اپنے پیچھے چلنے پر مجبور کر دیں۔

ضمیر لالہ میں روشن، چراغ آرزو کردے
چمن کے ذرّے ذرّے کو، شہیدِ جستجو کردے"

(مولانا نور عالم خلیل، حرفِ شیریں: ۳۲)

ذیل میں حروفِ تہجی کی ترتیب سے مشہور مترادفات اور متقاربات کی فہرست دی جا رہی ہے۔ آپ اپنے ذخیرۂ الفاظ میں مترادف ومتقارب الفاظ کا اضافہ کیجیے اور انہیں حسبِ موقع تحریر میں سمونا سیکھیے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ آپ اچھے قلم کار بن جائیں گے۔

مترادف الفاظ

الفاظ	مترادف		الفاظ	مترادف
آسان	سہل		امیر	مالدار
آس	اُمید		آغاز	ابتدا
آبرو	عزت		احمق	بیوقوف
استقامت	ثابت قدمی		انجمن	بزم
آدمی	انسان، بشر		اُجالا	روشنی
اندھیرا	تاریکی		اہلیت	قابلیت
امر	حکم		آرام	آسائش
آرائش	زیبائش		آسمان	فلک
اجنبی	ناواقف		انتخاب	چناؤ

متقارب الفاظ

الفاظ	مترادف		الفاظ	مترادف
افکار	نظریات		عزم	ہمت
عقل	ادراک		برگ	بار
تعمیر	تکمیل		آہ	فغاں
جبر	تشدد		صلہ	تحسین

عبادت	ریاضت		زوال	پسماندگی
رحم	کرم		علوم	فنون
خوف	ہراس		اثر	رسوخ
قلب	نظر		عقیدت	احترام
مزاج	مذاق		شہرت	مقبولیت
دل	دماغ		تقریر	تحریر
تعلیم	تربیت		موقع	محل
پیچ	تاب		مال	اسباب
حیران	سرگرداں		مقبول	معروف
علم	ادب		شکل	نوعیت
درد	الم		رکوع	سجود
قدر	قیمت		عجیب	غریب
نرم	گرم		سنجیدہ	معتدل
وعظ	احتساب		تحمل	تدبر
فہم	فراست		تدبر	تفکر
مسجع	مقفیٰ			

مشق

۱-ذیل کی تحریر میں غور کرکے بتایئے کہ مترادف ومتقارب الفاظ کون سے ہیں اور متضاد ومتقابل کون سے؟ پھر انہیں کالم وار لکھیں اور جملوں میں استعمال کرکے دکھائیں:

''پہلے چونکہ مسلم امت کے ذہین اور باصلاحیت افراد تصوف سے رجوع ہوکر اپنی صلاحیتوں میں جلا پیدا کرتے تھے اور ایمان ویقین کی غیر معمولی قوت حاصل کرکے اپنی علمی اور عملی توانائیاں فروغ اسلام کی جدوجہد میں صرف کرتے تھے۔اب یہ صورتحال نہیں ہے۔اسلامی فکر سے متاثر تعلیم یافتہ آبادی تصوف سے فیوض کے حصول کے لیے تیار نہیں، اپنی کوششوں سے اخلاص ویقین کی قوت کا حصول مشکل ہے، اس لیے دفاع اسلام کا فریضہ بہتر اور مؤثر طور سرانجام ہونہیں پارہا ہے۔

اس سلسلہ میں مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ صاحب نے اپنے مربی حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ کے شکوہ کو کتنے بہتر طور پر پیش فرمایا ہے۔لکھتے ہیں، مولانا نے فرمایا:

''مولوی صاحب تصوف دین کے کام چھڑانے کیلیے نہیں ہے۔ بلکہ اس سے تو دین کے کاموں میں تقویت آتی ہے اور جان پڑتی ہے، لیکن کیا عرض کیا جائے، اللہ کی مشیت ہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کے کاموں کے قابل بنایا ہے، وہ اب ادھر توجہ ہی نہیں کرتے، حالانکہ اگر وہ تھوڑی سی توجہ ادھر دیدیں تو دیکھیں کہ ان کے کاموں میں کتنی قوت آتی ہے۔ حضرت خواجہ صاحب (حضرت باقی باللہ) نے حضرت مجدد (الف ثانی) صاحب، حضرت شاہ (ولی اللہ) صاحب اور حضرت سید (احمد شہید) نے ہمارے اس ملک میں دین کی جو خدمتیں انجام دیں اور جو کچھ کردکھایا (جن کا سواں اور ہزارواں حصہ بھی ہماری بڑی بڑی انجمنیں اور جماعتیں نہیں کرسکتی ہیں) اس میں ان کے اخلاص اور قلب کی اس طاقت کو خاص دخل تھا، جو تصوف کے راستے سے پیدا کی گئی تھی، لیکن اب صورت یہ ہے کہ اس طرف صرف وہی بے چارے آتے ہیں، جو اللہ اللہ کرنے کے کام کے ہی ہوتے ہیں، یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں

استعدادیں مختلف رکھی ہیں، ناقص، اعلیٰ استعداد والوں کا کام نہیں کرسکتا۔'' پھر اسی سلسلہ میں فرمایا:
''معلوم نہیں لوگ تصوف کو کیا سمجھتے ہیں، تصوف تو بس اخلاص اور عشق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، اور جو کام عشق کی طاقت سے اور اخلاص کی برکت سے ہوسکتا ہے، وہ اس کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ تو دراصل تصوف ضروری نہیں ہے، بلکہ عشق واخلاص پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر کسی کو اس کے حاصل کرنے کا اس سے بھی آسان اور مختصر کوئی اور راستہ معلوم ہو جائے تو مبارک ہے، وہ اسی راستے سے حاصل کرلے اور ہم کو بھی بتلا دے، ہم تو اسی راستے کو جانتے ہیں، جس کا اللہ کے ہزاروں صادق بندوں نے سینکڑوں برس سے تجربہ کیا ہے، جن میں سینکڑوں وہ تھے، جو دین کے اس شعبہ میں مجتہد تھے اور صاحب الہام بھی تھے۔''

(بیس بڑے مسلمان: عبدالرشید ارشد، ص: ١٩٦، مضمون: مولانا محمد منظور نعمانی)

٢- کچھ مزید تحریرات سے مترادف اور متضاد الفاظ الگ کرکے ان سے دوسطری جملے بنائیے۔

٣- تحریر کی خوبی اور خوبصورتی میں صنعت ترادف کے استعمال کی اہمیت ذکر کریں۔

٤- ''آپ ہی بتائیے'' والے عنوان سے مترادا ور متقارب الگ کیجیے۔

٥- مترادف ومتقارب الفاظ کی فہرست کا بغور مطالعہ کریں اور نئے الفاظ ذہن نشین کریں۔

تشبیہات

کلام میں فصاحت وبلاغت پیدا کرنے ،اس کے حسن کو دوبالا کرنے ،اس کی خوبی بڑھانے اور اسے دل کش بنانے کے لیے مناسب اور موزوں تشبیہات سے مزین کیا جاتا ہے۔ تشبیہ کے ارکان تین ہوتے ہیں۔ (۱) مشبہ: وہ چیز جسے تشبیہ دی جائے۔ (۲) مشبہ بہ: وہ چیز جس کے ساتھ تشبیہ دی جائے۔ (۳) وجہ تشبیہ: مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان وہ مشترک وصف جس کی بنیاد پر تشبیہ دی گئی۔ جیسے: "زید چیتے کی طرح پھرتیلا ہے۔" اس جملے میں زید "مشبہ"، چیتا "مشبہ بہ" اور پھرتیلا پن "وجہ تشبیہ" ہے۔ چند خاص اور مشہور تشبیہات درج ذیل ہیں:

۱- آسمان کی طرح بلند	۲- ایوب کی طرح صابر
۳- الو کی طرح احمق	٤- اسمٰعیل کی طرح فرمانبردار
۵- انگاروں کی طرح لال	٦- اون جیسا نرم
۷- امیدوں کی طرح طویل	۸- بکری کی طرح ڈرپوک
۹- بلور جیسا شفاف	۱۰- بچوں کی طرح معصوم
۱۱- بال جیسا باریک	۱۲- بانس کی طرح لمبا
۱۳- بجلی کی سی تیزی	١٤- بجلی جیسی چمک
۱۵- بت کی طرح خاموش	١٦- پانی جیسا پتلا
۱۷- پتھر کی طرح سخت	۱۸- توے کی طرح کالا
۱۹- تلوار کی طرح تیز	۲۰- تنور کی طرح گرم

استعارات

تعریف:

استعارہ کے لغوی معنی ہیں: ''ادھار لینا'' علمِ بیان کی اصطلاح میں جب کوئی لفظ مجازی معنوں میں اس طرح استعمال کیا جائے کہ اس کے حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق ہو تو اسے استعارہ کہتے ہیں، مثلاً: چاند کہہ کر بچہ مراد لے لیں، شیر کہہ کر کسی بہادر شخص کا ذکر کریں یا کسی سخی کو حاتم کہہ کر پکاریں تو چاند، شیر اور حاتم استعارے ہوں گے۔

ارکانِ استعارہ:

استعارے کے تین ارکان ہوتے ہیں: مستعارلہ، مستعار منہ اور وجہ جامع۔

مستعارلہ: وہ شخص یا چیز جس کے لیے کوئی لفظ مستعار لیا گیا ہے۔ تشبیہ میں یہی "مشبہ" ہوتا ہے۔

مستعار منہ: وہ شخص یا چیز جسے مستعار لیا گیا ہو۔ تشبیہ میں یہی "مشبہ بہ" ہوتا ہے۔

مستعارلہ، اور مستعار منہ کو " طرفینِ استعارہ" کہتے ہیں۔

وجہ جامع: وہ مشترک خوبی جو مستعارلہ اور مستعار منہ میں پائی جائے۔ تشبیہ میں یہی ''وجہ تشبیہ'' کہلاتی ہے۔

وضاحت: استعارہ کے تین ارکان میں سے صرف ''مستعار منہ'' یعنی ''مشبہ بہ'' مذکور ہوتا ہے۔ بقیہ دو محذوف رہتے ہیں۔

استعارے کی چند مزید مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

پہلی مثال:

ستارے کانپ کر پلکوں سے دامن میں اتر آئے
چراغاں میں سنی اک بے وفا نے داستاں میری

داستانِ غم سناتے وقت پلکوں سے ستارے (آنسو) دامن میں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے اور یوں چراغاں کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔

دوسری مثال:

کیا مرے حال پہ سچ مچ انہیں غم تھا قاصد
تو نے دیکھا تھا ستارہ سرِ مژگاں کوئی

اے قاصد! محبوب کو واقعی میرے حال زار پر غم تھا۔ تو نے ان کی مژگاں (پلکوں) پر کوئی ستارہ (آنسو) دیکھا تھا۔

اس شعر میں ''آنسو'' مستعار لہ، ''ستارہ'' مستعار منہ اور ''چمک'' وجہ جامع ہے۔

تیسری مثال:

سورج ڈوبتا ہے تو آسمان پر شفق کی سرخی یوں بکھر جاتی ہے جیسے لالے کے پھول، جیسے شراب۔ استعارے کی شکل یوں ہوگی:

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو
طشتِ افق سے لے کر لالے کے پھول مارے

سورج نے غروب ہوتے وقت افق کے تھال سے لے کر، سیاہ قبا والی شام کو لالے کے پھول (شفق کے لیے استعارہ) مارے۔

اس شعر میں ''شفق'' مستعار لہ، ''لالے کے پھول'' مستعار منہ اور ''سرخی'' وجہ جامع ہے۔

تشبیہ اور استعارے میں فرق:

تشبیہ میں مشبّہ اور مشبّہ بہٖ دونوں کا ذکر ہوتا ہے اور وہ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوتے

ہیں اور حرفِ تشبیہ کے ذریعے تشبیہ کا اظہار بھی کیا جاتا ہے، جبکہ استعارے میں صرف مستعار منہ (یعنی مشبہ بہٖ) مذکور ہوتا ہے اور حرفِ تشبیہ تو لایا ہی نہیں جاتا۔ مثلاً:

طشتِ افق سے لے کر لالے کے پھول مارے
تم ہو کہ ایک پھول کھلا ہے گلاب کا

اس میں دوست کے حسن و جمال کو شگفتہ گلاب کے مانند قرار دیا گیا ہے گویا مشبہ اور مشبّہ بہٖ دونوں حقیقی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں اور کہ کا لفظ تشبیہ کا تعلق پیدا کر رہا ہے۔

اب بات میں مزید حسن پیدا کرنے کے لیے ہم مجازی انداز اپناتے ہوئے کسی عزیز شخصیت کو گلاب کے مانند قرار دینے کے بجائے اسے فی الواقع گلاب ہی کہہ دیں یا دوسرے لفظوں میں گلاب کو اس محبوب وجود کے لیے ادھار لے کر مجازی مفہوم میں استعمال کر لیں تو اسے ''استعارہ'' کہیں گے، مثلاً:

رنگ و بُو کا گلاب کہہ لوں نا
موجِ جامِ شراب کہہ لوں گا

گویا گلاب کا حقیقی مفہوم تو ایک خوبصورت پھول ہے مگر یہاں اسے کسی محبوب کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اس کا مجازی مفہوم ہے اور دونوں کے درمیان تشبیہ کا تعلق موجود ہے کہ حسن کی خوبی دونوں میں مشترک ہے۔ یہی ''استعارہ'' ہے۔ گویا استعارہ میں محض کسی کے مشابہ قرار نہیں دیا گیا، بلکہ بعینہٖ وہی چیز بنا دیا گیا ہے۔ گویا مشبّہ بہٖ کو عینِ مشبہ ٹھہرا لیتے ہیں اور مشبّہ بہٖ کو مشبّہ کے لیے مستعار لے لیتے ہیں۔ اس لیے استعارے میں مشبہ اور حرفِ تشبیہ کا ذکر نہیں ہوتا، جیسے:

میں اس گل کو پیغام کہتا ہزاروں
ہوا ہو گئی پر صبا کہتے کہتے

اس شعر میں محبوب کے لیے گل کو استعارہ کے طور پر لیا گیا ہے۔ محبوب (مشبّہ) کا ذکر نہیں ہے۔ گل (مشبّہ بہٖ) کو محبوب (مشبّہ) بنا دیا گیا ہے اور حرفِ تشبیہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب اس شعر میں غور کیجیے۔ اس میں تشبیہ بھی ہے اور استعارہ بھی۔

ہوگا وہ رنگ و بو کا سفینہ یہیں کہیں

چکرا رہا ہے دل مرا گرداب کی طرح

اس شعر کے پہلے مصرعے میں استعارہ ہے دوسرے میں تشبیہ۔

شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ میرا دل (مشبّہ) گرداب یعنی بھنور (مشبّہ بہ) کی طرح (حرفِ تشبیہ) چکرا (وجہ شبہ) رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ رنگ و بو کا سفینہ (محبوب کے لیے استعارہ) کہیں آس پاس جلوہ گر ہے۔

تشبیہ اور استعارے میں فرق کا خلاصہ:

تشبیہ اور استعارے میں مندرجہ ذیل پانچ فرق ہوتے ہیں:

تشبیہ	استعارہ
۱-مشبہ اور مشبہ بہ دونوں کا ذکر ہوتا ہے۔	۱-صرف مشبہ بہ کا ذکر ہوتا ہے۔
۲-حروفِ تشبیہ کے ذریعے تشبیہ دی جاتی ہے۔	۲-حرفِ تشبیہ نہیں ہوتا۔ مشبہ بہ کو براہِ راست مشبہ بنالیا جاتا ہے۔
۳-ارکان چار ہوتے ہیں۔	۳-ارکان تین ہوتے ہیں۔
٤-علم بیان کی ابتدائی شکل ہے۔	٤-علم بیان کی بلیغ صورت ہے۔
٥-بنیاد حقیقت پر ہوتی ہے۔	٥-بنیاد خیال اور مجازی تصور پر ہوتی ہے۔

تشبیہ اور استعارے میں فرق مثالوں کی رُو سے:

(۱) تشبیہ دیتے ہوئے ہم آنسو کو موتی اور ستارے کی طرح قرار دیتے ہیں، مگر استعارے میں موتی اور ستارے کو بعینہٖ آنسو بنا دیا جاتا ہے، مثلاً:

پلکوں سے گر نہ جائیں یہ موتی سنبھال لو
دنیا کے پاس دیکھنے والی نظر کہاں

دنیا قدردان نہیں اور آنسو قیمتی موتی ہیں، اس لیے انہیں پلکوں میں سنبھال لو اور بکھرنے نہ دو۔

اس شعر میں ''آنسو'' مستعارلہ، ''موتی'' مستعارمنہ اور ''چمک'' وجہ جامع ہے۔ تشبیہ کی صورت میں ہم یوں کہیں گے:

ے موتی سمجھ کر شانِ کریمی نے چن لیے   قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے
ے ان آنسوؤں کو لٹاؤ نہ موتیوں کی طرح   یہ درد دل کی صدائیں ہیں ساتھ لے جاؤ
ے گوہر شناس جھولیاں بھر بھر کے لے گئے   موتی گراں بہا تھے، مرے اشکِ تر نہ تھے

(۲)

سرخ مے برسا رہا تھا شام کا رنگیں شباب
دور کھیتوں کے کنارے جھک رہا تھا آفتاب

آفتاب کھیتوں کے کنارے جھک رہا تھا اور شام کی رنگین جوانی آسمان پر سرخ شراب (شفق) برسا رہی تھی۔

اس شعر میں ''شفق'' مستعارلہ، ''مے'' مستعارمنہ اور ''سرخی'' وجہ جامع ہے۔

تشبیہ کی صورت میں ہم شفق کا بھی نام لیں گے اور اس چیز کا بھی جس کے مشابہ اسے ٹھہرایا جا رہا ہے، مثلاً: اقبال کا یہ شعر ے

وادیِ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

آفتاب پہاڑوں کے پیچھے ڈوب چکا ہے، افق پر چھائے ہوئے بادل (سحاب) شفق کی سرخی میں نہا گئے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آفتاب اپنے پیچھے بدخشانی لعل (بدخشاں کے قیمتی سرخ پتھر) کے ڈھیر چھوڑ گیا ہے۔ اس شعر میں مشبّہ یعنی شفق اور مشبّہ بہ یعنی لعلِ بدخشاں دونوں مذکور ہیں لہٰذا یہ تشبیہ ہے، استعارہ نہیں۔

تلمیحات

تعریف:

کسی تاریخی، سیاسی، مذہبی یا افسانوی واقعے کی طرف چند ایک الفاظ میں اشارہ کرنا ''تلمیح'' کہلاتا ہے، جیسے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

''آتشِ نمرود'' تلمیح ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس تلمیح سے پورا واقعہ ذہن میں تازہ ہوجاتا ہے۔

آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

''چاہِ یوسف'' تلمیح ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

الغرض کلام میں کسی اہم واقعہ، کسی فنی اور علمی اصطلاح، قرآن کی کسی آیت اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث کی طرف اشارہ کرنا ''تلمیح'' کہلاتا ہے۔

ایک ادیب کے الفاظ ہیں:

"تلمیحات کیا ہیں؟ ہماری قوم کے قدموں کے نشان ہیں جن پر پیچھے ہٹ کر ہم اپنے باپ دادا کے خیالات، مزعومات، اوہام، رسم ورواج اور واقعات وحالات کا سراغ لگا سکتے ہیں۔"

چند مشہور تلمیحات

۱۔ طوفانِ نوح:

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کی اصلاح کی بہت کوشش کی، مگر وہ راہِ راست پر نہ آئی۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے اس کے لیے بددعا کی۔ چنانچہ ایک طوفان آیا جو اس قوم کو بہا کر لے گیا۔ جبکہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والے معدودے چند مسلمان ایک کشتی میں سوار تھے جو محفوظ رہی۔ اس تلمیح میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے دراز عمر پائی تھی۔ ''عمرِ نوح'' کی تلمیح اس طرف اشارہ کرتی ہے۔

۲- کوہِ طور (طورسینا):

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیدار خداوندی کا سینا پہاڑ سے تعلق ہے، وہیں اللہ نے اپنی تجلی دکھائی تھی۔ یہ تلمیح اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

۳- گنجِ قاروں:

قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا ایک فرد تھا۔ اس کے پاس بہت دولت تھی۔ وہ خدا کا منکر اور ظالم تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ کے باوجود وہ ان برائیوں سے باز نہ آیا۔ خداوند جبّار نے اس کو یہ سزا دی کہ اسے خزانے سمیت زمین میں غرق کر دیا۔ ''گنجِ قاروں'' کی تلمیح میں اسی طرف اشارہ ہے۔

٤- جامِ جمشید/ساغرِ جم:

جمشید کا وہ پیالہ جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ اس میں وہ کوائف عالم کا مشاہدہ کرتا تھا۔ اس کو تخفیف کر کے "جامِ جم" کہتے ہیں۔ آج کل انٹرنیٹ کے لیے یہ تلمیح استعمال ہو سکتی ہے۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

☆......☆......☆

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں
غلامِ طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

۵- لحنِ داؤدی:

حضرت داؤد علیہ السلام پر زبور نازل ہوئی تھی۔ ان کی آواز بڑی دلکش اور پرتاثیر تھی۔ وہ جب اپنی دلکش لے میں زبور پڑھتے تھے تو لوگ بے خود ہو جاتے تھے۔

٦- بیتُ العتیق:

مراد وہ قدیم، پہلا اور پرانا گھر، یعنی خانہ کعبہ۔ اسے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔

٧- حسنِ یوسف:

حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن ضرب المثل تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا بے مثال حسن عطا فرمایا تھا کہ مصر کی عورتوں نے بے خود ہو کر اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے۔

٨- چاہِ یوسف:

وہ کنواں جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے ڈال دیا تھا۔

آرہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

٩- آتشِ نمرود:

نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ کے الاؤ میں ڈالا، آگ خدا کے حکم سے گلزار بن گئی۔

١٠- دَرَفشِ کاویانی:

ضحاک بادشاہ بڑا ظالم تھا۔ اس نے کاوہ نامی ایک موچی کے بیٹوں کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا تھا۔ کاوہ نے اپنی دھونکنی کے چمڑے سے ایک جھنڈا بنایا۔ جو ''دَرَفشِ کاویانی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پھر ضحاک کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ '' دَرَفشِ'' ایک اوزار کو کہتے ہیں جس سے موچی چمڑہ سیتے ہیں۔

١١- باغِ ارم:

شداد نے بہشت کے نمونے پر یہ باغ بنوایا تھا، مگر اس کی بہاروں سے لذت یاب نہ ہو سکا

تھا کہ پیغام اجل آ پہنچا۔

۱۲- صبرِ ایوب:

حضرت ایوب علیہ السلام بڑے صبر والے پیغمبر تھے۔ وہ سخت آزمائش میں ڈالے گئے مگر حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے۔ اللہ کی رضا پر صابر شاکر رہے۔

۱۳- دمِ عیسیٰ:

دم پھونک کو کہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کئی عجیب عجیب معجزے عطا فرمائے تھے۔ آپ اپنی پھونک سے دم کر کے مردوں کو زندہ اور بیماروں کو تندرست کر دیا کرتے تھے۔ ''دمِ عیسیٰ'' میں اسی طرف اشارہ ہے۔

۱٤- یدِ بیضا:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک معجزہ ہے۔ وہ جب اپنے ہاتھ کو آستین سے باہر نکالتے تھے تو وہ سورج کی طرح چمکتا تھا۔

حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں، ہمہ دارند تو تنہا داری

۱۵- عصائے موسیٰ:

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنا عصا زمین پر پھینکتے تھے وہ اژدھا بن جاتا تھا۔

۱٦- سحرِ سامری:

سامری ایک جادوگر تھا۔ اس نے ایک بچھڑا سونے سے بنایا جو بیل کی طرح آواز دیتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے اس کی پوجا شروع کر دی تھی۔ بعد میں یہ شخص عذاب الٰہی میں مبتلا ہوا اور مر گیا۔

۱۷- مانی و بہزاد:

مانی ایک رومی مصور تھا جس نے نبوت کا دعویٰ بھی کیا تھا۔ وہ مصوری کو اپنا اعجاز اور 'ارژنگ' نامی

کتاب کو الہامی کتاب قرار دیتا تھا۔ ایران میں بھی اس نام کا ایک شاعر اور مصور گزرا ہے۔ بہزاد ایک نقاش تھا جس کا تعلق شاہ اسماعیل صفوی کے زمانے سے تھا۔

۱۸- بُزِ اخفش:

اخفش نحو کے بہت بڑے عالم تھے۔ انہوں نے تدریس کی مشق کے لیے ایک بکری پال رکھی تھی۔ جو کچھ یاد کرتے تھے اسے سناتے۔ وہ سر ہلا دیتی تو سمجھتے کہ وہ چیز اسے یاد ہوگئی ہے۔ یہ تلمیح بغیر جانے بوجھے سر ہلا دینے کے لیے آتی ہے۔

۱۹- خاتمِ سلیمان:

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وہ انگوٹھی جس پر اسم اعظم لکھا ہوا تھا۔ جن و پری آپ کا حکم مانتے تھے۔

۲۰- جوئے شیر:

فرہاد ایک سنگ تراش تھا جو شیریں پر عاشق ہوگیا تھا۔ فرہاد کو کہا گیا کہ وہ پہاڑ کاٹ کر دودھ لانے کے لیے ایک نہر کھودے۔ اس نے شیریں کے لیے یہ کٹھن کام شروع کر دیا۔ نہر کھودی گئی تو اسے کسی نے غلط بتا دیا کہ شیریں مرگئی۔ چنانچہ اس نے اپنے ہی تیشے سے اپنا سر پھوڑ لیا اور جان دے دی۔ " جُو " کے معنی ہیں ندی اور شیر فارسی میں دودھ کو کہتے ہیں۔ ان دونوں الفاظ میں واو اور یا معروف ہیں۔ ان سے پہلے جو پیش اور زیر ہے ان کو زور دے کر پڑھا جائے گا۔

۲۱- پیراہنِ یوسف:

حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے کنویں میں گرا دیا۔ صرف آپ کا کرتہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس لائے۔ آپ اس کرتے کو آنکھوں سے لگا کر روتے تھے۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے بادشاہ بن گئے تو انہوں نے اپنا کرتہ جناب یعقوب علیہ السلام کو بھیجا، جسے ان کے چہرے پر ڈالا گیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بینائی لوٹا دی۔

۲۲- آبِ حیواں:

وہ چشمہ جس کا پانی اگر کوئی پی لے تو حیاتِ ابدی پا لے۔

۲۳- معراجِ مصطفیٰ:

یہ تلمیح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعۂ معراج کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

۲۴- تختِ طاؤس:

طاؤس مور کو کہتے ہیں۔ شاہجہان کا وہ خوبصورت تخت جس پر چھ کروڑ روپے کی مسرفانہ لاگت آئی تھی اور وہ مور کی شکل کا تھا۔

۲۵- قصرِ دارا:

ایران کے بادشاہ دارا کا عالی شان محل جسے دیکھ کر عقل حیران اور انسان مرعوب ہو جاتا تھا۔

ذُو معنی الفاظ

''ذو معنی ایسے لفظ کو کہتے ہیں جس کے دو معنی ہوں۔ ایک واضح اور دوسرا مخفی۔ لکھنے یا بولنے والا اس کا وہ مخفی معنی مراد لے رہا ہو جس میں طنز یا پھبتی ہے، لیکن وہ اسے اس طرح ملفوف کر کے ادا کرتا ہے کہ چٹکی لینے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ ذیل میں چند ایسے الفاظ ملاحظہ فرمائیے جن کو بولنے والا ان پر کھیلتا ہے یعنی کچھ بول کر کچھ مراد لیتا ہے اور اس لطافت کو صرف وہی سمجھتا ہے جو لفظ کے تہہ در تہہ پیچوں سے واقف ہو۔

لفظ	واضح معنی کے علاوہ معنی
لوٹا	ایک ایسا شخص جو لوٹے کی طرح کبھی کسی کے ساتھ ہوتا ہے اور کبھی کسی اور کے ساتھ۔
لٹو	استعمال: کسی پہ لٹو ہو جانا...... مطلب: کسی پہ فریفتہ ہونا۔
چکنا گھڑا	ایک ایسا شخص جس پہ کسی بات کا کوئی اثر نہ ہو، ایک ڈھیٹ شخص۔
مٹکا	پیٹ، توند
چمچہ	کسی اہم شخص کے ساتھ چلنے یا اس کی ہاں میں ہاں ملانے والا شخص۔
گائے	استعمال: اللہ میاں کی گائے...... مطلب: سیدھا سادہ شخص۔
کھمباووٹ	کسی جماعت سے وابستگی کے پیشِ نظر بغیر سوچے سمجھے ووٹ دینے والا شخص۔

یہ تو ذو معنی کی ایک قسم ہوئی۔ جو مشہور ہو جاتی ہے اور عام لوگ بھی انہیں اپنی روزمرہ کی بولی میں استعمال کرتے ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں کسی لفظ میں ذرا سی تبدیلی کر کے اس سے ملتے جلتے لفظ میں تبدیل کر دیا جائے۔ جیسے افراتفری کو ''افرا تفریح''، قلابازی کو ''کلاہ بازی''، ناخواندگی کو ''ناخاوندگی''، بیگم صاحبہ کو ''بے غم صاحبہ'' اور سوانحِ عمری کو ''سانحۂ عمری'' لکھنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ قسم عام لوگوں کے بس کی نہیں۔ یہ لفظوں سے کھلواڑ میں اچھی خاصی مہارت کا تقاضا کرتی

ہے۔بعض لکھاری اس ''صنعت'' میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ وہ بڑی چابکدستی سے دلبرداشتہ کو ''دل برداشتہ''، قندِمکرر کو ''حندِ مکرر'' اور رہزن کو ''راہِ زن'' جیسی ترکیبوں میں ہی نہیں بدلتے، بلکہ کمرشل تھیٹر کو ''کمر۔شل تھیٹر''، سگریٹ نوشی کو ''سگریٹNO شی'' اور ''او آئی سی'' کو ''اوہ! آئی سی'' لکھنے جیسی ''تحریفی سازشوں'' کا ارتکاب بھی کر جاتے ہیں۔

''ذو معنی'' کی تکنیک دراصل لفظوں سے کھیلنے کا نام ہے۔ اس کا زیادہ تر استعمال طنزیہ ومزاحیہ تحریروں میں کیا جاتا ہے۔ یہ تکنیک جتنی پُر لطف ہے، اتنی ہی مہارت کا تقاضا کرتی ہے۔ الفاظ کے پیچ در پیچ اور تہہ در تہہ پہلوؤں سے واقفیت کے بغیر اس ''صُنعت'' کو نہیں برتا جاسکتا۔ بعض لکھنے والے اسے ایسی خوبی اور عمدگی سے استعمال کرتے ہیں کہ تحریر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے اور پڑھنے والا بے ساختہ پھڑک جاتا ہے۔ ذیل کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔ ان میں ''واوین'' میں دیے گئے الفاظ پر لکھاری نے کھیلا ہے اور انہیں ذومعنی استعمال کیا ہے۔

''میں آج کل اس شاعر کو ڈھونڈ رہا ہوں جس کے ذہن کے ''پاتال'' کا اندازہ لگانے کے لئے اس کے دماغ کی ''کھدائی'' کرنا پڑے گی تاکہ پتہ تو چلے کہ وہ ایسی باتیں سوچتا کیسے ہے؟ میں اس کو ڈھونڈ رہا ہوں حالانکہ یہ کام پولیس کا ہے جو اس کو تلاش کرے اور تھانے کے ''ڈرائنگ روم'' میں زمین پر بٹھا کر (یا لٹا کر) اپنے روایتی طریقے سے اسے بھرپور ''خراج تحسین'' پیش کرے۔ دوسری طرف ہماری دہری اخلاقیات کا یہ عالم ہے کہ اپنے کالم میں، میں ان بدبودار گانوں کا ذکر تو کرسکتا ہوں، ان کے کچھ نمونے پیش نہیں کرسکتا۔ پرائیویٹ تھیٹروں میں چندسو روپے کا ٹکٹ خرید کر آپ نہ صرف ان گانوں کے بول سن سکتے ہیں، بلکہ یہ بول یا ''بول و براز'' عملی صورت میں دیکھ بھی سکتے ہیں۔ اس ضمن میں پنجاب حکومت کا جو فرض ہے وہ یقیناً اس سے باخبر ہے، لیکن اس نے ابھی تک ان لوگوں خاطر خواہ ''مزاج پُرسی'' کے لئے کوئی ٹھوس اقدام نہیں کیا جو اقدار کی پامالی کے علاوہ کھلم کھلا ملکی قوانین کا بھی عملی طور پر مذاق اڑا رہے ہیں۔ میں وزیراعلیٰ پنجاب سے گزارش کروں گا کہ وہ ایک نظر اس ''منظرنامے'' پر بھی ڈالیں اور اس ''قلعے کا قمع'' کرنے کے لئے ٹھوس قدم اٹھائیں، کیونکہ اس ضمن میں ابھی تک ان کی طرف سے صرف گونگلوؤں (شلجم) سے مٹی ہی جھاڑی گئی ہے۔''

(غلاظت سے بھرپور ڈرامے اور حکومت پنجاب، عطاء الحق قاسمی: روزنامہ جنگ کراچی، ہفتہ 12 فروری 201ء)

''جب ہم مصر پہنچے تو دیکھا کہ قاہرہ، سکندریہ اور اسماعیلیہ میں جا بجا مصر کے صدر حسنی مبارک کی تصویروں کے پوسٹر لگے ہوئے ہیں۔ ہمیں حیرت ہوئی۔ حسنی مبارک صاحب 27 سال سے مسند حکومت پر براجمان ہیں اور آج بھی اتنے مقبول ہیں کہ لوگ ان کی مبارک اور حسین صورت سے اکتاتے نہیں، مگر بعد میں اندازہ ہوا کہ موصوف نہ ''حسین'' ہیں نہ ''بابرکت''، عوام ان سے سخت متنفر ہیں۔ جبر و تشدد کا یہ عالم تھا کہ فلسطین کے حق میں دو جملے کہہ دینے والے کے لیے نہ کوئی قاعدہ قانون تھا اور نہ اصول وضابطہ۔ بس ایسا شخص غائب ہو جاتا اور پیچھے والے بغیر روئے دھوئے یوں صبر کر لیتے جیسے جنات کسی کو اٹھا کر ''لاہوت، لامکان'' میں لے جائیں تو بے بسی کے علاوہ کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر کب تک؟ آخر لاوا پھوٹ پڑا ہے۔ حسنی مبارک صاحب کا حسن گہنا گیا ہے اور برکت نحوست میں بدلتی جا رہی ہے۔''

(نامبارک رخصتی، مفتی ابولبابہ شاہ منصور: ضرب مؤمن، 10 فروری 2011ء)

مشق

۱-تشبیہ اور استعارہ کی صرف تعریف ذکر کریں، نیز ہر ایک کی مثال ضرور دیں۔

۲- ''تشبیہات'' کے عنوان تلے دی گئی تشبیہات میں صرف منتخب ۱۰ تشبیہات کو جملوں میں استعمال کریں۔

۳-تشبیہ اور استعارے میں تین فرق تحریر کریں۔

٤-تلمیح کی تعریف لکھیں، نیز دی گئی تلمیحات کو زبانی یاد کریں۔

۵-ذو معنی الفاظ کی تعریف لکھ کر دیے گئے پیراگراف میں سے ذو معنی الفاظ الگ کریں۔

محاورات

محاورہ لغت میں "بول چال اور بات چیت" کو کہا جاتا ہے، لیکن اصطلاح میں محاورہ اس خاص بول چال کا نام ہے جس میں الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال نہ ہوتے ہوں۔ مثال کے طور پر "روٹی کھائی" اور "قسم کھائی" کو لیجیے۔ پہلے جملے میں "کھانا" حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے، لیکن دوسرے جملے میں ایسا نہیں، پس دوسرا جملہ "محاورہ" ہے۔

محاورے کے بارے میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنی چاہیے کہ اس کے الفاظ میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جاتی ورنہ محاورہ غلط قرار پائے گا۔ البتہ اس کے صیغوں میں تبدیلی ہوسکتی ہے۔ مثلاً: ایک محاورہ ہے: "آب ودانہ اٹھنا" اس کو آپ متکلم، مخاطب، غائب، فعل ماضی، حال، مستقبل ہر صیغے میں ڈھال کر بول سکتے ہیں۔ البتہ الفاظ میں تبدیلی نہیں کر سکتے کہ آب ودانہ کی جگہ "آب وچارہ" یا "آب ونوالہ" کہیں۔ اس کے برخلاف ضرب المثل میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوسکتی، نہ الفاظ میں نہ صیغوں میں۔ اسے جوں کا توں استعمال کرنا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ محاورات کی فہرست پر نظر ڈالیے، ان میں سے ہر ایک کے آخر میں مصدر ہوتا ہے۔ اس مصدر سے مختلف صیغے بنائے جاسکتے ہیں جبکہ ضرب المثل تو ایک "بول" یا "کہاوت" ہے جو کسی وقت کسی ذہین آدمی نے برموقع کہہ دیا اور ایسا بامعنی اور مناسب حال ہوا کہ زبانوں پر چڑھ گیا۔ اب اس جیسے موقع پر جب بھی آئے گا تو اس "بول" کو دہرا کر معانی کا جہان ایک جملے میں سمیٹ لیا جائے گا۔ اس میں صیغہ وغیرہ کی تبدیلی کی ضرورت ہے نہ اجازت۔ اس میں مصدر ہوتا بھی نہیں۔ اس کا حسن ل الفاظ باقی رکھنے میں ہے۔

اردو کے کثیر الاستعمال محاورات کا مطلب اور ان کا استعمال درج ذیل ہے۔ آپ یہ محاوارت اور ان کے معنی یاد کر لیجیے اور اپنی تحریر میں جب موقع ملے استعمال کیجیے۔

محاورات اوران کا استعمال

محاورات	معانی	استعمال
آبرو پر حرف آنا	ذلیل ہونا	کیا مجال جو آپ کی آبرو پر حرف آئے، میں ہر طرح سے آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔
آبرو پر بٹہ لگنا آبرو پر پانی پھیر دینا	عزت گنوانا، آبرو خاک میں ملانا	صاحبزادے نے چوری کر کے اپنے باپ دادا کی آبرو کو بٹہ لگا دیا یا آبرو پر پانی پھیر دیا۔
آب ودانہ اٹھنا	نقل مکانی کرنا، مرجانا	راشد کا عین جوانی میں انتقال ہوگیا۔ ہاں صاحب! اس جہان سے آب ودانہ جو اٹھ گیا تھا۔
اپنا سامنہ لے کر رہ جانا	شرمندہ ہونا، بات کا جواب نہ دے سکنا	اکرم نے افضل کو ایسی کھری کھری سنائیں کہ وہ کوئی جواب نہ دے سکا اور اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔
اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنا	اپنا نقصان خود ہی کرنا	سکھوں نے فساد برپا کر کے اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماری۔ پاکستان سے تو گئے ہی تھے، ہندوستان میں بھی ان کا زندہ رہنا دوبھر ہوگیا ہے۔
اپنے منہ میاں مٹھو بننا	اپنی تعریف خود کرنا	بھائی صاحب! اپنے منہ میاں مٹھو بننے سے کچھ فائدہ نہیں، بات تو جب ہے کہ دوسرے تعریف کریں۔

مشق

(۱) یہ تمام محاورات اوران کا مطلب ومحل استعمال اچھی طرح سمجھ کر یاد کر لیجیے اوران میں سے ہرایک کوکم ازکم دو جملوں میں استعمال کیجیے۔

(۲) کسی مستند صاحب قلم کی تحریر کا مطالعہ کیجیے اور اس میں سے محاورے نکال کر اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

(۳) دیے گئے محاوروں میں جو آپ کو زیادہ پسند ہیں انہیں اپنی بیاض میں نقل کیجیے اور تحریر میں حسبِ موقع استعمال کیجیے۔

(٤) معروف مصنف اشتیاق احمد کی تحریروں میں محاوروں کی بہت مزے دار چٹنی پائی جاتی ہے۔ آپ ان میں سے دلچسپ محاورے ڈھونڈ کر اپنی بیاض میں درج کریں اور حسبِ موقع انہیں اپنی تحریر میں استعمال کریں۔

ضرب الامثال

جب کوئی واقعہ بار بار تجربے اور مشاہدے میں آئے تو ان تجربات اور مشاہدات کا نچوڑ پیش کرنے اور ان پر بامعنی تبصرہ کرنے کے لیے چند الفاظ یا جملے استعمال کیے جاتے ہیں۔ جب یہ الفاظ یا جملے عرصہ دراز تک کسی خاص موقع پر استعمال کیے جاتے رہیں اور اپنے لفظی معنوں سے گزر کر کچھ اور معنی دیں تو ان کو ''ضرب المثل'' (کہاوت) کہتے ہیں۔ ''ضرب المثل'' عموماً اپنی بات کو وزنی اور مؤثر بنانے کے لیے دورانِ گفتگو استعمال کی جاتی ہے۔

ضرب المثل اور کہاوتیں چونکہ عوامی سطح پر وجود میں آتی ہیں اس لیے ان میں صدیوں کی عقل ودانش اور انسانی تجربات ومشاہدات کی جھلک واضح نظر آتی ہے۔ بعض ضرب الامثال کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی کہانی ہوتی ہے جسے لوگ بھول جاتے ہیں۔ بہت سی ضرب الامثال قدیم ''دوہوں'' کے مصرعے ہیں جو کثرت استعمال سے ضرب الامثال کا درجہ پا گئے ہیں، مثلاً:

مونہہ لگائی ڈومنی، گاوے تال بے تال
گھی سنوارے سالنا، بڑی بہو کا نام

شیخ سعدی کی کتاب کے بہت سے جملے اور مصرعے ضرب الامثال بن گئے ہیں۔ اکثر قدیم ضرب الامثال کے واضعین کے نام معلوم نہیں لیکن اردو شاعری کے بہت سے مصرعے ایسے ہیں جو قبول عام کی آخری حد تک پہنچ کر ضرب الامثال بن گئے ہیں۔ خواص وعوام انہیں بے تکلف اپنی تقریر وتحریر میں استعمال کرتے ہیں اور اکثر نہیں جانتے کہ فلاں ضرب المثل دراصل فلاں شاعر کا مصرع ہے، جیسے:

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں (میر حسن)
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے (آتش)

ہائے! اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا (غالب)

محاورے اور ضرب المثل (کہاوت) میں فرق:

۱- محاورے اور ضرب المثل میں پہلا فرق یہ ہے کہ محاورہ کلام کا جز بن کر اس میں جذب ہو جاتا ہے اور اس کے بغیر کلام ناقص اور نامکمل رہتا ہے، جبکہ ضرب المثل میں یہ بات نہیں ہوتی۔ اسے اگر حذف بھی کر دیا جائے تب بھی کلام تام رہتا ہے۔ مثال:

محاورہ: جنگ کے باعث اس کی تجویز کھٹائی میں پڑ گئی۔ اگر کھٹائی میں پڑنے کو حذف کر دیں تو جملہ نامکمل رہے گا۔

ضرب المثل: کاروبار میں تو جو کچھ تھا ڈوبا ہی، آپ نے بھی تقاضا شروع کر دیا۔ سچ کہتے ہیں: ''مرتے کو ماریں شاہ مدار۔'' اگر ضرب المثل کو ہٹا بھی دیں تو پہلا جملہ مکمل اور تام رہے گا۔

۲- دوسرا فرق یہ ہے کہ الفاظ تو دونوں میں نہیں بدلتے البتہ محاورے میں صیغہ بدل سکتا ہے اور ضرب المثل میں صیغہ بھی نہیں بدلے گا۔ اس فرق کو محاورات کے بیان میں تفصیل سے سمجھایا جا چکا ہے۔

محاورہ: بغلیں بجانا: جب سے احمد نے کامیابی کی خبر سنی ہے، مارے خوشی کے بغلیں بجا رہا ہے۔ فاعل جمع ہو تو ''بجا رہے ہیں'' ہوگا اور مؤنث کی صورت میں ''بجا رہی ہے'' اور فعلِ نہی ہو تو یوں بھی کہا جا سکتا ہے: بغلیں مت بجاؤ۔

ضرب المثل: اب پچھتاوے کیا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت؟ یہاں ''چڑیا چگ گئی کھیت'' نہیں کہہ سکتے۔

۳- محاورات کے آخر میں کوئی نہ کوئی مصدر ہوتا ہے اس لیے اس سے مختلف افعال کے مختلف صیغے بنائے جا سکتے ہیں جبکہ ضرب المثل میں مصدر نہیں ہوتا، لہٰذا اس میں موجود ''اسم جامد'' کو اپنی حالت پر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

ذیل میں چند مشہورِ زمانہ ضرب الامثال دی جاتی ہیں۔ ان کا مطلب یاد کیجیے۔ ان کا درست اور برمحل استعمال تقریر و تحریر میں چار چاند لگا دیتا ہے۔

چند مشہور ضرب الامثال

ضرب الامثال	تشریح
آم کے آم گٹھلیوں کے دام	ایک کام سے دہرا فائدہ
آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل	جو چیز نظر کے سامنے نہ ہو گویا وہ پہاڑ کی اوٹ میں ہوتی ہے۔
اب پچھتائے کیا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت	موقع گزر جانے کے بعد افسوس کرنا بے فائدہ ہے۔
آپ کاج مہا کاج	جو کام خود کیا جائے وہی بہتر ہے۔
آدھی چھوڑ ساری کو جائے، آدھی رہے نہ ساری پائے	حریص ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے۔ بکرے کی لالچ میں بوٹی سے بھی جاتا ہے۔
آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا	ایک مصیبت سے نکل کر دوسری میں پھنس جانا
آج مرے کل دوسرا دن	زندگی ناپائیدار ہے۔
آنکھ کا اندھا گانٹھ کا پورا	وہ مالدار جو بے وقوف ہو۔ بے وقوف گاہک جسے مال خریدنے کی تمیز نہ ہو۔
آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے	سب نالائق ہیں، سب کا بگڑا ہونا۔
آنکھوں سکھ کلیجے ٹھنڈک	ہر طرح کی خوشی حاصل ہونا
اشرفیاں لٹیں اور کوئلوں پر مہر	ضروری کاموں میں کنجوسی اختیار کرنا اور فضول کاموں پر بے دریغ خرچ کرنا۔

مشق

۱- محاورات اورضرب الامثال میں فرق بیان کیجیے اوراسے مثال سے سمجھائیے۔

۲- اوپر دی گئی ضرب الامثال کو تشریح کے ساتھ یاد کیجیے اور ہر ایک کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

۳- ذیل میں دی گئی تحریر سے محاورات اورضرب الامثال چھانٹ کر الگ کیجیے اوران کا معنی اور محل استعمال بیان کیجیے:

(الف) ''خالد کافی دنوں سے غائب تھا۔لگتا تھا عید کا چاند ہوگیا ہے۔اس کی غیر حاضری سب کو کھٹکتی تھی۔ایک دن ہم نے اسے سرِ راہ دھرلیا۔ ہاں بھئی! آج کل کہاں کی خاک چھان رہے ہو؟ لگتا ہے بہت اونچی اُڑانیں بھری جارہی ہیں۔دیکھو! اپنے اپنے ہوتے ہیں۔ان سے الگ رہ کے نہیں جیا جاسکتا۔''

(ب) ''بس صاحب! کیا بتاؤں، آج کل بری کڑکی ہورہی تھی۔ میں نے سوچا: بیکار سے بیگار بھلی۔کب تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے پڑے رہیں گے۔حرکت میں برکت ہے۔ناؤ خشکی میں نہیں چلتی۔فضول بیٹھ کر مکھیاں مارنے کے بجائے ہاتھ پیر ہلانے چاہییں۔ وہ دن تو گئے جب خلیل خان فاختہ اُڑایا کرتے تھے۔آج کل تو مہنگائی آسمان سے باتیں کررہی ہے۔ پہلے ممو بھائی کے ساتھ شراکت کی سوجھی۔ بعد میں خیال آیا: ساجھے کی ہنڈیا بیچ چوراہے میں پھوٹتی ہے۔ایسا نہ ہو کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔آج کل آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں، پر جب واسطہ پڑتا ہے تو طبیعت صاف ہوجاتی ہے۔نکڑ والے خان صاحب کی تو کل پونجی جاتی رہی تھی۔دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔کچھ یار دوستوں نے سمجھایا بھی کہ پانچوں اُنگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں، مگر میرے پاس اول تو تھا ہی کتنا، گنجی کھائے گی کیا، نچوڑے گی کیا؟ اس لیے سوچا ایسا کام کرنا چاہیے کہ ایک پنتھ دو کاج ہوں۔آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ اس لیے آج کل ذرا مصروف رہتا ہوں، ورنہ آپ صاحبان کی محفل کہاں چھوڑ سکتا ہوں۔''

٤-اب آپ کسی نامور ادیب کی تحریر سے محاورات اور ضرب الامثال چھانٹ کر الگ کیجیے۔ ان کا معنی اور محل استعمال سمجھیے اور ان کی مدد سے بامعنی جملے بنا کر اپنے اساتذہ یا کسی صاحبِ ذوق شخصیت کو دکھائیے اور ان سے اصلاح لیجیے۔

٥- جو محاورات اور ضرب الامثال آپ کو پسند ہیں ان کو اپنی ذاتی یادداشت والی جیبی ڈائری میں درج کیجیے۔

تیسرا باب

چار اہم اصنافِ تحریر

(کہانی نویسی، مضمون نویسی، کالم نگاری، حاشیہ و مقالہ نگاری)

- ......کہانی نویسی
- ......مضمون نویسی
- ......مضمون نویسی کے تین مراحل
- ......کالم نگاری
- ......کالم نویسی کے مراحل
- ......کالم کا ابتدائیہ
- ......کالم کا اختتامیہ
- ......اچھے کالم کی خوبیاں
- ......کالم لکھنے کے بعد
- ......کالم شائع ہونے کے بعد
- ......حاشیہ نگاری
- ......مقالہ نگاری
- آخری بات

کہانی نویسی

پہلا حصہ

بطورِ نمونہ چند اخلاقی کہانیاں

ذیل میں پانچ کہانیاں دی جارہی ہیں۔آپ دیکھیں گے کہ ہر کہانی میں تین پیرے ہیں۔ پہلا اور آخری پیرا دو یا تین اشاروں پر اور بیچ کا مرکزی پیرا تین سے چار اشاروں پر مشتمل ہے۔ اگر پیراگرافوں کو سمیٹیں تو اشاروں میں تبدیل ہو جائیں گے اور اگر اشاروں کو پھیلائیں تو پیرے وجود میں آجائیں گے۔نمونے اور مثال کے لیے دوسرا حصہ دیکھ لیں۔اس کے بعد کہانی کے ہر پیرے کو اشاروں میں تبدیل کریں اور پھر ان اشاروں کی مدد سے دوبارہ کہانی کی عمارت کھڑی کریں۔بغیر قلم ہلائے آپ کو زبانی زبانی ہی کہانی لکھنے کی مشق ہو جائے گی۔

(۱) لالچ بری بلا ہے

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔تین دوست کہیں سفر پر جارہے تھے۔چلتے چلتے وہ ایک شہر کے قریب پہنچے۔دن بھر کے سفر سے کافی تھک چکے تھے۔ایک درخت کے نیچے ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے پاس ہی ایک پوٹلی سی پڑی ہے۔اٹھا کر دیکھا تو روپوں کی تھیلی تھی۔ مارے خوشی کے اچھل پڑے کہ بغیر کسی محنت اور کوشش کے اتنی بڑی رقم ہاتھ لگ گئی۔

اس اثنا میں انہیں کافی بھوک بھی محسوس ہونے لگی تھی۔انہوں نے طے کیا کہ پہلے کھانے کا بندوبست کریں۔بعد میں اس رقم کو آپس میں برابر تقسیم کرلیں گے۔شہر قریب ہی تھا۔انہوں نے

اپنے میں سے ایک ساتھی کو کچھ روپے دے کر شہر بھیجا کہ پر تکلف قسم کا کھانا لے آئے۔ جب وہ کھانا لانے کے لیے چلا گیا تو باقی دو دوستوں نے آپس میں سوچا کہ اگر ہم نے اس رقم کو تین حصوں میں تقسیم کیا تو تھوڑی تھوڑی رقم ہی ہمارے ہاتھ لگے گی۔ کیوں نہ ہم تیسرے کا قصہ پاک کر دیں اور اس رقم کو دو برابر حصوں میں بانٹ لیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جونہی تیسرا ساتھی شہر سے واپس آئے اسے مار ڈالیں۔ خدا کی قدرت کہ اُدھر بالکل اسی قسم کا خیال تیسرے دوست کے دل میں بھی پیدا ہوا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ تیسرے حصے کی رقم سے میرا کیا بنے گا؟ بہتر یہی ہے کہ باقی دونوں کو درمیان سے ہٹا دوں اور پوری کی پوری رقم پر قبضہ کر لوں۔ اس خیال کے پیش نظر اس نے کھانے میں زہر ملا دیا تا کہ وہ اسے کھا کر ہلاک ہو جائیں اور وہ اکیلا ہی اتنی بڑی رقم کا مالک بن جائے۔

دونوں ساتھی اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ جب وہ کھانا لے کر آیا تو دونوں ایک دم اس پر جھپٹ پڑے اور اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا۔ پھر خود بڑے اطمینان کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ کھانا کھا چکے تو تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ زہر نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ کوئی گھنٹہ بھر میں دونوں زمین پر ڈھیر تھے۔ یوں لالچ نے تینوں کی جان لے لی اور روپوں کی تھیلی وہیں دھری کی دھری رہ گئی۔

''سچ ہے لالچ بری بلا ہے۔''

(۲) جھوٹ کا برا انجام

کسی گاؤں میں ایک گڈریا رہتا تھا۔ وہ ہر روز صبح سویرے اپنی بکریاں لے کر جنگل کی طرف چل دیتا۔ انہیں دن بھر وہاں چراتا اور شام کو واپس لے آتا۔ ایک دن اس گڈریے کو ایک عجیب مذاق سوجھا۔ اُس نے گاؤں کی طرف منہ کر کے زور زور سے چلانا شروع کر دیا: ''لوگو! شیر آ گیا، شیر آ گیا، دوڑو، دوڑو، مجھے بچاؤ، میری جان خطرے میں ہے......''

گاؤں کے لوگوں نے جب اس کی چیخ پکار سنی تو لاٹھیاں ہاتھوں میں لیے گھروں سے نکل آئے اور جنگل کی طرف دوڑے جب وہ گڈریے کے پاس پہنچے تو وہاں انہیں کوئی شیر نظر نہ آیا۔ گڈریا

انہیں دیکھ کر ہنس پڑا اور کہنے لگا: ''میں نے تو آپ لوگوں کے ساتھ دل لگی کی تھی، یہاں کوئی شیر نہیں آیا۔'' یہ سن کر وہ سب لوگ بہت ناراض ہوئے اور پیچ وتاب کھاتے ہوئے واپس آ گئے۔

اب قدرت کا کرنا دیکھیے اس بات کو چند ہی روز گزرے تھے۔ گڈریا حسب معمول اپنی بکریاں لے کر جنگل میں گیا ہوا تھا کہ سچ مچ ایک شیر اُدھر آ نکلا۔ وہ آتے ہی ریوڑ میں گھس گیا اور بکریوں کو چیرنے پھاڑنے لگا۔ گڈریا دوڑ کر ایک درخت پر چڑھ گیا اور شور مچانے لگا: ''لوگو! مجھے بچاؤ، شیر آ گیا ہے، خدا کی قسم شیر آ گیا ہے، میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں......'' وہ کچھ دیر تک چیختا چلاتا رہا مگر اس دفعہ کوئی شخص اس کی مدد کو نہ آیا، شیر نے بہت سی بکریوں کو ہلاک کیا اور چلتا بنا۔

شیر کے چلے جانے کے بعد گڈریا درخت سے نیچے اترا اور اپنے بچے کھچے ریوڑ کو ہانک کر گاؤں لے آیا۔ وہ بہت سہما ہوا اور پریشان حال تھا۔ اس نے گاؤں والوں کو سارا واقعہ سنایا۔ انہوں نے الٹا اسے ملامت کی اور کہا کہ تم نے اس روز جھوٹ بول کر خود ہی اپنا اعتماد گنوا دیا تھا۔ اب ہم کس طرح تمہاری بات کا یقین کر سکتے تھے؟

سچ ہے جو شخص جھوٹ بولتا ہے، لوگ اُس کے سچ کا بھی اعتبار نہیں کرتے۔

(۳) جیسے کو تیسا

پرانے زمانے کا ذکر ہے کسی شہر میں ایک سوداگر رہتا تھا۔ ایک بار اُسے تجارت کی غرض سے کسی دوسرے ملک میں جانا پڑ گیا۔ اس کے پاس پانچ سیر سونا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اسے وہ کہاں محفوظ کرے؟ اتفاق سے اسی شہر میں اس کا ایک دکاندار دوست تھا۔ سوداگر وہ سونا ایک صندوقچے میں بند کر کے اپنے دوست کے پاس لے گیا اور اس سے کہا: ''میں کچھ عرصہ کے لیے ملک سے باہر جا رہا ہوں۔ آپ یہ سونا بطور امانت اپنے پاس رکھ لیں۔ میں واپس آ کر لوں گا۔'' دکاندار نے صندوقچہ لے لیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر سوداگر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ چار پانچ ماہ بعد سوداگر وطن واپس آیا۔ وہ اپنا سونا لینے کے لیے دکاندار کے پاس گیا لیکن اس دوران میں دکاندار کی نیت بدل چکی تھی۔ علیک سلیک کے بعد جب سوداگر نے اپنی امانت واپس مانگی تو دکاندار نے چہرے پر ایک مصنوعی قسم کی افسردگی طاری کر لی اور اظہار افسوس کرتے ہوئے کہنے لگا کہ وہ سونا تو چوہے کھا گئے ہیں اور میں بے حد شرمسار ہوں کہ آپ کی قیمتی امانت

میرے گھر میں محفوظ نہ رہ سکی لیکن ظاہر ہے اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ اس نے جھوٹی قسمیں کھا کر سوداگر کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ بالکل سچ کہہ رہا ہے۔ بیچارہ سوداگر یہ سن کر خاموش ہو گیا اور خالی ہاتھ واپس چلا آیا۔ مگر وہ سمجھتا تھا کہ دکاندار نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ وہ دل ہی دل میں دکاندار سے بدلہ لینے کی تجویز سوچنے لگا۔

چند ہی دن گزرے ہوں گے کہ سوداگر کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اُس نے دکاندار کو بیوی بچوں سمیت اپنے ہاں کھانے پر بلایا۔ کھانے کے دوران اس نے آنکھ بچا کر دکاندار کے چھوٹے لڑکے کو کہیں چھپا دیا۔ دکاندار جب کھانے سے فارغ ہوا تو چھوٹا لڑکا غائب تھا۔ اِدھر اُدھر بہت تلاش کیا مگر لڑکے کا کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر سوداگر نے دکاندار کو بتایا کہ اس کے لڑکے کو ابھی ابھی ایک چیل اٹھا کر لے جا رہی تھی۔ دکاندار نے حیران ہو کر کہا کہ کبھی چیل بھی اتنے بڑے لڑکے کو اٹھا کر لے جا سکتی ہے۔ آپ کیسی ناممکن بات کہہ رہے ہیں؟ اس پر سوداگر نے کہا: ''جس ملک میں چوہے پانچ سیر سونا کھا جاتے ہوں، وہاں چیلیں بھی بچوں کو اُٹھا کر لے جا سکتی ہیں۔''

یہ سن کر دکاندار شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ وہ سوداگر کا اشارہ سمجھ چکا تھا چنانچہ اس نے سوداگر سے اپنے کیے کی معافی مانگی اور اس کا سونا واپس کر دیا۔ سوداگر نے بھی اس کا لڑکا اس کے حوالے کر دیا اور یوں حکمتِ عملی سے اپنی کھوئی ہوئی دولت دوبارہ حاصل کر لی۔

(٤) احسان کا بدلہ احسان

پرانے زمانے کی بات ہے کسی ندی کے کنارے برگد کا ایک درخت تھا جس پر ایک فاختہ نے گھونسلا بنا رکھا تھا۔ اس درخت کے نیچے ایک چیونٹی بھی رہتی تھی۔ ایک دن چیونٹی ندی کے کنارے جا رہی تھی کہ اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ ندی میں گر گئی اور پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہنے لگی۔ قریب تھا کہ ڈوب جاتی مگر خوش قسمتی سے فاختہ درخت پر بیٹھی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی ہمسائی کو مصیبت میں گرفتار دیکھ کر سخت بے چین ہوئی۔ اُسے اور تو کچھ نہ سوجھا جھٹ درخت کی ٹہنی سے ایک پتہ توڑا، اڑ کے چیونٹی کے قریب پہنچی اور پتہ اس کے آگے لا کر رکھ دیا۔ چیونٹی پتے پر بیٹھ گئی۔ پتہ آہستہ آہستہ کنارے سے آ لگا اور اس طرح چیونٹی صحیح سلامت پانی سے باہر نکل آئی۔ وہ فاختہ کی دل سے شکر گزار تھی جس نے اسے ڈوبنے سے بچا لیا تھا۔

اتفاق کی بات دیکھیے کہ اُس کے اگلے ہی روز ایک شکاری بندوق ہاتھ میں لیے شکار کھیلتا ہوا اُدھر آ نکلا۔ اُس نے فاختہ کو درخت پر بیٹھے دیکھا تو اس پر نشانہ باندھ لیا۔ اچانک چیونٹی کی نظر اس پر پڑ گئی، اُسے فاختہ کا احسان یاد آ گیا۔ فوراً دوڑی دوڑی گئی اور شکاری کے پاؤں پر اس زور سے کاٹا کہ وہ درد سے بلبلا اٹھا اور اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔ اس طرح فاختہ کی جان بچ گئی۔ یوں چیونٹی نے اپنی ہمسائی کی نیکی کا بدلہ دے دیا۔ وہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے کام آنے پر بہت خوش تھے۔

سچ ہے جو کسی کے ساتھ بھلائی کرتا ہے۔ اُس کا اچھا بدلہ اُسے مل جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے، ''کر بھلا ہو بھلا۔''

(۵) اتفاق میں برکت ہے

پرانے وقتوں کی بات ہے۔ کسی جنگل میں دو بیل رہتے تھے۔ ان میں بڑی دوستی تھی۔ وہ ہر آفت کا مل کر مقابلہ کرتے اور آپس میں اتفاق و محبت سے رہا کرتے تھے۔ ایک بار شیر نے ان پر حملہ کر دیا مگر دونوں نے مل کر اسے ایسا مارا کہ شیر کو دم دبا کر بھاگنا پڑا۔ اس کے بعد پھر کسی دشمن کو جرأت نہ ہوئی کہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔

اتفاق کی بات دیکھیے کہ اسی جنگل میں ایک لومڑی بھی رہا کرتی تھی۔ اسے بیلوں کی یہ دوستی اور محبت سخت ناگوار تھی۔ وہ ہمیشہ اس ٹوہ میں رہتی کہ موقع ملے تو دونوں میں پھوٹ ڈال دے۔ لومڑی کی مکاری ضرب المثل ہے۔ اُس نے اندر ہی اندر کچھ ایسا چکر چلایا اور دونوں بیلوں کے کان ایک دوسرے کے خلاف کچھ ایسے بھرے کہ وہ ایک دوسرے سے بدظن ہو گئے۔ ان کی دوستی کا رشتہ ٹوٹ گیا اور اب وہ دوست کے بجائے ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ لومڑی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔

بیلوں کی اس نا اتفاقی کا علم کسی طرح شیر کو بھی ہو گیا۔ چنانچہ اس نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کی ٹھانی۔ ایک دن موقع پا کر اُدھر آ نکلا۔ اس نے آتے ہی ایک بیل پر حملہ کر دیا۔ دوسرا بیل اپنے ساتھی کو بچانے کے لیے بالکل آگے نہ بڑھا۔ شیر نے اس کے ٹکڑے کیے، پھر دوسرے پر جھپٹا اور اسے بھی چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ اس طرح دونوں بیل اپنی نا اتفاقی کے باعث ہلاک ہو گئے۔

دوسرا حصہ

چند خاکے اور ان کی مدد سے لکھی گئی کہانیاں

اس مرحلے میں ہر کہانی کے شروع میں پانچ خاکے دیے جارہے ہیں۔ ہر خاکے میں کہانی کے تین پیراگرافوں (ابتدائیہ، مرکزیہ، اختتامیہ) کے حوالے سے مختصر اشارے ہیں۔ آپ ان اشاروں کی مدد سے کہانی کا تانابانا بنیں اور اصل کہانی پڑھے بغیر تینوں پیراگراف لکھ ڈالیں۔ پھر اپنا امتحان خود لینے کے لیے دیکھیں کہ آپ کی کہانی اور دی گئی کہانی ربط و تسلسل، زبان و بیان اور اسلوب و محاورہ میں کتنا فرق ہے؟ اگلی کہانی میں آپ اس فرق کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح ایک کے بعد دوسری کہانی لکھتے چلے جائیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ پانچویں کہانی تک آپ معیاری کہانی کے قریب قریب پہنچ جائیں گے۔

خاکہ: ۱

ایک کوّے کو کہیں سے پنیر کا ٹکڑا ملا .... لومڑی اُدھر آنکلی............ اس کا جی للچایا............کوّے کی تعریف اور گانے کی فرمائش ....کوّے نے منہ کھولا اور پنیر نیچے گر پڑا ....لومڑی اٹھا کر چل دیتی ہے............نتیجہ

خوشامد پسندی بری بلا ہے

ایک دفعہ کا ذکر ہے کسی کوّے کو حلوائی کی دکان سے پنیر کا ایک ٹکڑا ملا۔ وہ اسے اپنی چونچ میں لے کر اڑا اور ایک درخت پر جا کر بیٹھ گیا۔ کوا پنیر جیسی نعمت ملنے پر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اتنے میں ایک لومڑی بھی پھرتی پھراتی ادھر آنکلی۔ جب اس نے کوّے کی چونچ میں پنیر کا ٹکڑا دیکھا تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ سوچنے لگی کہ کسی نہ کسی طرح یہ پنیر حاصل کرنا چاہیے۔

لومڑی کی مکاری مشہور ہے۔اس نے کوّے کی خوشامد شروع کردی۔ کہنے لگی: ''میاں کوّے! تم آج کتنے بھلے معلوم ہو رہے ہو۔تمہارے سیاہ اور چمکیلے بال بڑے ہی خوبصورت ہیں۔سنا ہے تمہاری آواز بھی بہت ہی دلکش اور سریلی ہے۔تمام پرندے تمہاری آواز کی تعریف کرتے ہیں۔ آج کوئی گیت تو سناؤ۔''

کوّے نے جب اپنی تعریف سنی تو پھولا نہ سمایا۔فوراً چونچ کھول کر کائیں کرنے لگا۔ جونہی اس نے اپنا منہ کھولا پنیر کا ٹکڑا زمین پر گر پڑا۔لومڑی نے اسے فوراً اچک لیا اور چلتی بنی۔ جاتے جاتے کوّے کو نصیحت کر گئی:

''میاں کوّے! خوشامدیوں سے بچنا چاہیے۔کسی کی چکنی چپڑی باتوں میں نہیں آنا چاہیے۔'' لومڑی تو یہ کہہ کر چل دی اور کوّا اپنی نادانی پر پچھتاتا اور افسوس کرتا رہ گیا۔

خاکہ: ۲

شیخ عبدالقادر جیلانی............بغداد سے روانہ ہوئے............ماں کی نصیحت............قافلے پر ڈاکوؤں کا حملہ............سامان کی تلاش............ڈاکوؤں کے سردار کا پوچھنا............شیخ کا جھوٹ سے بچنا............سردار کا حیران ہونا............نتیجہ

سانچ کو آنچ نہیں

کہتے ہیں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی بچپن کے زمانے میں تحصیل علم کے لیے ایک قافلے کے ہمراہ بغداد روانہ ہوئے۔ چلتے وقت ان کی والدہ محترمہ نے چالیس دینار انہیں دیے اور ساتھ ہی یہ نصیحت کی: ''بیٹا! ہمیشہ سچ بولنا، خواہ تمہیں کیسا ہی خطرہ کیوں نہ پیش آئے۔'' اتفاق کی بات ہے کہ اس قافلے پر راستے میں ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا اور اہلِ قافلہ کا سارا مال و اسباب لوٹ لیا۔

جب ڈاکو باری باری قافلے والوں کی تلاشی لے رہے تھے تو ان میں سے ایک ڈاکو نے آپ سے پوچھا: ''اے لڑکے! بتا تیرے پاس کیا ہے؟'' آپ نے جواب دیا: ''میرے پاس چالیس دینار ہیں۔'' ڈاکو نے اسے مذاق سمجھا اور آپ کو چھوڑ کر چلا گیا۔ بعد میں ایک اور ڈاکو آیا۔ اس

نے بھی وہی سوال کیا اور آپ نے پھر وہی جواب دیا: ''میرے پاس چالیس دینار ہیں۔'' وہ آپ کو پکڑ کر اپنے سردار کے پاس لے گیا۔

سردار نے آپ سے پوچھا: ''وہ دینار کہاں ہیں؟'' آپ نے جواب دیا: ''میری قمیص کے اندر سلے ہوئے ہیں۔'' قمیص چاک کر کے دیکھا گیا تو واقعی اس میں چالیس دینار سلے ہوئے تھے۔ اس پر سردار نے حیران ہو کر کہا: ''تم نے اپنی اس دولت کو بچانے کے لیے جھوٹ کیوں نہ بولا؟'' آپ نے جواب دیا: ''میری والدہ نے مجھے نصیحت کی تھی کہ ہمیشہ سچ بولوں، اس لیے میں اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا تھا۔''

یہ جواب سن کر سردار کے دل پر بے حد اثر ہوا۔ اس نے سوچا کہ یہ لڑکا ماں کا اتنا فرمانبردار ہے اور میں اپنے خدا کا اس قدر نافرمان ہوں۔ اسی وقت توبہ کی اور ساتھیوں سمیت رہزنی کے پیشہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر دیا۔

اس حکایت سے پتہ چلتا ہے کہ سچائی میں برکت اور نجات ہے اور سچ بولنے والے کو کبھی نقصان نہیں پہنچتا۔

خاکہ: ۳

ایک شیر بیمار ہو جاتا ہے .... تمام حیوانات اس کی بیمار پرسی کے لیے آتے ہیں .... لومڑی نہیں آتی .... بھیڑیا چغلی کھاتا ہے .... آخر لومڑی بھی آتی ہے .... دوا لانے کا بہانہ بناتی ہے .... شیر بھیڑیے کے ٹخنے کی ہڈی نکال کر کھا جاتا ہے .... بھیڑیے کو چغلی کھانے کی سزا مل جاتی ہے .... نتیجہ

چغل خوری کا انجام

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شیر بہت سخت بیمار ہو گیا۔ جنگل کے سب جانور اس کی بیمار پرسی کے لیے آئے۔ مگر لومڑی نہ آئی۔ شیر نے دوسرے جانوروں سے اس کے نہ آنے کی وجہ پوچھی۔ اس پر بھیڑیا کہنے لگا: ''حضور والا! وہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتی ہے۔ بھلا اسے آپ کی کیا

پرواہ؟'' یہ سن کر شیر نہایت غضبناک ہوا اور اس نے لومڑی کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔

جنگل کے بادشاہ کا حکم تھا۔ بیچاری لومڑی کے لیے آنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مگر اسے بھیڑیے کے چغلی کھانے کا حال معلوم ہو چکا تھا۔ جب وہ شیر کے سامنے حاضر ہوئی تو اس نے غیر حاضر رہنے کا سبب دریافت کیا۔ لومڑی نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا: ''بادشاہ سلامت! مجھے حضور کی بیماری کا حال معلوم ہو چکا تھا، مگر میں اِدھر اُدھر پھرتی پھراتی رہی تاکہ کوئی دوائی مل جائے تو لیتی آؤں۔''

شیر نے پوچھا: ''تو پھر تمہیں دوائی ملی ہے؟'' لومڑی نے دست بستہ عرض کی: ''ہاں حضور! دوائی مل گئی ہے۔ حضور! اگر آپ بھیڑیے کے ٹخنے کی ہڈی کھالیں تو بالکل تندرست ہو جائیں گے۔'' شیر نے اسی وقت پنجہ مارا اور بھیڑیے کے ٹخنے کی ہڈی نکال کر کھا گیا۔ بھیڑیا وہاں سے لہو لہان باہر نکلا۔ لومڑی نے آگے بڑھ کر کہا: ''میاں بھیڑیے! جب تم بادشاہوں کے سامنے جاؤ تو سوچ سمجھ کر بولو اور دوسروں کے خلاف کبھی کوئی بات منہ سے نہ نکالو۔''

سچ ہے: چغل خور ہمیشہ نقصان اٹھاتا ہے۔

خاکہ: ٤

ایک خرگوش کی ایک کچھوے سے ملاقات .... کچھوے کی سست رفتاری پر طعنہ زنی .... دونوں کے درمیان مقابلہ .... خرگوش آگے نکل جاتا ہے .... خرگوش ایک درخت کے سائے میں سو جاتا ہے .... کچھوا چلتا رہتا ہے اور منزل پر پہنچ جاتا ہے ....

نتیجہ

غرور کا سر نیچا

ایک دفعہ کا ذکر ہے کسی جنگل میں ایک خرگوش رہتا تھا۔ اُسے اپنی تیز رفتاری پر بڑا ناز تھا۔ وہ ہر وقت اپنے پڑوسی کچھوے کو تنگ کرتا اور اس کی سست رفتاری پر اسے طعنے دیتا رہتا تھا۔ روز روز کے طعنوں سے تنگ آ کر آخر ایک دن کچھوے نے خرگوش سے کہا: ''آؤ! ہم تم ایک میل کی دوڑ کا مقابلہ کرلیں۔'' خرگوش کچھوے کی اس بات پر بہت ہنسا اور کہنے لگا: ''کیا پدی اور کیا پدی کا

شور بہ! تم اور میرا مقابلہ؟'' لیکن کچھوے نے اپنی تجویز پھر دہرائی اور اس پر اصرار کیا۔ چاروناچار خرگوش کو اس کا چیلنج قبول کرنا پڑا۔ چنانچہ اسی وقت انہوں نے دوڑ کا وقت اور جگہ مقرر کر لی۔

اگلے دن وقت مقررہ پر دوڑ شروع ہوگئی۔ خرگوش نہایت تیزی سے چھلانگیں لگاتا ہوا کچھوے سے بہت آگے نکل گیا۔ کافی دور جا کر جب پیچھے دیکھا تو کچھوا کہیں نظر نہ آیا۔ جی میں کہنے لگا: ایسی جلدی کی کیا ضرورت ہے؟ کچھوا میرا مقابلہ خاک کرے گا۔ تھوڑی دیر ستا لوں پھر آگے روانہ ہوں گا۔ چنانچہ وہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جلد ہی خوابِ غفلت کے مزے لینے لگا۔ خرگوش کی نیند مشہور ہے۔ سویا تو گھنٹوں کی خبر لایا۔

ادھر کچھوا مستقل مزاجی سے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ وہ خرگوش کو سوتا چھوڑ کر چپ چاپ اس کے پاس سے گزر گیا اور منزلِ مقصود پر جا پہنچا۔ جب خرگوش کی آنکھ کھلی تو دن غروب ہونے کے قریب تھا۔ دل میں کہنے لگا: ابھی کچھوا بہت پیچھے ہے۔ میں دو تین چھلانگوں میں منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤں گا۔ غرض دوڑتا ہوا منزل پر پہنچا تو کچھوا وہاں پہلے سے موجود تھا۔

خرگوش نے جب حریف کو اپنے سے پہلے وہاں موجود پایا تو اس کی شرمندگی کی کوئی انتہا نہ رہی، مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ کچھوا بازی جیت چکا تھا اور خرگوش کو قدرت کی طرف سے اس کے غرور کی سزا مل چکی تھی۔

سچ ہے: جو کوئی غرور اور تکبر کرتا ہے اسے سرنگوں ہونا پڑتا ہے۔

خاکہ:۵

ایک شہزادہ............شکار کھیلتے ساتھیوں سے بچھڑ گیا............شام ہوگئی............کسان کے گھر رات گزارنا............کسان کو ایک اشرفی دینا............کسان کا انکار............کسان کے بیٹے کو تھیلی ملنا............ایک سال بعد شہزادے کا پھر آنا............اپنی کھوئی ہوئی تھیلی پا کر خوش ہونا............نتیجہ

ایمانداری کا پھل

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شہزادہ شکار کھیلتے ہوئے جنگل میں ساتھیوں سے بچھڑ کر راستہ بھول گیا۔ چلتے چلتے شام ہوگئی۔ دور سے ایک جھونپڑی دکھائی دی۔ نزدیک پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایک کسان کا گھر ہے۔ شہزادے نے کسان سے کہا: ''رات کا وقت ہے، راستہ بھول گیا ہوں، تم اجازت دے دو تو رات یہاں کاٹ لوں؟'' کسان نے کہا: ''آپ کا گھر ہے، آیئے! بڑی خوشی سے یہاں ٹھہریے۔ جو کچھ روکھی سوکھی گھر میں موجود ہے، حاضر ہے۔''

شہزادے نے رات وہاں گذاری۔ خوب آرام پایا۔ صبح ہوئی تو اپنے گھر کا راستہ لیا۔ چلتے وقت تھیلی میں سے ایک اشرفی نکال کر کسان کو دینے لگا۔ کسان نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا: ''ہم نے آپ کی خدمت روپے کے لالچ میں نہیں کی ہے۔ یہ تو ہمارا اخلاقی فرض تھا۔ آپ ہمیں شرمندہ کیوں کرتے ہیں؟''

دن چڑھا تو کسان کا لڑکا بیل لے کر کھیتوں کو چل دیا۔ راستے میں اسے ایک تھیلی ملی۔ کھول کر دیکھا تو اس میں بیس اشرفیاں تھیں۔ لڑکے نے تھیلی قریب محفوظ جگہ دیکھ کر زمین میں دبا دی اور آ کر باپ کو اطلاع دی۔ باپ نے کہا: ''تم نے بہت اچھا کیا کہ تھیلی امانتہً دبا دی۔ یہ پرایا مال ہے۔ اس کے مالک کی تلاش کریں گے۔ جب ملے گا اسے دے دیں گے۔''

ایک سال بعد شہزادہ پھر اُدھر سے گزرا اور کسان سے ملنے کے لیے ٹھہر گیا۔ باتوں باتوں میں اس نے اپنی تھیلی کے گر جانے کا ذکر بھی کیا۔ کسان بہت خوش ہوا اور کہا: ''آپ کی تھیلی میرے لڑکے کو ملی تھی اور جہاں پایا تھا وہیں اس نے دبا دیا تھا۔ جایئے! جا کر نکال لیجیے۔'' شہزادے نے کہا: ''آپ منگوا دیں۔'' کسان نے لڑکے کو بھیجا اور وہ تھیلی لے آیا۔

شہزادے نے تھیلی کھول کر دیکھی تو اشرفیاں پوری کی پوری موجود تھیں۔ اس نے اس میں بیس اشرفیاں اور ڈال دیں اور کسان سے کہا: ''لو! یہ تھیلی میں تمھیں انعام دیتا ہوں۔ میں تمہارے بادشاہ کا بیٹا ہوں۔'' یہ سن کر کسان کی فخر اور مسرت کی انتہا نہ رہی اور کہا: ''ہمیں معلوم نہ تھا کہ آپ ہمارے شہزادے ہیں۔ اب میں یہ انعام آپ سے لے لیتا ہوں۔ میں اسے اپنے لڑکے کے بیاہ پر خرچ کروں گا۔''

سچ ہے: ایمانداری کا پھل انسان کو ضرور ملتا ہے اور ایماندار آدمی ہمیشہ دنیا میں سربلند اور سرخرو ہوتا ہے۔

تیسرا حصہ: خاکے کی مدد سے کہانی لکھنا

یہاں پہنچ کر کہانی لکھنے کی مشق کا اصل مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ آپ نیچے دیے گئے خاکوں کو عنوان دیں اور دیے گئے اشارات کی مدد سے کہانی مکمل کریں۔ کہانی لکھ لینے کے بعد اصلاح ورہنمائی کے لیے اپنے کسی استاد کو دکھائیں اور ان کی دی گئی اصلاح وترمیم پر خوب غور کریں۔ ان دس مشقوں سے گزرنے کے بعد آپ از خود کسی سبق آموز ننھی منی کہانی کا عنوان اور خاکہ سوچیں۔ پھر اس خاکے میں رنگ بھر کے اصلاح کروائیں اور کسی رسالے میں چھپنے کے لیے بھیج دیں۔ اگر آپ نے محنت جاری رکھی تو ان شاء اللہ کامیابی ضرور آپ کے قدم چومے گی۔

(۱)

ایک سیاح سیر کو نکلا..........جنگل میں بیمار بندر سے ملاقات ....ہمدردی کا اظہار ....بندر تندرست ہو گیا..........دونوں کی محبت ....سیاح کو پیاس لگی .... جان کا خطرہ..........بندر نے ناریل توڑا..........سیاح کی جان بچ گئی..........احسان کا بدلہ احسان۔

(۲)

سلطان سبکتگین شکار کے لیے جنگل میں جاتا ہے..........ایک ہرنی کو اپنے بچے کے ساتھ چرتے دیکھتا ہے..........گھوڑا دوڑاتا ہے..........ہرنی بھاگ جاتی ہے بچہ پکڑا جاتا ہے ....بچے کی ماں پیچھے پیچھے آتی ہے..........وہ بچے کو چھوڑ دیتا ہے..........خواب میں ایک بزرگ مرد سبکتگین کو سلطنت کی بشارت دیتے ہیں۔

(۳)

ایک کسان مرنے کے قریب ہے..........چاروں لڑکوں کو بلاتا ہے..........کھیت میں گڑے ہوئے خزانے کی خبر دیتا ہے..........لڑکے سارا کھیت کھودتے ہیں..........خزانہ نہیں ملتا، مگر فصل بہت اچھی ہوتی ہے..........محنت کا پھل مل جاتا ہے۔

(٤)

ایک لڑکا دریا کے کنارے گائیں چراتا ہے..........ریل کے پل کو آگ لگ جاتی ہے..........لڑکا سوچ میں ڈوب جاتا ہے..........دوسری طرف سے گاڑی آتی ہے..........لڑکا بازو پھیلا کر گاڑی کی طرف دوڑتا ہے..........گاڑی سے ٹکرا کر جان دے دیتا ہے..........گاڑی پل پر آ کر رک جاتی ہے..........سب لوگ لڑکے کی بہادری کی داد دیتے ہیں۔

(٥)

ایک کوا بہت پیاسا تھا.......... پانی کا گھڑا دیکھا..........اس کے صرف پیندے میں پانی تھا..........کنکر اور ٹھیکریاں اکٹھی کر کے گھڑے میں ڈالنے لگا.......... پانی گھڑے کے منہ تک آ گیا.......... پانی پی کر اپنی پیاس بجھائی۔

(٦)

ایک باپ کے دو لڑکے..........ایک کاہل..........دوسرا ہوشیار.......... باپ نے دونوں کو ایک ایک اشرفی دی اور کہا اسے ضائع نہ کرنا..........کاہل نے اشرفی زمین میں گاڑ دی..........ہوشیار نے تجارت کی..........نتیجہ

(٧)

ایک شخص کو شکار کا شوق..........ایک دن کتے کو گھر چھوڑ گیا..........واپس آیا تو کتے کا منہ اور پنجے خون آلود تھے..........چھوٹا بچہ بھی گھر پر تھا..........تلوار سے کتے کا کام تمام کر دیا..........بچہ آواز سن کر چونک پڑا..........مالک کمرے میں مرا ہوا بھیڑیا دیکھتا ہے اور پچھتاتا ہے۔

(۸)

ایک بچھو............سفر کا ارادہ............ دریا کے کنارے کچھوے سے ملاقات .... کچھوے نے رحم کھا کر اپنی پیٹھ پر بٹھا لیا............ کچھوے کے کان میں آواز آئی............ بچھو ڈنگ مارتا ہے............ کچھوا پانی میں غوطہ لگاتا ہے............ نتیجہ

(۹)

ایک لکڑ ہارے کا دریا کے کنارے لکڑیاں کاٹنا............ کلہاڑے کا پانی میں گرنا............ فرشتے کا انسانی صورت میں آنا اور سونے چاندی کا کلہاڑا نکال کر دینا............ لکڑ ہارے کا انکار .... پھر اصلی کلہاڑا نکال کر دینا............ لکڑ ہارا لے لیتا ہے .... فرشتہ خوش ہو کر دونوں کلہاڑے انعام میں دے دیتا ہے............ نتیجہ

(۱۰)

ایک کتے کو گوشت کا ٹکڑا ملنا............ پانی میں اپنا عکس دیکھنا............ عکس کو دیکھ کر سمجھنا کہ دوسرا کتا ہے............ پانی میں چھلانگ لگانا............ گوشت کا اپنا ٹکڑا بھی کھو دینا............ نتیجہ

مضمون نویسی

- ...... چار بنیادی چیزیں

(۱) خیالات

(۲) طرز بیان

(۳) ترتیب

(٤) صحت زبان

— مضمون کے حصے

— ابتدائیہ

— مرکزی خیال

— خاتمہ

— مضمون کی قسمیں

— مضمون نگاری سیکھنے کے لیے دو ہدایات

— ایک مشکل کا حل

— مضمون نویسی کے مراحل

- ...... مضمون کیسے لکھا جائے؟

— ان اصولوں کو اپنائیے

— ان غلطیوں سے بچیے

- ...... مضمون نگاری کی مشق

- ...... ٹھنڈی رات میں ایک سفر

مضمون نویسی

اپنے خیالات، جذبات، محسوسات اور مشاہدات کو صاف، شستہ اور مؤثر زبان میں ادا کرنے کا نام ''مضمون نویسی'' ہے۔ مضمون نویسی کے لیے چار چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں:

(۱) خیالات:

کسی مضمون میں خیالات جس قدر بلند اور وسیع ہوں گے، اسی قدر وہ مضمون دلکش ہوگا۔ خیالات کی بلندی اور عمدگی کے لیے مطالعہ کی وسعت اور مشاہدہ کی گہرائی ضروری ہے۔

(۲) طرزِ بیان:

ایسے ہی اگر انسان کے پاس عمدہ سے عمدہ خیالات موجود ہوں مگر ان کو پیش کرنے کے لیے وہ مناسب طرزِ بیان اختیار نہ کرے تو اس کے عمدہ خیالات کی وقعت اور قدر و قیمت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ مضمون کا معنوی حسن بلند خیالات اور ظاہری حسن طرزِ بیان کا مرہونِ منّت ہے۔

(۳) ترتیب:

اگر مضمون نگار اپنی معلومات کو ضروری ترتیب کے ساتھ قرطاس پر منتقل نہ کرے تو اس سے قارئین صحیح معنوں میں مستفید نہیں ہو سکتے۔ ربط، ترتیب اور تسلسل کے بغیر جو کچھ بھی لکھا جائے گا، اس کی حیثیت لفظوں کے ایک ڈھیر کے سوا کچھ نہ ہوگی۔

(٤) صحت زبان:

ان ساری باتوں کے ساتھ ساتھ صحت زبان کا خیال رکھنا بھی از بس ضروری ہے۔ یعنی جو کچھ لکھا جائے املا، لغت، محاورۂ زبان اور قواعد کے لحاظ سے پوری طرح درست ہو۔

مضمون کے حصے:

ایک مضمون کے مندرجہ ذیل تین حصے ہوتے ہیں:(۱)ابتدائیہ(۲) مرکزی خیال(۳) خاتمہ

ابتدائیہ:

اصل مضمون شروع کرنے سے پہلے چند سطروں میں اپنے موضوع کی طرف اشارہ کرنے کا نام ابتدائیہ اور تمہید ہے۔اس سے پڑھنے والے کی طبیعت آنے والے بیان کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔تمہید کے بغیر مضمون ایسا ہی ہے جیسے چہرے کے بغیر جسم،اس لیے مضمون کے آغاز میں ایک تمہیدی پیراگراف ضرور لکھیے۔تمہید طویل اور بیزار کن نہیں ہونی چاہیے، بلکہ اس کا مختصر اور دلچسپ ہونا ضروری ہے۔مضمون کا اندازہ عام طور پر تمہید ہی سے لگایا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

یہ حصہ مضمون کا اصل، سب سے اہم اور مرکزی حصہ ہوتا ہے۔اس کو محنت اور توجہ سے لکھنا چاہیے۔یہ حصہ ایک ہی پیراگراف پر مشتمل نہیں ہوتا بلکہ حسب ضرورت اسے کئی پیراگرافوں میں تقسیم کر لیا جاتا ہے۔

خاتمہ:

یہ مضمون کا آخری حصہ ہوتا ہے۔اسے ہم پورے مضمون کا حاصل یا نچوڑ کہہ سکتے ہیں۔جس طرح مضمون کی تمہید کا مختصر اور دلکش ہونا ضروری ہے،اسی طرح مضمون کا اختتام بھی بڑا مؤثر اور دل پذیر ہونا چاہیے۔مرکزی خیال میں جو کچھ لکھا گیا ہو اس کا خلاصہ اور ماحصل آخری پیراگراف میں سمو دینا، پڑھنے والے کو کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔

مضمون کی اقسام:

مضمون مختلف قسم کے ہوتے ہیں:

۱-بیانیہ مضمون: جس میں کسی چیز، جگہ یا جاندار کا بیان ہو،مثلاً: جامع مسجد قرطبہ، دارالعلوم

دیو بند یا کسی تاریخی عمارت پر مضمون لکھنا ہو تو اس کا محلِ وقوع، اس کی تاریخی اہمیت، قیام کا پسِ منظر و مقاصد، بانی اور مشہور شخصیات، اس کی خدمات، اور اس کی عمارات اور ذیلی ادارے......کوئی آثارِ قدیمہ ہو تو اس کا محلِ وقوع، اسے قائم کرنے والوں کا تذکرہ، اس کی موجودہ حالت، اس سے برآمد ہونے والے نوادرات، اس پر بیتنے والے مختلف تاریخی ادوار، وغیرہ۔ جانور مثلاً اونٹ یا گھوڑے پر لکھنا ہو تو اس کی شکل وصورت، جسمانی بناوٹ، اس کی خصوصیات، اس کے رہن سہن اور انسان کے ساتھ اس کے دیرینہ دوستانہ وخادمانہ تعلق کا بیان۔

۲- واقعاتی یا سوانحی: جس میں کوئی واقعہ یا کسی کی سوانحِ عمری بیان کی جائے، مثلاً: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اسلام قبول کرنے کا واقعہ، ہجرت کا واقعہ، فتح مکہ کا واقعہ؛ سوانح مثلاً حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حالاتِ زندگی لکھنے ہوں تو ولادت، خاندان کا تعارف، ولادت کی تاریخ اور جگہ، بچپن کے حالات، تعلیم وتربیت، اخلاق وکردار، بیعت وارشاد، خدمات وکارنامے اور وفات کا تذکرہ۔ آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، سوانحی خاکے اور سفرنامے وغیرہ بھی حکائی مضمون کے زمرے میں آتے ہیں۔

۳- ذہنی وفکری: جس میں کسی موضوع پر اپنی فکر کا نچوڑ پیش کیا گیا ہو اور اس کا تعلق خالص غور وفکر اور شعور واحساس سے ہو۔ اس میں بہت سوچنا پڑتا ہے، ذہن پر زور دینا ہوتا ہے، تیزیٔ خاطر اور فکرِ رسا کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذہن میں پہلے سے موجود باتوں سے نئی باتیں برآمد کرنی پڑتی ہیں۔ مثلاً یہ موضوعات "مضمونِ فکری" سے تعلق رکھتے ہیں: حفظانِ صحت، مقصدِ زندگی، ایمان داری، حب الوطنی، خودداری وغیرہ۔

٤- علمی وتحقیقی: جس میں کسی موضوع پر حوالہ جات کے ساتھ علمی وتحقیقی انداز میں بحث کی گئی ہو۔ اس کتاب میں ''مقالہ نگاری'' کے عنوان کے تحت ایسا مضمون لکھنے کا طریقہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ جبکہ پہلے تین طرز کے مضامین لکھنے کی مشق کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ مضمون کے عناصر اور اشارات مرتب کرلیں۔ پھر ان کی مدد سے ایک ایک پیرا لکھتے جائیں۔ اس کا تفصیلی طریقہ آگے آرہا ہے۔

مضمون نگاری سیکھنے کے لیے دو ہدایات:

مضمون نگاری سیکھنے کے لیے درج ذیل دو ہدایات پر عمل کریں، ان شاء اللہ تعالیٰ مضمون نگاری آجائے گی۔

(۱) مطالعے کی عادت:

اچھے مضمون کے لیے وسیع مطالعہ ضروری ہے، لہٰذا جسے مضمون لکھنے کا شوق ہے اسے چاہیے کہ مطالعہ کو عادت بنائے اور کتابوں سے دل لگائے۔ جب کسی موضوع پر اتنا پڑھ چکیں کہ دل کا پیالہ چھلکنے لگے تو سمجھیے کہ اب آپ روانی سے مضمون لکھ سکیں گے۔ اس لیے مضمون لکھنا ہو یا نہ، دوسرے مضامین اور کتابوں کا مطالعہ ضرور کیجیے تا کہ مختلف موضوعات پر آپ کو مواد ملے، معلومات میں اضافہ ہو اور کسی موضوع پر لکھنے کے لیے آپ کو مواد تلاش کرنا ہو تو ذہن میں رہے کہ فلاں کتاب اور فلاں رسالہ میں ملے گا۔

مطالعہ ان کتابوں کا کیجیے جو معتبر و مستند علماء وفضلاء اور مشہور ادیبوں کی تصانیف ہوں اور رسائل وجرائد ایسے ہوں جن میں اسی قسم کے حضرات کے مضامین ومقالات شائع ہوتے ہوں۔ وہ تحریریں جن میں دینی وعلمی مواد کے ساتھ زبان وادب کی چاشنی بھی ہو، آپ کے لیے اس اعتبار سے بے حد مفید ثابت ہوں گی کہ اس سے آپ کا اسلوبِ تحریر بھی نکھرے گا۔

جس کتاب یا مضمون کا مطالعہ کریں، اس کے قابلِ ذکر نکات کو خط کشیدہ کرتے جائیے اور مطالعہ کے بعد سوچیے کہ اس میں کیا کہا گیا ہے؟ آپ کے ذہن میں اس کی کون کون سی باتیں موجود ہیں؟ انہیں اپنے الفاظ میں لکھیے۔ باتیں اگر ذہن سے نکل گئی ہوں تو دوبارہ کتاب یا مضمون پر سرسری نگاہ ڈال لیجیے تا کہ تازہ ہو جائیں۔ عادت ڈال لیجیے کہ مطالعہ کے وقت پنسل ہاتھ میں ہو اور اہم باتیں (اگر کتاب اپنی ہے) خط کشیدہ ہوتی جائیں نیز بہت اہم نکات کی یادداشت کتاب کے شروع میں ملحقہ خالی کاغذ پر سلیقہ اور ترتیب سے لکھی جاتی رہیں۔

(۲) استاد کی رہنمائی:

مضمون نگاری سیکھنے کے لیے کسی استاد (جو مضمون نگار ہوں) کی رہنمائی حاصل کیجیے۔ ان

سے عنوان و مواد پر مشورہ لیجیے۔ اپنے لکھے ہوئے مضامین اصلاح کے لیے پیش کیجیے۔ وہ ان میں کاٹ چھانٹ کریں گے، بعض اوقات لمبی لمبی عبارتیں کاٹ دیں گے اور اس کی جگہ مختصر سا جملہ لکھ دیں گے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پوری عبارت کاٹ دیں اور کچھ نہ لکھیں۔ بعض اوقات آپ کے استاد ایسی عبارتوں کو کاٹ دیں گے جو آپ نے بڑی محنت سے لکھی ہوں گی اور آپ کے خیال میں بڑی اہم ہوں گی، مگر چونکہ استاد کی نگاہ میں وہ غیر ضروری، غیر مفید، یا اسلوبِ تحریر کے اعتبار سے نامناسب ہوں گی اس لیے وہ اسے قلم زد کر دیں گے۔ آپ اس سے بالکل نہ گھبرائیں اور دل چھوٹا نہ کریں۔ بڑے بڑے مضمون نگاروں کے مضامین ابتدا میں ردی کی ٹوکری میں ڈالے جاتے ہیں اور ان میں کاٹ چھانٹ کی جاتی ہیں۔ یہی کاٹ چھانٹ آئندہ آپ کے ذہن کو جلا بخشے گی اور آپ ضروری و غیر ضروری، متعلق و غیر متعلق، مفید و غیر مفید کے درمیان تمیز و تفریق کرنا سیکھ جائیں گے۔ مضمون نگاری سیکھنے کے بعد اپنے ابتدائی مضامین کو آپ دیکھیں گے تو آپ خود ان میں پھر سے ترمیم کی ضرورت محسوس کریں گے۔ تب آپ کو سمجھ آئے گا کہ استاد کی کاٹ چھانٹ بالکل برمحل تھی۔

مضمون نویسی کے مراحل:

مضمون نویسی کے تین مرحلے ہوتے ہیں: تخطیط (خاکہ سازی) تسوید (رف لکھنا) اور تبییض (صاف کر کے لکھنا)۔

۱-تخطیط:

— مراجع کا مطالعہ کرنے اور ضرورت کی عبارتیں نقل کرنے کے بعد سوچیے کہ تحریر کا خاکہ کیا ہو؟ اشارات کو کس طرح ترتیب دیا جائے؟ بعض اوقات شروع میں ترتیب دیے گئے اشارات کافی ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ان میں ترمیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ کچھ کو ختم کرنا پڑتا ہے، کچھ کا اضافہ کرنا پڑتا ہے، کچھ میں تقدیم و تاخیر کرنی پڑتی ہے۔

۲-تسوید:

— جو کچھ لکھیے اپنے موضوع کے عین مطابق لکھیے۔ ادھر ادھر کی غیر متعلق باتیں لکھ کر

مضمون کوخواہ مخواہ طویل بنانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

— مضمون کی ابتدا چونکا دینے والی، تجسس پیدا کرنے والی اور انتہا تشفی اور تسکین دینے والی ہونی چاہیے۔ جس مضمون نگار کو اس پر قدرت حاصل ہو، وہ کامیاب اور مقبول مضمون نگار ہوتا ہے اور کامیابی سے مطلوبہ نظریہ قارئین تک پہنچا سکتا ہے۔

— مضمون میں الفاظ یا معانی کا تکرار ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ الفاظ کو مکرر لانا پڑے تو مترادفات کا استعمال کریں۔ اس سے عبارت میں حسن بھی پیدا ہو جائے گا۔

— کسی واقعہ کو بیان کرتے وقت اس کی ترتیب کو قائم رکھیے۔ آگے کی بات پیچھے اور پیچھے کی بات آگے لکھنے سے مضمون بے ربط ہو کر رہ جاتا ہے۔

— مضمون کے آغاز یا خاتمے پر موقع کی مناسبت سے کوئی عمدہ شعر لکھنا بہت اچھا ہے، درمیان میں بھی حسبِ ضرورت شعر لکھا جاتا ہے، لیکن مضمون میں شعروں کی بھرمار ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ بالعموم ایک مضمون میں دو یا تین شعر کافی ہوتے ہیں۔ مضمون میں ایسا شعر کبھی نہ لکھیے جو آپ کو صحیح طور پر یاد نہ ہو۔ اسی طرح گھسا پٹا اور بہت زیادہ زبان زدِ عام شعر یا مصرعہ استعمال کرنے سے بھی پرہیز کیجیے۔

۳۔ تبییض:

— مضمون مکمل ہو جانے کے بعد نظرِ ثانی انتہائی ضروری ہے تاکہ اغلاط کی تصحیح ہو سکے یا تحریر کی نوک پلک درست کی جا سکے۔ نظرِ ثانی کرتے وقت مضمون میں کاٹ چھانٹ، حذف و اضافہ کیجیے اور اپنے اعتبار سے ایک بار پھر مکمل کیجیے۔

— مسوّدہ تیار ہونے کے بعد اسے دو تین بار پڑھ لیجیے۔ عبارتوں میں کاٹ چھانٹ اور اضافہ و ترمیم کیجیے۔ جب دل مطمئن ہو جائے تو آخری بار اسے دوسرے کاغذ پر نقل کر لیجیے۔ گویا ''مسوّدہ'' کو ''مبیّضہ'' کی شکل دیجیے۔ مسوّدہ کو مبیّضہ بناتے وقت جو عبارت اچھی نہ لگتی ہو یا زائد معلوم ہو، اسے بدل دیجیے یا حذف کر دیجیے۔ جو بات لکھنے کے قابل سمجھ میں آئے، اسے شامل کر دیجیے۔ یقیناً مضمون صاف کرتے وقت بہت سی نئی باتیں سمجھ میں آئیں گی اور پہلے کی لکھی ہوئی بعض باتیں زائد معلوم ہوں گی، کہیں اندازِ تحریر اچھا نہ لگے گا، لہٰذا سب میں ترمیم کرتے

جائیں اور جس پر دل مطمئن ہو وہ عبارت لائیں۔ اگر ابتدائی مراحل میں کئی کئی مرتبہ کسی مضمون کو صاف کرنا پڑے تو بھی نہ گھبرائیں۔ ایسی مشقتوں سے گذرنے والا ہی کندن بنتا ہے۔

لگاتار کوشش ضروری ہے۔ ہر ماہ کم از کم ایک مضمون لکھیے۔ کوشش کیجیے کہ بڑے حجم (فل اسکیپ سائز) کے دو صفحات سے کم کا نہ ہو۔

تبییض کو اصلاح کے لیے پیش کرنے یا اشاعت کے لیے بھیجنے سے پہلے اسے سلیقے سے تیار کرنے کے لیے مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل کیجیے:

— کاغذ صاف ستھرا ہو۔ کاغذ کے صرف ایک طرف لکھیے۔ صفحے کے دونوں طرف حاشیہ چھوڑ کر لکھیے۔ ایک بات کو بار بار نہ لکھیے۔ حروف کے شوشے اور نقطے پورے ہوں۔ املا صحیح ہو۔ سطریں سیدھی ہوں۔ سطروں کے درمیان مناسب جگہ چھوڑی گئی ہو۔ ایک بات مکمل ہو جانے کے بعد پیراگراف بدل دیجیے۔

— وقفہ (کاما) ختمہ (ڈیش) سوالیہ، قوسین اور واوین وغیرہ کے استعمال سے واقفیت حاصل کیجیے۔ دوسرے کی عبارت کیسے نقل کی جاتی ہے؟ اگر اسے پورا نقل نہ کرنا ہو تو محذوف عبارت کی جگہ کس طرح نقطے لگائے جاتے ہیں؟ یہ ساری باتیں مضمون نگاری سیکھنے والوں کو جاننا ضروری ہے۔

— لفّاظی اور مسجّع و مقفّیٰ عبارتیں لانے سے پرہیز کیجیے۔ جو پرشکوہ الفاظ خود سے نوکِ قلم پر آجائیں، لکھ ڈالیے۔ بالقصد اس قسم کی کوششیں فضول ہیں اور آج کے ادب میں متروک۔ اسی طرح ڈھونڈ ڈھونڈ کر مشکل الفاظ استعمال کرنا اور عبارت کو ادق و گنجلک بنانا بھی آج کے اسلوبِ تحریر کے خلاف ہے۔

مضمون کیسے لکھا جائے؟

ان اصولوں کو اپنائیے:

کسی بھی موضوع پر لکھتے وقت درج ذیل امور کا اہتمام کیجیے۔ ان شاء اللہ آپ آسانی سے کامیاب مضمون لکھ لیں گے:

۱- دیے گئے موضوع کی حقیقت، اس کے مرکزی خیال اور اصل مقصد و دائرہ کار (دائرۂ خیال کہہ لیجیے) کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ اصل مقصد کو نہ سمجھ سکیں یا اس کے بعض اہم نکات آپ کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔ مثلاً آپ کو دیے گئے عنوان کے متعلق اچھی طرح جاننا چاہیے کہ اس سے مراد کسی چیز (مثلاً سفر یا تقریب) کے احوال کا بیان ہے، یا اس کے فوائد (مثلاً سمندر، سورج یا بارش کے فوائد) پوچھے گئے ہیں۔ یا بالفرض دونوں مطلوب ہیں۔ جیسے آپ سے کہا گیا کہ ''برسات کا ایک دن'' پر مضمون لکھیے۔ آپ کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے کہ آپ نے صرف برسات کے دن کی منظر نگاری کرنی ہے یا بارش کے فوائد ونقصانات بھی ساتھ لکھنے ہیں۔ عنوان کے الفاظ کن کن امور کو اصالۃً یا تبعاً شامل ہیں؟ کس ضمنی بات کو کتنی سطریں دینی ہیں؟ دینی بھی ہیں یا نہیں؟ یہ چیز شروع میں ہی سمجھ لینا بہت ضروری ہے۔

۲- موضوع کی حدود و دائرہ خیال کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کیجیے۔ اپنے ذہن کی باگوں کو اس کے مختلف گوشوں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیجیے اور جن جن چیزوں کا اس سے قریب یا دور کا تعلق ہے، انہیں ترتیب سے لکھ کر ایک اشارتی خاکہ تیار کیجیے۔ مثلاً آپ ''بارش: رحمت کیوں زحمت میں بدل جاتی ہے؟'' پر لکھنا چاہتے ہیں تو اپنے ذہن میں موسم برسات کی آمد سے لے کر بارش سے پہلے کی فضا تک کو دہرائیے۔ پھر ان طبعی وفطری مناظر کو دہرائیے جو آسمان کے سوتے پھوٹ بہنے سے پہلے کائنات میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

پھر بارش کی ابتدا میں ہلکی بوندا باندی اور اچانک بادلوں کا فوارہ پھوٹ پڑنے کو ذہن میں مستحضر کیجیے۔اس کے ساتھ بارش کی آمد سے چوکنے ہو کر احتیاطی تدابیر کرنے ،لوگوں کی ترت پھرت اور بارش شروع ہونے کے بعد آسمان کی بلند وسعتوں سے گلیوں محلوں کی پست حالت تک سب کچھ کو دماغ کے پردے پر تازہ کیجیے۔ بارش کا پہلا قطرہ پڑتے ہی بجلی کیسے غائب ہوتی ہے؟ مچھر مکھی خفیہ مورچوں سے نکل کر کیسے حملہ آور ہوتے ہیں؟ ٹپکتی چھتوں اور برستے پرنالوں کا کیا علاج کیا جاتا ہے؟ بارش برستے وقت ندی نالے کیسے بہتے ہیں اور بارش تھمنے کے بعد جوہڑ اور تالاب کیسے وجود میں آتے ہیں؟ غریب علاقوں کے طلبہ، نمازیوں اور راہگیروں کو کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ یہ سب کچھ آپ کو ایک بار دل ہی دل میں دہرانا ہوگا تا کہ آپ کی تحریر کسی حوالے سے تشنہ نہ رہ جائے۔

۳- حافظے کو آواز دے کر طبعی مناظر تازہ کرنے کے بعد آپ کو یہ دیکھنا ہوگا کہ آپ کا موضوع جس شعبے سے تعلق رکھتا ہے، اس کے متعلق مزید معلومات کن کتب ورسائل، نیٹ یا انسائیکلو پیڈیاز سے دستیاب ہوسکتی ہیں تا کہ کام کی جاندار معلومات اور قابل وثوق اعداد وشمار جمع کر کے اپنی تحریر میں استناد پیدا کر سکیں۔ مثلاً: آپ کے شہر میں بارش کا سابقہ ریکارڈ کیا ہے؟ بارش کے بعد کی صورتحال سے نمٹنے کے لیے آپ کی بلدیہ کو کون سی سہولتیں دستیاب ہیں؟ آپ کے شہر کے ناظم نے برسات کا موسم شروع ہونے سے پہلے کیا کیا وعدے کیے تھے؟ کون سے پورے ہوئے اور کون سے دھرے کے دھرے رہ گئے؟ آئندہ مزید کتنے دنوں تک بارش کا امکان ہے اور اُس سے کیا کیا مسائل پیدا ہو سکتے ہیں؟ ان مسائل کے حل کے لیے آپ کون سی کارآمد تجاویز دینا چاہتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

٤-سوچ وبچار اور مطالعے کے دوران جو کچھ ذہن میں آتا جائے، اسے ذہن میں ہی عقلی ومنطقی ترتیب دیتے جائیے۔ برسات کے دن کی مثال دی جاچکی ہے۔اسے سامنے رکھیے۔ پھر ان اشارات کی مدد سے ایک خاکہ تیار کرنے کی کوشش کیجیے۔ منطقی ترتیب سے مراد کسی چیز کے وجود کے قدرتی مراحل بھی ہوتے ہیں اور اہمیت کے اعتبار سے اہم فالاہم عناصر بھی مراد ہوتے ہیں۔ مثلاً: اگر آپ کپاس کے پودے کے فوائد پر لکھ رہے ہیں تو پہلے روئی کے فوائد، پھر بیج کے مصارف

اور آخر میں اس کے پھوک یا لکڑی کے کام میں آنے کی مختلف صورتیں جمع کر کے ترتیب دینی ہوں گی۔

۵- اب آپ کے پاس چند عناصر اور ان کے متعلق کچھ اشارات جمع ہو گئے ہوں گے۔ مثلاً زیتون کے پتے، پھل اور لکڑی کے فوائد یہ عناصر ہیں اور ہر ایک کے کام میں آنے کی مختلف صورتیں اشارات ہیں۔ ان کو ترتیب وار حسب حیثیت واہمیت تفصیل سے لکھتے جائیں۔ ساتھ میں مزید نکات سوچتے اور ڈھونڈتے جائیں۔ سوچتے جائیں اور ترتیب سے لکھتے جائیں۔ آپ خود کو ایک قدرتی اور فطری شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے پائیں گے۔

٦- جب نئے عنصر کے لیے نیا پیرا شروع کریں تو اس کی ابتدا میں ایسا لفظ لائیں جس سے ربط اور تسلسل کا اظہار ہوتا اور ہر پیرا خوبصورت ہار کی متناسب کڑی محسوس ہو۔ مثلاً ان الفاظ میں سے کسی لفظ سے نیا پیرا شروع کیجیے: جیسا کہ، اسی طرح، یہ بات بھی ہے، واضح رہے، یاد رہے، وغیرہ وغیرہ۔

۷- مختلف عناصر کی تشریح کرتے وقت (یا دوسرے لفظوں میں مختلف پیرے لکھتے وقت) قاری کے ذوق کی تسکین کے لیے اپنی یادداشت یا بیاض میں سے پسندیدہ الفاظ وتراکیب، مترادفات ومتضادات اور حسب موقع محاورات وضرب الامثال اور اچھی اچھی تشبیہات واستعارات کے ذریعے زبان وبیان کے چٹخارے اور اچار چٹنی کا اہتمام کرتے رہیں تاکہ آپ کی تحریر میں دلچسپ معلومات کے ساتھ عمدہ اسلوب بھی موجود ہو۔ پڑھنے والے کو کسی طرح کی تشنگی کا احساس ہو، نہ وہ مضمون ختم ہونے تک آپ کے قلم کی گرفت سے نکل سکے۔

ان غلطیوں سے بچیے:

عام طور پر نو آموز لکھاری مضمون نویسی کے دوران درج ذیل غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تحریر میں نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ ان خامیوں سے بچنے کی کوشش کیجیے:

۱- سب سے پہلی چیز قواعد (یعنی صرف نحو) اور املا کے اصول سے غفلت یا تساہل ہے۔ ایسی غلطیاں بہت برا تاثر چھوڑتی ہیں۔ خاص کر مذکر مؤنث اور واحد جمع کی غلطیاں یا کسی مشہور

لفظ کو اس کی صحیح شکل کے مطابق نہ لکھنا پڑھنے والے پر بہت گراں گزرتا ہے۔ اس لیے زبان کے قواعد پر دسترس حاصل کیجیے اور لفظوں کے شوشے اور جوڑ وغیرہ پورے اور صحیح لگائیے۔ اس کتاب کے پہلے باب میں قواعد اور دوسرا میں املا کے اصولوں پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

۲- موضوع کے دائرے سے نکل جانا یا اس کے بعض اہم اجزا پر کچھ نہ لکھنا، یہ دونوں باتیں افراط تفریط کے زمرے میں آتی ہیں۔ لہٰذا موضوع سے باہر نہ جائیے اور اس کے دائرے میں آنے والے کسی اہم جز سے صرف نظر نہ کیجیے۔

۳- کسی لفظ کو بار بار لانا یا کسی بات کو دہرا دہرا کر ذکر کرنا بہت بری عادت ہے۔ یاد رکھیے! تقریر ہو یا تحریر بغیر کسی خاص وجہ کے تکرار کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ الفاظ کے تکرار سے بچنے کے لیے مترادفات کا استعمال کیجیے۔ اسم ظاہر کو دوسری مرتبہ لانا ہو تو نام دوبارہ لانے کے بجائے ضمیر دوبارہ لائیے۔ مثلاً: جب آپ کہنا چاہیں: ''سمندر کے بہت سے فوائد ہیں۔ اس کی آبی حیات خشکی میں رہنے والوں کے لیے بہترین غذا ہے۔'' تو یوں نہ کہیں ''سمندر کی آبی حیات.....'' سمندر کے لفظ کی جگہ اسم ضمیر ''اس'' لے آئیے۔ معانی اور مفاہیم کے تکرار سے بچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ عناصر اور اشارات کی عقلی منطقی مربوط ترتیب کے مطابق مضمون کو لے کر چلیے۔ اشارات چونکہ مرتب اور غیر مکرر ہیں، اس لیے اگر آپ ان کے مطابق چلے تو تکرار کی نوبت نہیں آئے گی۔

٤- بہت زیادہ مختصر و مبہم یا زائد اور بلا ضرورت الفاظ کا استعمال دونوں ایسی چیزیں ہیں جن کا قاری کے لاشعور پر بہر حال منفی اثر پڑتا ہے۔ لہٰذا تحریر لکھنے کے بعد اسے پڑھیے اور پیچیدہ یا مبہم تراکیب کو چن چن کر آسان اور عام فہم تعبیرات سے بدل دیجیے۔ نیز جو بات پانچ الفاظ میں کہی جاسکتی ہے، اسے بلا وجہ بڑھا کر آٹھ الفاظ میں کہنے سے گریز کیجیے۔ الغرض جیسے چار پائی کی رسیوں کا بہت زیادہ کسا ہوا ہونا یا بہت زیادہ ڈھیلا ہونا دونوں بیٹھنے والے کے اکرام کے خلاف ہیں، اسی طرح تحریر میں ضرورت سے کم یا زیادہ الفاظ قاری کی طبیعت پر گرانی اور بیزاری کا باعث ہوتے ہیں۔

۵- عامیانہ اور سوقیانہ الفاظ یا رکیک اور بازاری جملوں سے انتہائی سختی کے ساتھ پرہیز کریں۔ وقار کے خلاف یا تہذیب سے گرا ہوا کوئی ایک لفظ بھی تحریر میں آجائے تو وہ ایسا داغ ہوتا

ہے جو مٹائے نہیں مٹتا۔اپنی تحریر کو ایسی چیزوں سے پاک رکھیے۔

٦۔کسی محاورے یا ضرب المثل کا غلط استعمال، کسی حکیمانہ مقولے کو سمجھے بغیر نقل کرنا یا کسی شعر یا مصرعے کو مناسبت کے بغیر تحریر میں شامل کرنا بھی نئے لکھاریوں کی مشہور غلطی ہے۔اس سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایسی کوئی ترکیب، کوئی محاورہ یا مقولہ، کوئی شعر یا مصرعہ نہ درج کیجیے جس کا معنی و مفہوم آپ اچھی طرح نہ جانتے ہوں۔محض کسی تحریر یا تقریر میں دیکھ سن کر، متاثر ہو کر کسی جملے یا شعر کو نقل کرنا اولاً تو علمی روایات کے خلاف ہے۔دوسرے اس میں ہر وقت اس غلطی کا امکان موجود رہتا ہے کہ وہ بے جوڑ اور بے ڈھنگے پن سے استعمال ہو جائے۔لہٰذا جب کوئی تحقیق طلب لفظ یا جملہ سامنے آئے تو لغت دیکھ کر یا اپنے اساتذہ سے پوچھ کر اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کیجیے۔اس کے بعد اسے موقع محل اور سیاق کلام سے مناسبت ملحوظ رکھ کر استعمال کیجیے۔

ایک مشکل کا حل:

نوآموز لکھاریوں کو سب سے بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ مضمون شروع کس طرح کریں؟ تمہید میں کیا باتیں لکھیں؟ تمہید کے بعد آگے کس طرح چلیں؟ چل پڑھنے کے بعد رکاوٹ آ جائے تو کیسے عبور کریں؟اس میں بہت دیر لگ جاتی ہے اور طبیعت گھبرانے اور اکتانے لگتی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا مشورہ تو یہ ہے کہ خواہ کتنی ہی دیر لگے، کتنی ہی طبیعت گھبرائے، ہمت نہ ہاریے، اٹھا کر نہ رکھ دیجیے۔سوچتے رہیے، سوچتے رہیے۔قلم ہاتھ میں تھام کر سوچنا خیالات وارد ہونے کی مؤثر تدبیر مانی جاتی ہے۔سوچنے کا طریقہ یہ ہے کہ عموماً مضمون کسی چیز کے تعارف یا فوائد پر (یا دونوں پر) لکھا جاتا ہے۔ان دونوں کے حوالے سے سوچنے اور لکھنے کا طریقہ یہ ہے:

بیانیہ مضمون لکھنے کا طریقہ:

اگر آپ نے کسی چیز کے تعارف پر مضمون لکھنا ہو تو یوں تصور کیجیے کہ گویا وہ چیز آپ کے آنکھوں کے سامنے ہے اور آپ اس کے ایک ایک جز کو کسی ایسے انسان سے متعارف کروا رہے ہیں جس نے اس کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔اس کے لیے ضروری ہوگا کہ آپ مضمون یا گفتگو کی ابتدا عمومی وصف سے کریں

جس سے اس چیز کی حقیقت، ہیئت اور عمومی تعارف بیان ہو جائے۔ مثلاً: وہ ہاتھی کی طرح بھاری بھرکم ہے یا اونٹ کی طرح لمبی سنکوی۔ زرّافے کی طرح لمبی ہے یا چھوٹے قد والی بکری کی طرح پستہ قد۔ اسی طرح سے آپ اس کا مزاج، عادات اور انفرادی خصوصیات گنوائیں گے۔ یہ پہلا مرحلہ ہوا۔ اس کے بعد آپ اس کے اجزا میں سے ایک ایک جز کو فطری اور طبعی ترتیب کے مطابق باری باری لے کر باریک بینی سے ایک ایک کا حال بیان کرتے جائیں۔ مثلاً اونٹ کے بارے میں آپ کہیں گے کہ یہ ایک حیوان ہے۔ جو اونچا لمبا، ٹیڑھا میڑھا ہوتا ہے۔ پھر آپ اس کی کھال کا رنگ اور اس پر پائے جانے والا اون بیان کریں گے کیونکہ وہ پورے جسم پر محیط ہے۔ اس کے بعد آپ اجزا کی طرف منتقل ہو جائیں گے۔ اس مرحلے میں سب سے پہلے آپ اس کا سر اور جو کچھ سر میں ہے کا تعارف کرائیں گے۔ پھر گردن، پھر کوہان، پھر ٹانگیں اور کُھر اور آخر میں دُم کو بیان کریں گے۔ اگر کھجور کے درخت پر لکھنا ہے تو آپ اس کا عمومی تعارف کروائیں گے کہ وہ ایک درخت ہے۔ پھر آپ اس کی لمبائی اور عمر بیان کریں گے۔ اس کے بعد اجزا کی طرف آجائیں گے تو جڑ سے شروع کریں گے۔ اس کے بعد تنا اور آخر میں اوپر کا تاج جس میں شاخیں، خوشے اور گچھے شامل ہوتے ہیں۔ اس دوران ایک گُر کی بات یہ ہے کہ آپ موقع کی مناسبت سے تشبیہات کا برمحل استعمال کریں۔ مثلاً صاف شفاف پانی کو خالص چاندی سے، نیلگوں پانی کو آسمان سے، چراغوں کو ستاروں سے، جہاز کو باز سے، درخت کو چھتری سے، سورج کی شعاؤں کو سونے کے دھاگوں سے اور بارش کے قطروں کو بکھرے موتیوں سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔

فوائدی مضمون لکھنے کا طریقہ:

اگر آپ نے کسی چیز کے فوائد پر لکھنا ہے تو پہلا اصول یہ ہے کہ آپ اس کے تمام فوائد کی اہمیت کے اعتبار سے ترتیب وار فہرست بنائیں۔ اس دوران خیال رکھیں کوئی اہم فائدہ رہ نہ جائے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے آپ سے پوچھیں کہ یہ چیز مختلف لوگوں اور مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے کس طرح مفید ہے؟ مثلاً: ایک کاشتکار، کارخانہ دار، تاجر کے لیے اس کا کیا فائدہ ہے؟ یا گھروں، مدرسوں، اسپتالوں میں اس کا کیا استعمال ہے وغیرہ وغیرہ۔ دوسرا اصول یہ ہے آپ جب کوئی فائدہ ذکر کریں تو اس کا متضاد بھی ضرور تحریر کریں مثلاً جب آپ کہیں کہ مدارس دینی تعلیم وتربیت کے مراکز اور دین کا آخری مورچہ ہیں تو آپ ضرور یہ بیان کریں کہ اگر یہ نہ

ہوتے تو عام آدمی کو کلمہ سکھانے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔ لوگ نماز روزے سے بھی ناآشنا ہوتے اور اگلی نسل میں اسلام کا نام رہ جاتا، نشان ڈھونڈے سے بھی نہ ملتا۔

اسی طرح جب آپ کہیں کہ علمِ تصوف دراصل علم تہذیب الاخلاق ہے جو انسان کے اندر اخلاقِ نبوی پیدا کرتا ہے تو آپ ضرور یہ کہیں کہ جن لوگوں کی باطنی تربیت نہیں ہوتی وہ اخلاقِ حسنہ کے بجائے اخلاقِ رزیلہ میں گرفتار ہوتے ہیں۔ ان میں حلم وتحمل کی جگہ غیظ وغضب، تواضع کی جگہ تکبر اور ایثار واکرام کی جگہ حسد وبغض پایا جاتا ہے۔ اس سے تعمیرِ سیرت کی بنیادیں مخدوش ہوجاتی ہیں اور معاشرے میں حسنِ کردار کے بجائے بدخلقی ڈیرہ جمالیتی ہے۔

ان اصولوں پر عمل کرنے سے آپ کے سامنے سوچ وفکر کی راہیں کھل جائیں گی اور بات سے بات نکل کر مربوط تحریر وجود میں آتی جائے گی۔

مضمون شروع ہوجانے کے بعد درمیان میں بھی طبیعت اُچاٹ ہونے لگتی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھیں؟ ایسی صورت میں اگر ذہن پر زیادہ زور ڈالنے کے باوجود کچھ سمجھ نہ آئے تو اُٹھا کر رکھ دیجیے، پھر کسی وقت لکھنے بیٹھیے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اب کوئی بات ضرور ذہن میں آئے گی۔ اگر لکھتے لکھتے پھر اُکتاہٹ ہونے لگے تو پھر اُٹھا کر رکھ دیجیے، پھر کسی اور وقت لے کر بیٹھیے گا۔

خلاصہ یہ کہ پورا مضمون ایک نشست میں مکمل کرنے کی فکر ہرگز نہ کیجیے۔ مختلف نشستوں میں لکھا گیا مضمون بعض اوقات زیادہ بہتر ہوتا ہے، کیونکہ ہر بار دل ودماغ تروتازہ ہونے کی وجہ سے ذہن میں نئی نئی باتیں آتی ہیں۔

یاد رکھیے! تنہائی اور سکون کا ماحول مہیا کرنے، دل ہی دل میں ذکر ودعا کرنے اور وقفے وقفے سے سوچنے سے ذہن خوب ساتھ دیتا ہے۔ اگر مضمون لکھتے وقت باوضو ہوں اور ہر روز ایک مرتبہ صلوٰۃ الحاجت کا اہتمام کرلیا جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت اور کاموں میں غیبی برکت پیدا ہوجاتی ہے۔ آخر شب میں اٹھ کر قیام اللیل کا اہتمام کرلینے سے قدرت کے غیبی خزانوں سے اپنا دامن بھرنے کا وسیلہ ہاتھ آجاتا ہے۔ اب آپ لپ بھر کے لیتے ہیں یا جھولی بھر کے، یہ آپ کے رونے دھونے کی کیفیت پر منحصر ہے۔

مضمون نگاری کی مشق

مضمون چند پیروں سے مل کر بنتا ہے اس لیے ''مضمون نگاری'' کی مشق سے پہلے ''پیرا نگاری'' کی مشق ضروری ہے۔ اگر آپ پیرا لکھنے کا اصول سمجھ کر اس کی مشق کرلیں گے تو آپ کے لیے مضمون لکھنا کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ

پیرا لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ جس چیز کے متعلق لکھ رہے ہیں اس کی حقیقت و ماہیت، شکل وصورت اور اجزا وعناصر کو ترتیب سے سوچیں۔ پھر ہر ایک پر ایک ایک دو دو سطریں لکھتے جائیں۔ پانچ سے سات سطروں تک پہنچیں گے تو پیرا خود بخود مکمل ہو جائے گا۔

مثلاً آپ نے قلم یا کتاب پر پیرا (چھوٹا سا مضمون) لکھنا ہے تو آپ کے عناصر یہ ہوں گے:

قلم: (۱) آلہ تحریر (۲) لکڑی، دھات یا پلاسٹک سے بناوٹ (۳) لوح وقلم، قدیم وجدید اقسام۔

کتاب: (۱) دو گتوں کے درمیان مجموعۂ اوراق (۲) علمی وابلاغی حیثیت واہمیت (۳) پہلا صحیفہ اور آخری کتاب۔

آپ ترتیب وار ان عناصر کو لیجیے اور ہر ایک پر دو دو سطریں لکھیے۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کو پتا بھی نہیں چلا اور پیرا مکمل ہو گیا۔ اس طرح کے پیرے آپ کاغذ یا عینک، پودے اور پھول، درخت اور پھل، لکڑی یا لوہے یا لکڑی کے گھوڑے اور ٹین کے بندر پر بھی لکھ سکتے ہیں۔

پیرے لکھنے کی مشق کے بعد آیئے مضمون نگاری کی مشق کا آغاز اللہ کے پاک نام سے کرتے ہیں جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔

مشق

۱-مضمون سیکھنے کے لیے دو اہم ہدایات کون سی ہیں؟
۲-مضمون نویسی کے سات اصولوں کا خلاصہ مختصر اتحریر کریں۔
۳-مضمون نویسی میں جن غلطیوں سے بچنا چاہیے، نکتہ وار لکھیں۔
٤-مضمون کی اقسام لکھیں۔
۵-کسی بھی جامع موضوع پر ایک عدد مفید اور جامع مضمون تحریر فرمائیں۔

مضمون نگاری کی مشق کا پہلا طریقہ: تطبیقی خاکے

کہانی لکھنے کی مشق کی طرح مضمون نگاری کی مشق کے بھی تین طریقے ہیں۔ ہم آپ کو باری باری ان سے گزارتے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ ذیل میں خاکوں کی مدد سے لکھے گئے چند مضامین دیے گئے ہیں۔ ہر خاکہ چند عناصر اور اشارات پر مشتمل ہے۔ عناصر دراصل ایک پیرے کا عنوان ہیں اور قوسین میں دیے گئے اشارات وہ نکات ہیں جن کے درمیان کی خالی جگہ بھر کر پیرا مکمل کیا گیا ہے۔ آپ عناصر و اشارات کی مدد سے بطورِ مثال لکھے گئے مضمون کو غور سے پڑھیے اور ہر مضمون کے بعد دیے گئے ''جڑواں مضمون'' کے خاکے کو سامنے رکھ کر اچھا سا ''تطبیقی مضمون'' لکھ کر دکھائیے۔

ٹھنڈی رات میں ایک سفر

عناصر و اشارات:

۱-سفر کی وجہ (دوست کو ضروری کام پیش آجانا... ہنگامی حالت میں تیاری)

۲-ریل میں مسافر کی حالت زار (ٹھنڈی ہوائیں... ویران فاصلے... انجن اور پہیوں کا شور و شغب... گرم کپڑوں اور گرم مشروبات کی عدم دستیابی)

۳- اترنے کے بعد پیش آنے والی مشکلات (ہواؤں کے جھکڑ اور موسلا دھار بارش، منزل تک پہنچنے کی تگ ودو)

٤- بخیریت رسائی اور سفر کی تھکان (مشکلات سے نمٹتے ہوئے منزل تک رسائی اور سفر کے متعلق مسافر کے احساسات و تاثرات)

☆...☆...☆

ایک مرتبہ مجھے ہنگامی حالت میں ایک دوست کی خاطر راتوں رات سفر کرنا پڑ گیا۔ مطلوبہ منزل کافی دور دراز فاصلے پر دیہات میں واقع تھی۔ دوست قریبی تھا اور اس کا کام ضروری تھا۔ میں نے کھڑے کھڑے سفر کی تیاری کی اور سر شام ریل پر سوار ہو گیا۔ سردی اپنے جوبن پر تھی اور ایک یخ بستہ رات ہماری منتظر تھی۔ ریل آہستہ آہستہ روانہ ہوئی۔ پھر رفتہ رفتہ رفتار پکڑتی گئی یہاں تک کہ تیز ہوا کے جھونکے کی طرح گویا پرواز کرنے لگی۔ اس کے انجن کی گرجدار آواز اور وقفے وقفے سے بجتی ہوئی سیٹی دور تک سنائی دیتی تھی۔ پٹری پر تیزی سے گھومتے ہوئے اس کے بڑے بڑے آہنی پہیے اور ان پہیوں پر ہچکولے لیتے ہوئے ڈبے مخصوص ردھم سے ہمیں جھلاتے جا رہے تھے۔

رات سرد اور خاموش تھی۔ کھڑکی کے باہر ویرانی اور افسردگی تھی۔ ہواؤں کے جھکڑ اس اداسی میں اضافہ کر رہے تھے۔ تیز ہوا سے اڑنے والی مٹی کھڑکی کے راستے آنکھوں اور ناک میں گھسا جا رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر کھڑکیاں بند کر دیں۔ مٹی کے ذرات نے آ کر چہرے میں سوئیاں چبھونی تو بند کر دیں، لیکن سوراخوں سے راستہ بنا کر گھستی سرد ہوا کے آگے کوئی روک لگانا ممکن نہ تھا۔ ہوا کے جھونکے برفیلے خنجروں کی طرح جسم کو چیرتے ہوئے اندر گھس رہے تھے۔ ہاتھ، پاؤں اور کان تو یوں ٹھنڈے ہو کر سن ہو گئے تھے گویا جسم کا حصہ نہیں رہے۔ ہڈیاں برف کی بے جان و بے حس سلاخوں کی طرح معلوم ہو رہی تھیں۔ جب ریل کہیں رکتی تو میں سہمی سہمی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتا کہ کہیں کوئی چڑھ یا اتر تو نہیں رہا، کیونکہ ہر نئے آنے یا جانے والے کے ساتھ دروازہ کھلتے ہی تیز ٹھنڈی ہوا سردی کی ایک نئی لہر لے کر آتی اور سینے کی ہڈیوں میں یوں اترتی گویا آج انہیں گلا کر چھوڑے گی۔ نہ میں نے گرم کپڑے ساتھ لیے تھے اور نہ کوئی گرم مشروبات بیچنے والا آ جا رہا تھا۔ گہری ہوتی رات میں بڑھتی ہوئی قاتل سردی کا کوئی علاج نہ ہونے کی وجہ سے آنکھ لگتے

ہی کھل جاتی تھی اور کسی پل چین نہ آتا تھا۔

رات کا آخری پہر تھا جب ریل میری مطلوبہ منزل پر رکی۔ میں نے دستی سامان ہاتھ میں لیا اور سہا سمٹا ہوا اترا۔ ہواؤں کے جھکڑ بدستور چل رہے تھے اور ان کے تیور خطرناک تھے۔ میں چاہتا تھا کہ گرم چائے کی ایک آدھ پیالی جسم میں انڈیل لوں۔ تب تک صبح کی روشنی نمودار ہو جائے گی اور آگے کے سفر کی ہمت بھی پیدا ہو جائے گی۔ آخری رات کا وقت یوں بھی اللہ پاک کو یاد کرنے کے لیے غنیمت تھا۔ میں چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے دل ہی دل میں تسبیحات کرتا رہا۔ صبح کی پو پھوٹتے ہی اسٹیشن پر زندگی اور حرکت کے اکا دکا آثار نظر آنے لگے تھے۔ ہواؤں کا زور بھی تھم چکا تھا۔ میں نے فجر کی نماز ادا کی اور کسی گاڑی کی جستجو میں اسٹیشن سے نکلا جو آگے کے سفر میں میری ہم رکاب ہو سکے۔ قدرے تگ ودو کے بعد پرانے وقتوں کی یادگار ایک ٹیکسی ہاتھ لگی جس کو چلانے والے بڑے میاں بھی گزرے زمانے کی یادگار اور سحری کا چراغ معلوم ہوتے تھے۔ تھوڑی سی ردّ و قدح کے بعد وہ مجھے لے چلنے پر آمادہ ہو گئے، مگر لگتا تھا آج موسم کوئی رعایت دینے پر تیار نہیں۔ وہ سفر کے اختتام پر بھی اپنا زور دکھا کر رخصت کرنا چاہتا ہے۔ بوندا باندی شروع ہو گئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش نے آسمان اور زمین کے بیچ میں پانی کی چادر تان لی۔ اب اوپر سے پانی کا فوارہ برس رہا تھا اور نیچے گلیاں سڑکیں ندی نالیاں بن چکی تھیں۔

وہ تو خیر گذری کہ بڑے میاں علاقے کے آشنا اور گلی محلے سے اچھی طرح واقف تھے، ورنہ ایک مرتبہ اگر ان کی موٹر کار کھڑی ہو جاتی تو اس میں دوبارہ زندگی کی حرارت لوٹاتے لوٹاتے نجانے ہمارا کیا حشر ہوتا۔ میں جب اپنے دوست کے دروازے پر اترا تو جسم پر کپکپی طاری تھی۔ دانت بج رہے تھے اور ٹھنڈی رات کی جان لیوا تھکن رگ رگ میں اتر چکی تھی۔ اگر اللہ کی رضا کی نیت اور اپنے مخلص دوست کے کام آنے کی خوشی نہ ہوتی تو اس سفر نے تو مجھے ہلکان ہی کر دیا تھا۔

مشقِ تطبیق

مشقِ تطبیق کا طریقِ کار یاد رکھیے۔ آپ نے کرنا یہ ہے کہ اشارات کی کڑیاں جوڑ کر پیرا ترتیب دیں اور پھر پیروں کو ایک دوسرے کے آگے پیچھے رکھتے ہوئے اپنی منزل تک جا پہنچیں۔

گرم دن میں ایک سفر

اب آپ نیچے دیے گئے اشارات کی مدد سے تیز گرمی میں کیے گئے ریل یا بس کے سفر کا احوال تحریر کیجیے:

١- سفر کی وجہ اور آغاز (گھر سے فوری طلبی، بھاگم بھاگ روانگی، ٹکٹ کے حصول میں مشکلات)

٢- ریل کے ڈبے یا بس کا منظر (مسافروں کا رش، گرمی اور حبس، گرد و غبار اور گرم ہوا)

٣- مسافر کی حالت زار (بہتا پسینہ، دم گھٹا سینہ، ٹھنڈے مشروبات، طرح طرح کی آوازیں، پنکھے اور گیلے رومال)

٤- منزل تک رسائی اور طبیعت پر سفر کے آثار (باعافیت رسائی پر اظہار تشکر، رضا بالقضا اور تصحیحِ نیت)

کپاس کا پودا

تعارف اور فوائد

عناصر و اشارات:

تعارف: کاشت کا موسم اور طریقہ۔ نشو و نما کے مراحل۔ کلی اور ڈوڈا۔ روئی کا گولہ۔

فوائد: ١- زرمبادلہ کمانے کا ذریعہ ٢- کپڑے اور استعمالی اشیا۔ ٣- صاف روئی کا طب میں استعمال۔

٤- بیج کے مختلف مصارف۔ ٥- لکڑی کے استعمالات۔

کپاس کا پودا اپنی زندگی کی ابتدا میں چھوٹے سے کالے بیج کی شکل میں ہوتا ہے۔ کسان زمین جوتنے اور تیار کرنے کے بعد اسے زمین میں بو دیتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد زمین سے چھوٹی سی کونپل پھوٹتی ہے۔ اس میں دو ننھے منے سبز پتے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ بڑھتی ہے۔ ساتھ ساتھ کسان کی توجہ اور محنت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ پانی دیتا، طفیلی گھاس پھوس ختم

کرنے کے لیے گوڈی کرتا اور کیڑوں سے بچانے کے لیے دوائیاں چھڑکتا رہتا ہے۔ جب پودے کا تنا جان پکڑتا اور شاخیں نکالتا ہے تو ایک چھوٹی سی کلی چند سبز پتوں کے جلو میں مسکراتی ہوئی نمودار ہوتی ہے۔ پھر پودا بڑا ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ لہلہاتا ہوا ایک میٹر یا کچھ زیادہ تک جا پہنچتا ہے۔اس موقع پر کلی سوکھ جاتی ہے اور اس کے نیچے سے لیموں جتنا روئی کا ڈوڈا سر نکالتا ہے۔ پھر کلی اپنا کام پورا کر کے گر جاتی ہے اور ڈوڈے کا حجم بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔آہستہ آہستہ اس کا رنگ سبز سے مٹیالے کی طرف حائل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جب وہ اچھی طرح پک جاتا ہے تو پھٹ کر سکڑ جاتا ہے اور اندر سے نرم و ملائم روئی جھانکنے لگ جاتی ہے۔ اسے دیکھ کر کسان کا دل شکر سے لبریز ہو جاتا ہے اور خوشی اور امید سے بھر جاتا ہے۔ وقت آنے پر وہ اسے چن کر ڈھیر لگاتا ہے اور بوریوں میں بھر بھر کر منڈی جا کر بیچ ڈالتا ہے۔

یہ ہے کپاس کے پودے کی داستانِ حیات۔اسے اللہ تعالیٰ نے ہماری آمدنی اور معیشت کی ترقی کا اہم ذریعہ بنایا ہے۔ بیج فروش ہو یا کاشت کار، کارخانے دار ہو یا مزدور، سب اس فصل کے اچھا ہونے اور کیڑوں سے بچنے کی دعا کرتے ہیں کیونکہ سب کو اسی وسیلے سے رزق ملتا ہے۔ خوشحالی آتی ہے اور ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ بے روزگاری ختم ہوتی ہے اور زرمبادلہ میں اضافہ ہوتا ہے۔

اسی پودے کی پیداوار سے کپڑے اور ملبوسات بنتے ہیں جو ہر عام و خاص کی ضرورت ہیں۔ تکیے اور گدّے ہوں یا چادریں اور لحاف، کون سی چیز ہے جو اس نرم و نازک روئی سے نہیں بنتی۔

اسی سے زخموں کی صفائی میں استعمال ہونے والی روئی اور ٹوٹی ہڈی کو باندھنے کے لیے درکار پٹی بنتی ہے۔ صحت و صفائی کے مختلف کاموں میں روئی قدرت کی ایک نعمت ہے۔ روئی کے بیج سے بنولے کا تیل نکالا جاتا ہے۔ اس سے صابن بنتا ہے اور کھانے میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ تیل نکالنے کے بعد بچا ہوا فضلہ مویشیوں کی بہترین غذا ہے۔ اس سے ان کا جسم بھی پلتا ہے اور دودھ بھی خوب آتا ہے۔

اس سب کچھ کے بعد آخر میں پودے کی سوکھی لکڑی رہ جاتی ہے۔ یہ بھی ضائع نہیں جاتی۔ اسے کھانا پکانے کیلیے سستے ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ پانی گرم کر کے نہانے اور کپڑے دھونے میں آسانی رہتی ہے۔ الغرض کپاس کا پودا ہمارے لیے قدرت کی نعمت اور اس کا

احسان ہے۔

مشقِ تطبیق

گنے کا پودا

اب آپ ذیل میں دیے گئے عناصر واشارات کی مدد سے گنے کی فصل پر چار سے پانچ پیروں پر مشتمل ویسا ہی مضمون لکھیے جیسا کہ اوپر آپ نے کپاس کے بارے میں پڑھا۔

عناصر:

تعارف اور فوائد

اشارات:

تعارف: (۱) بوائی کا طریقہ۔ لمبا اور پتلا تنا۔ تنے کی گانٹھیں اور مختلف رنگ (۲) پتوں کی سرسبزی اور تیز دھار۔

(۳) سفید اور نرم گودا۔ جس میں قدرت نے رس کے پیپے بھر دیے ہیں۔

فوائد: (۱) مختلف استعمالات: گنڈیریاں، رس، شکر، گڑ، مٹھائیاں اور حلوہ جات۔ خوشی کا استعارہ (۲) پتے جانوروں کی مرغوب غذا۔

(۳) فضلہ اور پھوک: کار آمد ایندھن، گتے اور مختلف اقسام کے بورڈ کی تیاری۔

مشق کا دوسرا طریقہ: اشارتی خاکے

درج ذیل اشارات کی مدد سے مضمون لکھیے اور اصلاح کے لیے اپنے استاد صاحب کو دکھائیے:

بجلی کے فوائد: ۱- روشنی فراہم کرتی ہے ۲- مشینیں اور کارخانے چلاتی ہے ۳- ابلاغ وترسیل کے آلات کو متحرک رکھتی ہے۔ ٤- گھریلو استعمال کی مختلف چیزیں اسی پر منحصر ہیں ۵- صحت اور امنِ عامہ میں اس کا عمل دخل۔ ٦- بجلی جانے سے پیدا ہونے والی مشکلات

درخت کے فوائد: ۱- آب وہوا کو صاف وصحت بخش اور ماحول کو خوشگوار بناتے ہیں۔

۲- گرمی میں کمی لاتے اور موسم میں میں اعتدال پیدا کرتے ہیں۔

۳-گھر، سڑک اور شہر کی قدرتی سجاوٹ کا کام دیتے ہیں۔

٤-ان سے پھل پھول حاصل ہوتے ہیں۔(یہاں پھلوں اور پھولوں کے مختصر فوائد لکھ دیجیے)

۵-ان کے پتوں سے کاغذ جیسی قیمتی چیز بنتی ہے۔لکڑی سے مختلف کام لیے جاتے ہیں۔گوند اور ربڑ بھی انہی سے حاصل ہوتی ہے۔

مشق کا تیسرا طریقہ: مشقی خاکے

اب آپ پٹرول اور سمندر کے فوائد کے لیے خود سے اشارات ترتیب دیجیے اور ان کی مدد سے دو مضمون لکھنے کی کوشش کیجیے۔یادرکھیے! اشارات ہمیشہ عقلی و منطقی ترتیب کے مطابق سوچ کر مرتب کیے جاتے ہیں۔اشارات کو پھیلایا جائے تو مضمون بن جاتا ہے اور مضمون کو سمیٹا جائے تو اشارات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔بس اس اصول کے تحت آپ مضمون نویسی کی مشق جاری رکھیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو حسنِ نیت اور حسنِ عمل کی دولت سے نوازے۔

مشق

۱-کہانی کی اہمیت دور حاضر میں اس کی نافعیت تحریر کریں۔

۲-اپنے ساتھ بیتا کوئی یادگار واقعہ تحریر کریں۔

۳-اپنی کوئی سفری روداد لکھیے اور لکھنے سے پہلے اس کا تحریری خاکہ مرتب کیجیے۔

٤-کہانی اور مضمون کے دو دو خاکے بنا کر خاکہ سازی کی مشق کریں۔

۵-عنوان ''کہانی نویسی'' سے اب تک جو نئے ضوابط آپ کے علم آئے، درج کریں۔

کالم نگاری

جدید صحافت میں کالم کو انتہائی اہمیت حاصل ہے۔ اردو صحافت کی تاریخ کے سرسری جائزہ سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ جن نامور ادیبوں نے صحافت میں اہم کردار ادا کیا ہے، ان میں سے بیشتر کالم نویس کے طور پر ہی معروف ہوئے۔

تعریف:

"کالم" کے لغوی معنی قطار، کھمبا، ستون، مینار اور "صفحے کا حصہ" ہیں۔ انگریزی میں یہ لفظ فوج سے آیا ہے۔ فوج کے ایک نظم کے ساتھ کھڑے ہونے یا چلنے کو "کالم" کہا جاتا ہے۔

صحافتی اصطلاح میں کالم کا لفظ اخبار میں شائع ہونے والی ان تحریروں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو کسی مستقل عنوان کے تحت کالم نویس کے نام کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں۔ اخبار کے صفحات پر کسی اشتہار، خبر یا مضمون کی جگہ کی پیمائش بھی کالم، انچ یا سینٹی میٹر کے حساب سے کی جاتی ہے۔ اخبار میں تحریریں عموماً قارئین کی سہولت کے لیے آٹھ مختلف حصوں میں تقسیم کر کے شائع کی جاتی ہیں۔ ان میں سے ہر حصے کو "کالم" کا نام دیا جاتا ہے۔

کالم کے حوالے سے اخبارات میں اتنی مختلف تحریریں شائع ہوتی ہیں کہ صحافت کی دنیا میں عام طور پر کہا جاتا ہے ان کے لیے کوئی ایک تعریف متعین کرنا آسان نہیں ہے، لیکن غور کیا جائے تو کالم کی تعریف کچھ ایسی مشکل بھی نہیں ہے۔

"انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا" میں کالم کی تعریف کچھ یوں کی گئی ہے: "اخبار یا رسالے میں لکھنے والے کے نام کے ساتھ ایک مستقل عنوان کے تحت باقاعدگی سے شائع ہونے والی ایسی تحریر کو کالم کہتے ہیں جو تازہ حالات و واقعات پر اظہار خیال کے لیے وقف ہوتی ہے۔"

اب ظاہر ہے کہ "اخبار یا لکھنے والے نام کے ساتھ مستقل عنوان کے تحت باقاعدگی سے شائع ہونا" کالم کی تعریف کے لازمی جز نہیں۔ کالم رسالے میں بھی شائع ہو سکتا ہے، بغیر کسی مستقل

عنوان کے بھی لکھا جاسکتا ہے، اس کا لکھنے والا گمنام بھی ہوسکتا ہے اور اس کی اشاعت بے قاعدہ اور غیر مسلسل بھی ہوسکتی ہے۔ لہٰذا ان قیود کو حذف کر کے کہا جاسکتا ہے کہ:

''کالم ایسی تحریر ہے جس میں تازہ حالات وواقعات پر اظہار خیال کیا جائے۔''

کالم کو فیچر کی قسم بھی قرار دیا جاتا ہے اور اداریے کا متبادل بھی۔ کالم مزاحیہ بھی ہوسکتا ہے اور سنجیدہ بھی۔ یہ کسی ایک موضوع پر بھی ہوسکتا ہے اور اس میں مختلف موضوعات، اخلاق وآداب اور دوسرے امور پر ثقیل قسم کی بحث، دلائل، مشورے وغیرہ بھی ہوسکتے ہیں۔

مضمون اور کالم میں فرق:

کوئی ایسا لگا بندھا ضابطہ تو نہیں جو ان دونوں کے درمیان حتمی حد فاصل قائم کر سکے، البتہ اوپر نقل کی گئی تعریف میں ''تازہ حالات وواقعات'' کی قید سے استفادہ کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ مضمون اور کالم میں وہی فرق ہے جو سدا بہار پھول اور موسمی پھولوں میں ہوتا ہے۔ مضمون میں دائمی موضوعات کو موضوع تحریر بنایا جاتا ہے، کالم میں وقتی حوادث کو۔ مضمون میں تحقیق، سنجیدہ بحث اور منطقی استدلال ہوتا ہے جبکہ کالم میں عموماً ہلکے پھلکے عوامی موضوعات، ذاتی تاثرات اور عالمی احوال کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ مضمون میں عموماً تاریخی، ادبی اور تحقیقی موضوعات پیش نظر رکھے جاتے ہیں لہٰذا وہ چھپنے کے بعد بھی باقی رہنے والی چیز ہوتا ہے، جبکہ کالم زیادہ تر ''کرنٹ ایشوز'' پر لکھے جاتے ہیں۔ اس بنا پر کالموں کی عمر کم ہوتی ہے اور وہ ایک وقت کے بعد اپنی افادیت کھو دیتے ہیں۔ البتہ کچھ کالم اپنی جاندار معلومات، باقی رہنے والے پیغام، طنز وظرافت پر مبنی اسلوب یا کسی اور وجہ سے طویل عمر پاجاتے ہیں۔

مضمون اور کالم کے فرق کو اخبارات کے خصوصی صفحات اور ادارتی صفحات میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً جمعہ کے دن اقرأ کے نام سے دینی موضوعات پر مشتمل خصوصی صفحات شائع ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات انہی کی پشت پر ادارتی صفحہ بھی چھپا ہوا ہوتا ہے۔ خصوصی صفحات کی تحریریں عموماً ''مضامین'' کی شکل میں ہوتی ہیں جو سال کے باون ہفتوں میں یا کم از کم اگلے سال اسی ہفتے میں شائع ہوسکتی ہے، جبکہ ادارتی صفحے پر موجود اکثر تحریریں ایک دن گزرنے پر بھی اپنی تازگی کھو بیٹھیں گی اور شاید انہیں اگلے دن بھی نہ لگایا جاسکے۔ اس فرق کو ایک اور مثال سے سمجھیے

اگر آپ ''پردے کی اہمیت'' پر تحریر لکھیں تو وہ مضمون شمار ہوگا، لیکن اگر فرانس یا بیلجیم میں حجاب پر پابندی لگنے پر اپنا تبصرہ لکھیں تو وہ کالم شمار ہوگا۔ ''حب الوطنی: ایک فطری انسانی جذبہ'' کے عنوان سے لکھی گئی تحریر ''مضمون'' ہوگی، جبکہ کسی محب وطن فرد کی طرف سے دی گئی کسی قابلِ ذکر قربانی کا واقعہ سامنے آنے پر اس کو خراج تحسین پیش کرنا ''کالم'' کے زمرے میں آئے گا۔ وعلی هذ القیاس.

کالم کی اقسام:

ماہرین صحافت نے کالم کو دو طرح سے مختلف اقسام میں تقسیم کیا ہے:

پہلی تقسیم:

۱- موضوع:

اس تقسیم میں کسی خاص شعبے، پیشے، مشغلے یا فن کے متعلق لکھے جانے والے کالم شامل ہیں: مثلاً دینی کالم، طبی کالم، قانونی کالم، نفسیاتی کالم، معاشی کالم، کھیل اور خانہ داری وغیرہ کے کالم وغیرہ وغیرہ۔

۲- اسلوب:

اسلوب کے حوالے سے درج ذیل اقسام متعین کی گئی ہیں: مزاحیہ کالم، مکالمتی کالم، مکتوباتی کالم، علامتی کالم یعنی اشارے کنائے اور استعارے ومحاورے میں کوئی بات کر جانا۔

۳- مشاہدہ:

اس کی دو قسمیں ہیں: سفرنامہ اور شہرنامہ۔ پہلے کو سیاحتی کالم اور دوسرے کو ڈائری نما کالم کہتے ہیں۔

دوسری تقسیم:

دُنیا بھر کے اخبارات میں شائع ہونے والے ہزاروں مقبول اور مرغوب کالموں کے جائزے کے بعد مندرجہ ذیل پانچ اقسام زیادہ تسلیم شدہ ہیں۔

۱- رنگ برنگا کالم:

ایسے کالم میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔مختلف النوع موضوعات پر بات کہی جاسکتی ہے۔ جو بھی بات سامنے آئے اُس پر رائے زنی ہوسکتی ہے۔ایسے کالموں کو ''چوں چوں کا مربّہ'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ایسا کالم لکھنے کے لیے کالم نویس کو آئے دن سیکڑوں واقعات مل جاتے ہیں۔سیاسی، معاشی، ثقافتی، علمی، ادبی، غرض کسی بھی موضوع پر وہ روشنی ڈال سکتا ہے۔عموماً چھوٹے اخبارات ایسے رنگ برنگے کالم کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ اس کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ایسے گوناگوں کالم میں لکھنے والے کو کافی آزادی رہتی ہے۔ایک اشاعت میں ایک ہی بات پر مکمل توجہ دی جاسکتی ہے یا دو تین باتوں پر رائے زنی ہوسکتی ہے۔ایسے کالم کی رنگارنگی زیادہ جاذبیت کا باعث ہوسکتی ہے کیونکہ عوام ایک ہی نہج کے کارنامے پڑھنے کے مقابلے میں مختلف باتوں پر اظہارِ رائے کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

۲- ذاتی کالم:

کالم نویس کسی ایک موضوع یا کئی موضوعات پر رائے کا اظہار کرتا ہے مگر تحریر میں انفرادی اہمیت کا عنصر غالب رہتا ہے۔وہ موضوع سے متعلق اپنی گہری معلومات کی مدد سے اطمینان بخش دلائل پیش کرتا ہے۔تفصیل میں کالم نویس کے ذاتی خیالات پر زور ہوتا ہے۔تقریباً ہر معاملہ میں اپنی مہارت کی دھاک بٹھانا ایسے انفرادیت پسند کالم نویسوں کی عادت ہے۔عموماً ایسے کالم نویس کافی تجربہ کار، شہرت یافتہ اور حد درجہ بارسُوخ ہوتے ہیں۔مقتدر اور ذی اثر حلقوں میں بھی ان کے ذاتی خیالات اور نظریات کو وقعت دی جاتی ہے۔ان کے دیے ہوئے مشوروں کو بھی بہت کم نظرانداز کیا جاتا ہے۔ایسے ذاتی مقالوں میں حالاتِ حاضرہ کے اہم پہلوؤں پر بھی توجہ دی جاتی ہے اور دیگر ضروری معاملات کی بھی توضیح ہوتی ہے۔حادثات، انتخابات، طوفان، سیلاب جیسے واقعات پر بھی ذاتی جائزے پیش کیے جاتے ہیں۔نیویارک سے شائع ہونے والے مشہور قدامت پرست اخبار ''دی ہیرالڈ ٹری بیون'' (The Herald Tribun) کی ۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کی اشاعت میں والٹر لپ مین (Walter Lippman) نامی مشہور صحافی نے سب سے پہلا ذاتی کالم شروع کیا تھا۔بڑھتے بڑھتے اس ذاتی کالم کی مقبولیت اتنی بڑھی کہ امریکا کے پانچ سو سے زیادہ اخبارات

بہ یک وقت لپ مین کا کالم بعنوان ''آج اور کل'' (Today and tomorrow) شائع کرتے تھے۔ آج بھی امریکا میں کئی ایسے مقبول کالم نویس ہیں جن کے کالم سیکڑوں اخبارات میں موجود رہتے ہیں۔

۳- مزاحیہ کالم:

نفسیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ دنیا بھر کے انسان رونے بسورنے سے زیادہ خوش وخرم رہنے کے خواہاں ہیں۔ وہ آہیں بھرنے کے بجائے متبسم رہنا چاہتے ہیں۔ آنسو بہانے کے بجائے قہقہے لگانے سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ انسانوں کو ہنسنے ہنسانے کے مواقع بہت کم ملتے ہیں۔ عام طور پر ماحول میں سنجیدگی تو رہتی ہے مگر کبھی کبھار عام مصائب اور مسائل سے فرار کی بھی بڑی اہمیت ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا اخبارات میں ایسے ہلکے پھلکے کالم ہوں جن سے قارئین کو ذرا ہنسی مذاق سے لطف اندوز ہونے کا موقع نصیب ہو جائے تو بہتر ہے۔ ہر معاشرہ میں بخیل، شرابی، زندہ دل، پاگل، شاعر اور خبطی افراد ضرور ہوتے ہیں جن کی حرکات پر نظر رکھ کر دلچسپ مواد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع پر بھی ''مزاحیہ کالم'' تحریر ہو سکتا ہے۔ پرانے چٹکلوں کو نئے لباس میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ طنز و مزاح کی چاشنی کے ساتھ شائع ہونے والے کالموں کے مداح قارئین کا حلقہ وسیع ہوتا ہے۔ اُردو کے مشہور مزاحیہ اخبار ''اودھ پنچ'' کے قلمی معاونین مرزا مچھو بیگ ستم ظریف سے شروع ہو کر حاجی لق لق، شوکت تھانوی، کنھیا لعل کپور سے ہوتے ہوئے عطاء الحق قاسمی اور قاری منصور احمد تک مزاحیہ کالم نویسوں کی ایک اچھی فہرست بن سکتی ہے۔ مزاحیہ کالم تقسیم ہند سے پہلے لاہور سے شائع ہونے والے اردو اخبارات میں کافی مقبول تھے۔ آج ہر زبان کے ہر معیاری اخبار میں کوئی نہ کوئی ہلکا پھلکا کالم روزانہ یا ہفتہ میں ایک بار ضرور شائع ہوتا ہے۔

٤- سینڈیکیٹ کالم:

امریکا اور انگلستان میں خبر رساں ایجنسیوں کی طرح سیکڑوں ایسے ادارے ہیں جو مختلف النوع اخباری مواد مہیا کرتے ہیں۔ تصویریں، مضامین، خاکے، نقشے، فیچر، معمے، ہلکے پھلکے

مضامین، چٹکلے، مشورے، گھریلو نسخے، تبصرے وغیرہ فروخت کرنے والے یہ ادارے ''سینڈیکیٹ'' (Syndicate) کہلاتے ہیں۔ بعض کالم نویس اپنے کالم معاہدوں کے تحت ایسے اداروں کو فروخت کر دیتے ہیں اور سینڈیکیٹ کی جانب سے یہی کالم خواہش مند اخبارات کو فراہم کیے جاتے ہیں۔ ایسے کالم جو کسی خاص صحافی یا مضمون نگار کے لکھے ہوئے نہیں ہوتے یا آزاد قلم صحافیوں کی جانب سے براہ راست اخبار کو نہیں ملتے بلکہ ''سینڈیکیٹ'' سے خریدے جاتے ہیں، وہ ''سینڈیکیٹ کالم'' کہلاتے ہیں۔ امریکا میں بعض کالم اتنے مقبول ہیں کہ ایک ساتھ سیکڑوں اخبار انہیں طلب کر کے شائع کرتے ہیں۔ اخبار والوں کو یہ کالم مقابلتاً ارزاں نرخ پر ملتے ہیں اور سینڈیکیٹ والوں کو اس لیے کافی منافع ہوتا ہے کہ ایک ہی مواد کے کالم کے لیے انہیں سیکڑوں اخبارات سے رقم مل جاتی ہے۔ لکھنے والے کالم نویس کو بھی رائلٹی دی جاتی ہے اور اسے اطمینان ہوتا ہے کہ اس کا تحریر کردہ کالم بہ یک وقت لاکھوں قارئین ذوق وشوق سے پڑھ رہے ہیں۔ انگلستان اور امریکا کے مشہور سینڈیکیٹ اداروں کی جانب سے فراہم ہونے والے کالم پاکستان اور بھارت کے کئی انگریزی اخبارات میں بھی شائع ہو رہے ہیں۔ بعض سینڈیکیٹ کالم اتنے مشہور اور مرغوب ہیں کہ دنیا بھر کے سیکڑوں اخبارات انہیں خصوصی اہتمام کے ساتھ منگوا کر شائع کرتے ہیں۔ پاکستان میں بھی چند ادارے اس طرح کے سینڈیکیٹ کالم کو مقبول بنانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اگر یہ طریقِ کار مقبول ہو جائے تو چھوٹے اخبارات کو زیادہ فائدہ رہے گا۔

۵- خصوصی کالم:

ایسے کالم جو مخصوص موضوعات پر لکھے جاتے ہیں، خصوصی کالم کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ تجارت، سیاست، مذہب، موسیقی، علم وادب، صنعت وحرفت، کھیل کود، زراعت، ماحولیات، طرزِ زندگی، پکوان، کشیدہ کاری، عام مشاغل وغیرہ پر خصوصی مضامین یا کالم لکھے جاتے ہیں۔ ایسے کالم عموماً ایسے افراد لکھتے ہیں جو اپنے اپنے میدانِ عمل میں ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ خصوصی کالم نویس معاوضہ بھی معقول طلب کرتے ہیں۔ خصوصی کالم زیادہ تر بڑے اخبارات میں دیے جاتے ہیں۔

کالم نویس کے اوصاف

صحافت میں کالم نویسی کی اہمیت محتاج بیان نہیں ہے۔ اکثر نوآموز لکھاریوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کالم نویسی کے میدان کو دعوت الی اللہ کے لیے استعمال کریں۔ انہیں لکھنے کے لیے مستقل جگہ ملے اور وہ اپنے نظریات کا اظہار کریں...... لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ کالم لکھنا آسان نہیں ہے۔ بہت سے قلم کار کالم لکھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر یا تو مدیر ہی ان کے کالم کو رد کر دیتے ہیں یا پھر قارئین کی طرف سے ایسا ردعمل ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کالم اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔

موجودہ دور تخصیص (Specialization) کا دور ہے اس لیے ہر شخص کو اپنے میدان میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اچھا کالم نویس وہی لکھاری بن سکتا ہے جس میں بعض بنیادی صلاحیتیں موجود ہوں۔ ماہرینِ صحافت نے اچھے کالم نویس کے درج ذیل اوصاف بیان کیے ہیں:

(۱) تعلیم یافتہ:

اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ اردو صحافت میں متعدد ایسے کالم نویسوں نے بھی ممتاز مقام حاصل کیا جو اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تھے، مگر اب حالات میں جس تیزی سے تبدیلی آ رہی ہے اور جس طرح ذرائع ابلاغ کی اہمیت میں اضافہ ہو رہا ہے، اس کے لیے کالم نویس کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ تعلیم یافتہ نہ ہوگا تو جدید دنیا کو سمجھنے میں اسے دقت پیش آئے گی اور سائنسی ترقی کی وجہ سے معاشرے پر مرتب ہونے والے اثرات کو نہ تو خود اچھی طرح سمجھ سکے گا اور نہ ہی اپنے قارئین کو سمجھا سکے گا۔ اس لیے کالم نویس کو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہی نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے مختلف عمرانی اور سائنسی مضامین و موضوعات سے بھی کماحقہ واقفیت ہونی چاہیے۔ مطالعے کی کثرت اور معلومات کی وسعت کافی حد تک اعلیٰ اختصاصی تعلیم کی کمی پوری کر دیتی ہے۔

(۲) وسیع المطالعہ:

کالم نویس کا مطالعہ بے حد وسیع ہونا چاہیے۔ اسے ادب، نفسیات، فلسفہ، سائنس، اقتصادیات، سیاسیات، غرضیکہ ہر شعبۂ علم کے متعلق ضروری معلومات حاصل ہونی چاہییں۔ اگر

کالم نویس کسی خاص شعبے پر کالم لکھتا ہے تو نہ صرف اس شعبے کے متعلق اس کی معلومات وسیع ہونی چاہییں بلکہ تازہ ترین بھی ہونی چاہییں۔ طب، قانون یا اقتصادی امور وغیرہ پر کالم لکھنے والوں کا کردار ایک رہبر جیسا ہوتا ہے۔ اگر کالم نویس کا مطالعہ وسیع نہیں ہوگا تو وہ رہنمائی کا فریضہ احسن طریقے سے انجام نہیں دے سکے گا۔ کالم میں دیے گئے کسی بھی حوالہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ درست ہو۔ اس ضمن میں غفلت سے بعض اوقات ایسی غلطی ہوجاتی ہے جس سے کالم نویس کو شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے اور پڑھنے والوں میں اس کی ساکھ خراب ہوتی ہے۔ اس کا علاج مطالعے کی وسعت اور تحقیق کی عادت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

(۳) زبان وبیان پر عبور:

کالم نویس کی ایک اہم خوبی یہ ہوتی ہے کہ اسے زبان وبیان پر عبور حاصل ہو۔ رپورٹر اور سب ایڈیٹر تو سیدھی سادی زبان میں لکھ کر اپنا کام کر سکتے ہیں مگر کالم نویس کو اکثر الفاظ سے کھیلنا ہوتا ہے، کبھی الفاظ کی شعبدہ بازی سے مزاح پیش کرنا ہوتا ہے، کبھی طنز کے تیر چلانے ہوتے ہیں اور کبھی کسی سنجیدہ موضوع پر منطقی انداز میں دلائل دے کر اپنا موقف مؤثر انداز میں پیش کرنا ہوتا ہے اور بعض اوقات الفاظ کے علامتی استعمال سے قارئین تک اپنا مافی الضمیر پہنچانا ہوتا ہے، لہٰذا کالم نویس کے لیے زبان وبیان پر مکمل دسترس لازم ہے۔

(٤) صحافتی قوانین اور ضابطۂ اخلاق سے واقفیت:

کالم نویس پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ایک طرف تو اسے صحافتی قوانین کو پیش نظر رکھتے ہوئے کالم لکھنا ہوتا ہے، دوسرے اسے اخبار کی پالیسی اور قارئین کے مزاج کا خیال بھی رکھنا ہوتا ہے۔ اچھے اخباروں میں کالم نویس پر عموماً کوئی پابندی عائد نہیں کی جاتی، لیکن قانونی طور پر کالم نویس کی تحریر کا پرنٹر اور پبلشر کو بھی ذمہ دار سمجھا جاتا ہے، اس لیے کالم نویس سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ جہاں اس کی تحریریں قارئین کے لیے معلومات، افکار، شگفتگی اور مزاح فراہم کریں گی، وہاں اس کی تحریروں سے اخبار کے لیے بھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ اس لیے کالم نویس کو صحافتی قوانین اور ضابطہ ہائے اخلاق سے مکمل واقفیت ہونی چاہیے۔

(۵) تحریری صلاحیتیں:

کالم نویس کے لیے تحریری صلاحیتیں انتہائی اہم ہیں۔ ان کے بغیر وہ اپنے کالم میں نہ تو قارئین کے لیے دلچسپی کا سامان پیدا کرسکتا ہے اور نہ ہی ان کی فکری رہنمائی کرسکتا ہے۔ تحریر کی فطری صلاحیتیں نہ صرف نئے موضوعات کی طرف کالم نویس کی رہنمائی کرتی ہیں بلکہ وہ ان کی بدولت اظہار بیان کے نئے پیرائے بھی دریافت کرتا ہے۔

(٦) اچھا رپورٹر:

کالم نویس میں اچھے رپورٹر کے اوصاف بھی ہونے چاہییں۔ وہ کالم نویس جو شہر نامہ، ذاتی ڈائری یا اداریہ نما کالم لکھتے ہیں، وہ اخبار کی خبروں کو ہی موضوع بحث نہیں بناتے، بلکہ وہ مختلف حلقوں میں گھومتے اور حالات و واقعات کا مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر اپنے مشاہدات کو تاثرات کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتے ہیں۔

(۷) حسِ مزاح:

فکاہیہ کالم نویس کے لیے حس مزاح کا ہونا ناگزیر قرار دیا جاتا ہے کیونکہ اس کے بغیر کالم میں مزاح پیدا نہیں کیا جاسکتا اور اگر فکاہیہ کالم نویس زندگی کے مختلف دلچسپ و مزاحیہ پہلو تلاش کر کے انہیں قارئین تک نہیں پہنچائے گا تو اس کا کالم مقبول نہیں ہوگا۔ بقولِ کسے: ''فکاہی کالم لکھنے کے لیے لطافتِ طبع ایک بنیادی شرط ہے۔'' کالم نویس میں مزاح کی حس نہیں ہوگی تو وہ زندگی کے خوشگوار اور مسرت آمیز پہلوؤں کو طنز و مزاح کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکے گا اور اس کی تحریر میں وہ خوبی اور شگفتگی پیدا نہیں ہو سکے گی جو مزاحیہ کالموں کا خاصہ ہے۔

کالم کیسے لکھا جائے؟

یہ ایک ایسا سوال ہے جو کالم نویسی کے شعبے میں قسمت آزمائی کرنے کا ہر خواہش مند کرتا ہے، مگر اس کے جواب اتنے مختلف ہیں جتنے کہ کالم ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ابن انشا نے اپنی کالم نویسی کے متعلق لکھا تھا:

" کالم لکھنے سے پہلے میرے ذہن میں کچھ نہیں ہوتا۔ جب کاغذ قلم کو چھوتا ہے تو بس کرنٹ پکڑ

لیتا ہے اور لکھتا چلا جاتا ہے۔"

اب یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ کالم لکھنے والا ہر شخص اتنا خوش نصیب نہیں ہوتا کہ وہ کالم لکھنے بیٹھے اور پھر کالم لکھ کر ہی اُٹھے۔ جہاں یہ ابن انشا کی خداداد صلاحیتوں کا کمال تھا، وہاں یہ امر بھی ایک حقیقت ہے کہ انہوں نے جب یہ بات کہی تھی تو اس وقت وہ زندگی کے بے شمار تجربات سے گزر کر ایک صاحبِ طرز ادیب اور کالم نویس بن چکے تھے۔

کالم نویسی کے متعلق اس بحث کے بعد ممکن ہے یہ کہا جائے کہ یہ ایک ایسا فن ہے جو خداداد ہے اور اس میں ہر کالم نویس کا اپنا منفرد طریقہ ہوتا ہے۔ درحقیقت کتابیں حتیٰ کہ خود کالم نویس بھی کسی مبتدی کو محض رہنما اصول ہی فراہم کر سکتے ہیں، اسے کوئی ایسا لگا بندھا فارمولا نہیں بتا سکتے جس پر عمل کر کے وہ ایسا کالم لکھ سکے جو مقبولیت حاصل کر سکے۔ یہ بات درست تو ہے مگر کچھ ایسی حرفِ آخر بھی نہیں ہے، کیونکہ ہوسکتا ہے کوئی شخص عمومی طور پر اچھا کالم نویس نہ بن سکے لیکن ممکن ہے کہ وہ تخصیصی کالم نویس بن جائے۔ مثلاً اس کا کالم سیاسی یا معاشی امور کے متعلق بہت کامیاب سمجھا جائے یا وہ کسی دوسرے انداز کا کالم لکھنے میں کامیابی حاصل کر لے۔

لہٰذا ہم یہاں ان چند اصولوں کا تذکرہ کریں گے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کامیاب کالم نویس بننے کے لیے ان پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ ان اصولوں پر عمل کرنے سے کالم نویس نہ صرف اپنے شعبے میں نمایاں کامیابی حاصل کر سکتا ہے بلکہ قارئین کو بھی اس سے شکایت پیدا نہیں ہوگی۔

وہ اصول یہ ہیں:

۱۔ صاف ستھری اور عام فہم زبان استعمال کریں۔ لغت دانی کا مظاہرہ نہ کریں۔ سادگی میں پُرکاری کا مظاہرہ آپ کو کامیاب کالم نویس بنا سکتا ہے۔

۲۔ کالم میں دیے ہوئے حقائق کی جانچ پڑتال بھی اسی احتیاط سے ہونی چاہیے جس احتیاط سے خبر کے حقائق کے متعلق کام لیا جاتا ہے۔

۳۔ اپنے کالموں کو اپنے ذاتی تعصبات کے اظہار یا ان لوگوں پر ذاتی حملے کرنے کے لیے استعمال نہ کریں جو آپ کے حملوں کا جواب نہیں دے سکتے۔

۴۔ اس حقیقت کو ہمیشہ ذہن میں رکھیں کہ آپ کو اخبار میں کالم ملنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کو خصوصی استحقاق حاصل ہو گیا اور آپ اس میں جو چاہیں لکھ سکتے ہیں۔ اس لیے ہر موضوع پر

فیصلے صادر کرنے سے احتراز کریں۔

۵- بہت سے لوگ کالم نویس کو رضا کارانہ بنیادوں پر خاصا مواد فراہم کرتے ہیں۔ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

٦- شہرت کے شائق افراد کے ہاتھوں میں نہ کھیلیں۔ایسے افراد کی صرف ایسی چیزیں ہی اپنے کالم کا حصہ بنائیں جو تفریح یا خبر کے حوالے سے واقعی کالم کا حصہ بننے کی اہل ہوں۔اس ضمن میں کالم نویس کی فراخدلی اکثر صورتوں میں خود اس کے اپنے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔

۷- کالم میں مزاح پیدا کرنے کے متعلق کچھ اصول اس طرح ہیں:

- کوشش کرو کہ تم سنجیدہ بات کا کوئی چھپا ہوا مُضحِک پہلو دریافت کر سکو۔
- اگر تمھیں کوئی ایسا پہلو مل جائے تو قاری کے سامنے اسے اچانک پیش کرو۔
- اس بات کے بیان میں ایک لمحے سے زیادہ وقت مت صرف کرو۔فوراً اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹ آؤ۔
- مناسب اور دلچسپ تشبیہات پیدا کرو۔
- مناسب تبصرہ کرنے کی عادت ڈالو۔
- بات سے بات نکالنے اور ذو معنی الفاظ استعمال کر کے لفظوں سے کھیلنے کا فن سیکھو۔

مشق

۱- ''کالم'' کی زیادہ معتبر اور جامع تعریف درج کریں۔

۲- مضمون اور کالم کے درمیان فرق مفصل لکھیں۔

۳- کالم نویس کے اوصاف مختصر اتحریر کریں۔

٤- کالم نویسی کے اہم اصولوں کا خلاصہ نکتہ وار لکھیں۔

۵- پورے اہتمام سے مواد جمع کر کے ایک عمدہ کالم لکھیں۔

کالم نویسی کے مراحل

ہم نے کالم نویسی کے متعلق مندرجہ بالا سطور میں ماہرین صحافت کے حوالے سے جن اصولوں کا ذکر کیا ہے، وہ ایک کامیاب کالم کی بنیاد بن سکتے ہیں......اب ہم ترتیب واران تین مراحل کا ذکر کریں گے جو ایک اچھے کالم کی تحریر کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔

پہلا مرحلہ- موضوع کا انتخاب:

موضوع کی تلاش کرتے وقت عام کالم نگاروں کے سامنے بنیادی بات یہی ہوتی ہے کہ اس میں لوگوں کی دلچسپی ہو اور وہ اس کے متعلق پڑھنا چاہتے ہوں...جبکہ ایک نظریاتی کالم نگار محض قارئین کی خواہشات یا اخبار کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر قلم نہیں گھسیٹتا۔ اس کے سامنے حق کی دعوت، قارئین کی اصلاح ورہنمائی، خیر کی بات پھیلانا اور شر کا راستہ روکنا، انسانیت کی فلاح وترقی، حب الوطنی کی ترویج، دشمنان دین وملت کا مقابلہ، معاشرے سے ظلم وفساد کا خاتمہ جیسے اعلیٰ وارفع مقاصد ہوتے ہیں اور وہ ان مقاصد کے تحت ہی اپنے موضوعات کا انتخاب کرتا ہے۔ ایک بامقصد اور نتیجہ خیز تحریر لکھنے والا نظریاتی لکھاری تاریخ وآثار پر قلم اٹھائے یا سیاست ومعیشت پر، آپ بیتی وسفرنامہ لکھے یا مزاحیہ وفکاہیہ تحریر، اس کا موضوع سماجی ومعاشرتی رجحانات ہوں یا کھیل وکھلاڑی، وہ بہر حال اس بات کو نہیں بھولتا کہ وہ اللہ کا بندہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہے۔ پوری دنیا میں پھیلی ہوئی اسلامی برادری کا رکن اور دنیوی واخروی فلاح کے لیے تڑپتی سسکتی انسانیت کا فرد ہے۔ لہٰذا وہ موضوعات کا انتخاب کرتے وقت مقصدیت اور نتیجہ خیزی، پیغام رسانی اور ذہن سازی کو مدنظر رکھتا ہے اور اسی بنیاد پر موضوعات کا انتخاب کرتا ہے۔ جب وہ اپنی تحریر کے لیے اس بات کو اساس بنا کر اپنے گردوپیش پر نظر دوڑاتا ہے تو اسے ہر چیز کوئی نہ کوئی پیغام دیتی اور کچھ نہ کچھ تبصرہ کرنے پر ابھارتی ہے۔ اس سے ''موضوع کے انتخاب'' کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔

جب بات گرد و پیش پھیلی ہوئی چیزوں سے موضوع حاصل کرنے کی چلی ہے تو اکثر کالم نگار اپنے کالم کے موضوع اخبارات کی خبروں سے کرتے ہیں۔

ایک معروف کالم نویس نے اس معاملے پر کچھ یوں اظہار خیال کیا ہے:

"میرا موضوع زندگی ہے۔ میرے ارد گرد اتنی چیزیں ہیں جو کہتی ہیں مجھے دیکھ لو۔ مگر میں کہتا ہوں تمہاری باری بھی آئے گی، ایک کالم تمہارے نام بھی کروں گا، مگر اطمینان سے "قطار" میں کھڑی رہو۔ بہت سی چیزیں ایک دوسرے کو دھکیلتی ہوئی، بالکل اسی طرح جیسے لوگ بس میں سوار ہوتے ہیں، میری طرف بڑھتی ہیں اور میرے دماغ پر سوار ہو جاتی ہیں۔ کبھی تو میں ان کا استقبال کرتا ہوں اور کبھی ذہن سے اتار دیتا ہوں۔ ہاں! تو چلتے وقت میری آنکھیں دیکھتی ہیں اور میرے کان سنتے ہیں۔ میرا دماغ ان سب کو محفوظ کر لیتا ہے اور میرا قلم کاغذ پر ان کو اگل دیتا ہے۔ جو کچھ میں لیتا ہوں، وہی لوٹا دیتا ہوں۔ جلسے، جلوس، محفلیں، تقریریں، زندہ باد، مردہ باد، قدم بڑھاؤ، واپس جاؤ، ہوٹل، پارک، فٹ پاتھ، جھونپڑیاں، بنگلے، چنڈو خانے، غرض جدھر جاتا ہوں مجھے کچھ نہ کچھ ملتا ہے۔ کچھ زمانے کی حماقتیں کچھ اپنی، اور کبھی کبھی میں ان دونوں کو اس طرح ملا دیتا ہوں جیسے گھی میں تیل یا دودھ میں پانی۔ میرا ذہن جو کچھ سوچتا ہے، وہی میں لکھتا ہوں یا سناتا ہوں۔ اس کی بالکل سچی تصویر بناتا ہوں۔ بہت سی چیزیں مجھے اخباروں سے ملتی ہیں، ان پر بھی لکھتا ہوں۔ لیڈروں کے بیان، سماج کی برائیاں، جلسوں کی خبریں، قراردادیں، دلچسپ واقعات غرضیکہ چیونٹی سے ہاتھی اور گدھے سے ہوائی جہاز تک میری دنیا ہے۔"

دوسرا مرحلہ - مواد کا حصول:

آپ نے موضوع کا انتخاب کر لیا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ اس کے متعلق مواد کیسے حاصل کیا جائے؟

مواد حاصل کرنے کے ذرائع کا تعلق آپ کے موضوع کی نوعیت سے ہے۔ اگر آپ نے کسی سنجیدہ موضوع کا انتخاب کیا ہے تو ہو سکتا ہے کہ آپ کو متعلقہ مواد کے لیے دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کتابوں، رسائل یا اخبارات کی فائلوں کی ضرورت پڑے۔ اکثر معیاری اخبارات

میں مختلف موضوعات پر ایسا مواد دستیاب ہوتا ہے..... لیکن اگر آپ نے خالصتاً فکاہیہ کالم لکھنا ہے تو پھر آپ کو اپنی فطری صلاحیتوں کو استعمال کرنا پڑے گا۔

اس موضوع پر مزید گفتگو کرنے سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ معروف صحافی اپنے کالم کا مواد کیسے حاصل کرتے ہیں؟ ان سطور کے بین السطور میں ان ذرائع کا ذکر موجود ہے جہاں سے ماہرینِ فن کالم کا مواد حاصل کرتے ہیں۔

ایک معروف ادیب کہتے ہیں: ''کالم نویس اکثر کوئی چھوٹی سی خبر لے کر ہی اس پر کالم لکھ دیتا ہے۔ میں مختلف معاملات سے متعلق اپنی رائے بنانے کے لیے لوگوں سے گفتگو بھی کرتا ہوں اور ہر شخص سے اس دوران کچھ نہ کچھ ضرور حاصل ہوتا ہے۔ کسی چیز کے متعلق کچھ لکھنے سے قبل میں ذہن میں کافی کچھ پکا تا ہوں۔ بعض اوقات ایک خیال یا موضوع دنوں تک ذہن میں گردش کرتا رہتا ہے لیکن جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو اداریہ یا کالم لکھنے کے لیے مجھے صرف دس پندرہ منٹ درکار ہوتے ہیں۔ بعض دوسرے لکھنے والوں کی طرح لکھنے کے لیے کبھی نوٹس نہیں لیتا اور نہ پوائنٹس تیار کرتا ہوں۔''

عرفان صدیقی، یاسر محمد خان اور عطاء الحق قاسمی جس انداز کے کالم لکھتے ہیں، ان کا مواد ذاتی یادداشتیں، تاثرات اور مختلف لوگوں سے انٹرویو وغیرہ پر مبنی ہوتا ہے۔ درحقیقت وہ شخصیت جو کسی اعلیٰ مقام پر ہو، لوگ ان کی باتیں پڑھنا پسند کرتے ہیں اور اگر وہ اپنے تجربات و مشاہدات کے حوالے سے بات کریں تو اس میں عموماً زیادہ دلچسپی محسوس کی جاتی ہے۔

کچھ کالم نویس جب روزمرہ زندگی میں کسی چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ان کی پوشیدہ صلاحیتیں ان میں ایسی چیزوں کا مشاہدہ کر لیتی ہیں جو عام لوگوں کو نظر نہیں آتیں۔ ایسی صورت میں ایسے کالم وجود میں آتے ہیں جنہیں ادبی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات مختلف تاریخی واقعات کے تذکرے اور حالات حاضرہ سے ان کے موازنے سے بھی کالم وجود میں آجاتا ہے، لیکن اس ضمن میں ضروری ہے کہ محض یادداشت پر بھروسہ نہ کیا جائے، بلکہ ممکن ہو تو متعلقہ کتب سے استفادہ کر لیا جائے کیونکہ بعض اوقات تاریخی حوالوں سے کالم نویس ایسی غلطی بھی کر لیتا ہے جو

قابل گرفت ہوتی ہے۔

اگر ہم کالم کے لیے مواد کے حصول کے ذرائع کو مختصراً بیان کرنا چاہیں تو وہ کچھ یوں ہوں گے:

(۱) مطالعہ (۲) سماعت (۳) مشاہدہ

(٤) تجربہ (۵) مکالمہ (انٹرویو) (٦) خبر کاری (رپورٹنگ)

۱- مطالعہ:

کالم نویس کے لیے مطالعہ ناگزیر ہوتا ہے کیونکہ یہ مطالعہ ہی ہے جو انسان کے ذہنی افق کو وسیع کرتا ہے۔ مطالعہ کے بغیر معیاری کالم نہیں لکھے جاسکتے۔ اکثر کالم نویس اپنے کالموں میں اپنے مطالعے کی وسعت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ مختلف کتابوں سے ایسے اقوال اور واقعات کو اپنے کالموں کا حصہ بناتے ہیں جنہیں قارئین دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ اکثر کالم نویسوں کے ہاں ان کے مطالعے کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ کسی بھی کالم نویس کے اسلوب کی تشکیل میں اس کا مطالعہ سب سے اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مطالعہ ان چیزوں کا کرنا چاہیے: کتب، انسائیکلوپیڈیا، رسائل وجرائد، اخبارات، انٹرنیٹ۔

۲- سماعت:

علم وحکمت کی باتیں ضروری نہیں کہ مروجہ تعلیم کے اعتبار سے پڑھے لکھے شمار ہونے والے لوگوں سے ہی سننے کو ملیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ زندگی کے عام شعبوں سے تعلق رکھنے والے نسبتاً کم پڑھے لکھے یا اَن پڑھ افراد قومی یا بین الاقوامی معاملات پر ایسا لگا بندھا اور جچا تُلا تبصرہ کر جاتے ہیں کہ اس کی برجستگی اور بے ساختگی پر پڑھے لکھے لوگ بھی تعجب کرتے رہ جاتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ انسانی شعور وعقل تربیت وتہذیب کے لیے مروجہ رسمی تعلیم کی محتاج نہیں۔ زمانہ جاہلیت کا وضع شدہ شاندار ادب اس پر شاہدِ عدل ہے کہ انسانی فطرت میں مشاہدے اور تجربے کے ذریعے سیکھنے کی جو صلاحیت رکھی گئی ہے، اس کی ترقی اور نشو ونما رسمی تعلیم پر موقوف نہیں۔ ایک عام آدمی بھی بعض اوقات اپنی قدرتی ذہانت اور فطری صلاحیت کی بنا پر ایسی نپی تلی بات کہہ دیتا

ہے جو ضرب المثل بن جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے احسن الخالقین اور انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی گواہی دیتی ہے۔ اس لیے کالم نگار کو چاہیے کہ تھڑوں، تختوں، جھونپڑا ہوٹلوں اور چوپالوں میں بیٹھ کر روزمرہ ہونے والی گفتگو کو کان لگا کر سنے۔ چائے خانوں یا عوامی سواریوں میں کیے جانے والے تبصروں سے اپنے مطلب کی چیز اخذ کرنے کی کوشش کرے۔ حجام کی دکان پر اخبار خوانی کی اجتماعی محفل کے دوران یا محلّے بھر کے گھریلو ملازمین کی باہمی بیٹھک میں خیالات وتجزیات کے عوامی تبادلے پر ویسی ہی نظر رکھے جیسا کہ عالمی اداروں کے نشر کردہ تجزیوں، تبصروں پر وہ کان دھرتا ہے۔ اس سے اسے بے شمار کام کی باتیں ہاتھ لگیں گی جو اس کے کالم کا موضوع یا موضوع کے معاون خیالات ومعلومات فراہم ہونے میں مدد دیں گی۔

۳- مشاہدہ:

روزمرہ زندگی میں ہم بہت کچھ دیکھتے ہیں مگر اس پر غور نہیں کرتے۔ جس طرح منظر ایک ہی ہوتا ہے لیکن اچھا کیمرہ اسی منظر کی اچھی تصویر اتارے گا جب کہ ناقص کیمرہ اسی منظر کی جو تصویر اتارے گا، وہ بعض صورتوں میں بدصورت بھی قرار دی جائے گی۔ اس طرح جب کالم نویس کا حساس ذہن کسی چیز کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کے ذہن میں اس چیز کا ایک ایسا تاثر ابھرتا ہے جو عام آدمی کے ذہن میں ابھرنے والے تاثر سے زیادہ خوبصورت ہوتا ہے اور جب کالم نویس اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے کام لے کر اپنے اس مشاہدے کو بیان کرتا ہے تو اکثر صورتوں میں ایسی خوبصورت تحریر وجود میں آتی ہے جو کالم ہوتے ہوئے بھی ادبی حیثیت کی حامل ہوتی ہے۔

٤- تجربہ:

کالم نویس نے زندگی کے سرد وگرم کا مشاہدہ کیا ہو تو وہ کسی تازہ واقعے کے حوالے سے ماضی کے اسی طرح کے واقعات کو شگفتہ انداز میں بیان کر کے کالم لکھ سکتا ہے۔ اردو میں مولانا چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک کے علاوہ کئی کالم نویس ایسے کالم لکھتے رہے ہیں۔ مولانا محمد اسلم شیخوپوری اور عبدالقادر حسن کے کالموں میں بھی ان کا تجربہ ہی بولتا ہے جبکہ ڈاکٹر صفدر محمود بھی بعض اوقات اپنے ماضی کے تجربات کو آواز دے کر کالم میں دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ذاتی

تجربات، آپ بیتی، جگ بیتی پر مبنی کالم کو تفریح پسند اور معلومات طلب قارئین توجہ سے پڑھتے اور ایسے کالموں کے منتظر رہتے ہیں۔

۵- مکالمہ (انٹرویو):

بعض کالم نویس اپنے کالم کا مواد انٹرویو کے ذریعے حاصل کرتے ہیں۔ عموماً سیاسی اور ادبی مزاج کے کالموں کے لیے یہ تکنیک استعمال ہوتی ہے۔ کالم نویس مختلف موضوعات کے متعلق جب مختلف شخصیتوں کے ساتھ گفتگو کرتا ہے تو ایسی باتیں سامنے آتی ہیں جن میں عام پڑھنے والوں کو دلچسپی ہوتی ہے۔ یہ معلومات کالم نویس میں لکھنے کی تحریک پیدا کرتی ہیں اور اس کے لیے بہترین خام مواد ثابت ہوتی ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ مشہور شخصیات کا انٹرویو ہی اچھے کالم کی بنیاد بن سکتا ہے، بلکہ جیسا کہ سماعت والے عنوان کے تحت بیان کیا گیا، عام لوگوں سے کرید کرید کر سوالات کرنے اور مطلب کی باتیں اُگلوانے سے بھی بہترین موضوعات اور معلومات ہاتھ آجاتے ہیں۔

٦- خبرکاری (رپورٹنگ):

رپورٹنگ سے بھی کالم نویسی کے لیے خاصا مواد مل جاتا ہے۔ ایک مشہور کالم نگار (عبدالقادر حسن) کے بقول جو اپنے کالموں کا مدار رپورٹنگ پر رکھتے تھے:

”رپورٹنگ کے وقت بہت سے خصوصی حقائق ایسے بھی ملتے ہیں جنہیں خبر سے زیادہ بہتر طور پر کالم کی صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔“

درحقیقت خبر نویس کو زندگی کے ہر شعبے کے لوگوں سے ملنے اور ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملتا ہے اور بعض اوقات اس کے ان معمول کے کاموں میں کوئی ایسی غیر معمولی چیز سامنے آجاتی ہے جسے خبر کے بجائے کالم میں پیش کرنے سے اس کا تاثر زیادہ خوبصورت اور بامعنی ہو جاتا ہے۔

یاد رہے کہ مواد کے حصول کے اصل ذرائع پہلے چار ہی ہیں۔ انٹرویو اور رپورٹنگ تو دراصل سماعت اور مشاہدہ کے ضمن میں آتی ہے۔

تیسرا مرحلہ-کالم لکھنا:

موضوع کے انتخاب اور مواد کے حصول کے بعد کالم لکھنے کا مرحلہ آتا ہے۔اگر کالم نویس اس مرحلے کو کامیابی سے طے کرلے تو اس کی محنت بارآور ثابت ہوتی ہے ورنہ اس کی تمام کاوشیں بے کار ثابت ہوں گی۔اس کے لیے وہ درج ذیل مراحل پر ترتیب وار عمل کرے:

۱- سوچ و بچار:

لکھنے کی ابتدا سوچنے سے ہوتی ہے۔اچھا لکھنے کے لیے اچھی طرح سوچنا بہت زیادہ اہم ہے۔تمام لوگ سوچتے ہیں یا کم ازکم ان کا خیال ہوتا ہے کہ وہ سوچتے ہیں مگر یہ بہت کم لوگ بتا سکتے ہیں کہ وہ کیا سوچتے ہیں؟ بلکہ اگر وہ اپنی بات دوسروں تک پہنچاتے بھی ہیں تو اس میں وہ کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوتے.....مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے خیالات اتنے دلچسپ ہوتے ہیں کہ دوسرے لوگ انہیں سن کر یا پڑھ کر خوش ہوتے ہیں۔لکھنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ جب کسی کے پاس ایسے خیالات ہوں جن میں دوسروں کے لیے دلچسپی ہو تو انہیں ایسی زبان میں بیان کردیا جائے جو ان خیالات کی ترجمانی کرسکے۔ان خیالات کا ایک حصہ تو دماغ کی فطری صلاحیتوں کا مظہر ہوسکتا ہے مگر دوسرا حصہ شعوری کوشش اور غوروفکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔لکھنے کا عمل جہاں قدرت کا عطیہ قرار دیا جاتا ہے، وہاں یہ شعوری کوششوں کا نتیجہ بھی ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے کچھ یوں پیوست ہیں کہ کپڑے کے مختلف دھاگوں کی طرح ان کی علیحدہ علیحدہ شناخت تقریباً ناممکن ہے۔

اکثر لکھنے والے تصنع سے کام لیتے ہوئے اپنے خیالات کی بے ساختگی پر زور دیتے ہیں۔ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں:"میں باغ کی سیر کررہا تھا کہ اچانک یہ خیال میرے دماغ میں آگیا۔" شعرا تو اکثر اپنا مقابلہ پرندوں کے ساتھ کرتے ہیں جو ان کے بقول کچھ سیکھے بغیر اور کسی صلے کی تمنا کیے بغیر گاتے ہیں۔اسی طرح بعض مقرر کہتے ہیں کہ وہ موقع کی مناسبت سے فی البدیہہ بہترین تقریر کرتے ہیں.....بعض مقرر تقریر کے دوران کہتے ہیں: لیجیے! سامعین اس موقع پر مجھے لطیفہ یاد آگیا.....لیکن اصل حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔پرندہ ساری عمر گلہ سوزی کی مشقت کرتا ہے اور مقرر گھنٹوں دماغ سوزی کے مختلف مراحل سے گزرتا ہے تب جاکر ان کی کارکردگی اتنی بے ساختہ اور

فطری معلوم ہوتی ہے۔

۲- خاکہ سازی:

لکھنے لکھانے کے فن کا جائزہ لیا جائے تو یہ امر واضح ہوتا ہے کہ لکھنے کی فطری صلاحیت بلاشبہ عطیۂ خداوندی ہے اور اچھی تحریر لکھنے کے لیے یہ بھی ایک ضروری چیز ہے، مگر صرف فطری صلاحیتوں کے بل بوتے پر کچھ نہیں لکھا جاسکتا۔ اس ضمن میں شعوری کوششوں کی اہمیت کم نہیں ہوتی، لہٰذا اپنے شعور کی ایسی تربیت کرنی چاہیے کہ وہ گہری سوچ کی کوکھ سے کالم کا ''خاکہ'' برآمد کر سکے۔ جب سوچنے کے عمل کے نتیجے میں ذہن میں ایک خاکہ سا تیار ہو جائے تو اگرچہ وہ دھندلا ہی کیوں نہ ہو، سمجھ لیجیے کہ ایک تحریر کا اہم مرحلہ کامیابی سے مکمل ہو گیا۔ اب اس میں رنگ بھرنا رہ گیا ہے۔ خاکہ سازی کا مطلب یہ ہے کہ بنیادی ڈھانچہ بنالیا جائے کہ پہلے کون سی بات آئے گی پھر کون سی؟ فلاں بات پر ایک پیرا ہوگا یا دو یا زیادہ؟ ابتدائیہ کیسا ہوگا؟ مرکزیہ میں کون سی معلومات اور اعداد و شمار پیش کیے جائیں گے اور اختتامیہ میں بات کی تان کہاں آ کر ٹوٹے گی۔

۳- متاثر کن آغاز:

اس خاکے میں رنگ بھرنے کی ابتدا ایسے آغاز سے ہونی چاہیے جو قاری کو متاثر کر کے اپنی طرف متوجہ کر لے اور وہ اس وقت تک کالم نویس کے ساتھ رہے جب تک وہ اسے نتیجہ خیز اختتام تک نہیں پہنچا دیتا۔ واقعہ یہ ہے کہ قلم کی نوک کا کاغذ کے سینے سے چھونا اور پہلے جملے کا وجود میں آنا ایک کربناک تعمیری عمل ہے۔ ''ابتدائیہ'' لکھنے کی کوشش میں کالم نگاروں کی ٹوکریاں ردی سے بھر جاتی ہیں یا قلم کا سرا چبا چبا کر ختم کر دیا جاتا ہے۔ اس مرحلے سے اگر بخیریت گذر ہو جائے تو آگے کے مراحل روانی سے طے پا جاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ مرحلہ کیسے طے ہو؟

- بعض قلم کار کالم کی ابتدا کسی واقعے، لطیفے یا قصے وغیرہ سے کرتے ہیں۔
- بعض اس کے لیے مکالمے کا سہارا لیتے ہیں۔
- کچھ کا طریقہ یہ ہے کہ کسی تمہید کے بغیر براہ راست موضوع پر آ جاتے ہیں، جیسے: ''یہ ۱۹۳۰ء کی بات ہے۔ دنیا اس وقت تک اتنی تیز رفتار نہ تھی۔ انسان انسانیت سے اتنا بیزار اور

مادیت پرستی میں اس بری طرح گرفتار نہ تھا جتنا کہ آج ہے......۔''

– آپ بیتی یا جگ بیتی کو بھی موزوں آغاز کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے، مثلاً: ''یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب میں قلم کی دنیا میں نووارد تھا۔ اس فن کی اونچ نیچ سے ناآشنا اور آداب واصول سے بے خبر..... یہ اچھی طرح یاد نہیں کہ محض شوق ہی اس طرف کھینچ لایا یا مجبوری کو بھی اس میں دخل تھا......۔''

– بعض قلم کار کسی محاورے وغیرہ کا سہارا لے کر اچانک پن سے آغاز کرتے ہیں، جیسے:

''اور آخرکار بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔ وہی ہوا جس کا اندیشہ ظاہر کیا جا رہا تھا......۔''

اس کے بعد اصل موضوع کی طرف آ جاتے ہیں۔

– اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی خبر یا بیان کو لے کر سادہ سا آغاز کر لیا جاتا ہے اور پھر اس پر تبصرے سے بات آگے بڑھتی جاتی ہے۔

بہرحال یہ بہت سے طریقے ہیں۔ اگر آپ کالموں اور کالم نویسوں کا مشاہدہ و تجزیہ کریں تو مزید طرز بھی دریافت کر سکتے ہیں، کیونکہ کالم نگاروں کا شوقِ انفرادیت نئے اسالیب دریافت کرتا رہتا ہے۔ ہم اس کی اہمیت اور آپ کی سہولت کے پیش نظر تھوڑا آگے چل کر ابتدائیہ کی مروجہ اقسام مثالوں کے ساتھ ترتیب وار بیان کریں گے۔

٤- بامعنی اختتام:

کالم کا اختتام ہمیشہ کسی ایسے نکتے پر ہونا چاہیے جس سے پڑھنے والے کو کوئی پیغام ملے، وہ کسی نتیجے تک پہنچ سکے اور تحریر کا مقصد اس پر واضح ہو سکے۔ اگر آپ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ تحریر کو بامقصد ہونا چاہیے تو اس بات کو یقینی بنائیے کہ آپ کے کالم کا اختتامیہ بامعنی اور نتیجہ خیز ہو اور کالم کے آخر تک پہنچ کر قاری کسی نظریہ، کسی سبق یا کسی نکتہ خیز بات پر پہنچ سکے اور اسے تشنگی محسوس نہ ہو۔

کالم کا ابتدائیہ واختتامیہ

اوپر آپ پڑھ چکے ہیں کہ کالم کا زوردار آغاز اور جاندار اختتام کالم کی افادیت ومقبولیت کا ضامن ہے۔ ان دو چیزوں کی اہمیت کے پیش نظر ہم ان کو تفصیل سے ذکر کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے

کہ ''ابتدائیہ'' اگر کالم کا چہرہ وتعارف یا سر پہ دھرا تاج ہے تو اختتامیہ اس کی جان اور روح ہے۔ ان دونوں کے ترتیب دینے میں جتنی محنت اور مہارت کا مظاہرہ کیا جائے گا، اتنا ہی کالم شاندار اور جاندار ہوگا۔ ابتدائیہ اٹھانے اور اختتامیہ پر لاکر تان ٹوٹنے کے مختلف طریقے ہیں۔ عموماً انہی کی بنیاد پر کالم لکھا جاتا ہے۔ آپ ان کو ذہن نشین کرنے کے بعد کالموں کا مطالعہ اس نظر سے کیجیے کہ ان کے ابتدائیے واختتامیے کی جانچ کرسکیں کہ وہ کس قسم سے تعلق رکھتا ہے؟ کچھ عرصے بعد جب مشق پکی اور تجزیہ پختہ ہوجائے گا تو آپ ان شاء اللہ ازخود ایسے ابتدائیے واختتامیے لکھ کر کالم کا آغاز واختتام معیاری انداز سے کرسکیں گے۔

ابتدائیہ کی اقسام:

ابتدائیے کی بڑی اور مشہور اقسام یہ ہیں:

۱-خبری ابتدائیہ:

جو لوگ سیاست وحالات حاضرہ کو موضوع بناتے ہیں، وہ اپنے کالم کا آغاز عموماً کسی دلچسپی اور چونکا دینے والی خبر یا معلوماتی رپورٹ سے کرتے ہیں۔ ابتدائیہ کی یہ قسم آسان ہے۔ آپ نے خبر لی اس پر تبصرہ وتجزیہ شروع کردیا۔ البتہ ایسے ابتدائیہ کو آگے بڑھا کر دلچسپ کالم لکھنے کے لیے زورِ تحریر اور جاندار ضروری ہے ورنہ کالم پھیکا ہوجانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ ذرا دیکھیے جنگ کے نوجوان قلم کار انور غازی نے اپنے کالم کی ابتدا کیسے کی ہے؟

''چار دسمبر 2010ء کی شب امریکی صدر اوباما نے افغانستان کا خفیہ دورہ کیا۔ بگرام ایئربیس پر تین گھنٹے قیام کیا۔ یہاں انہوں نے امریکی فوج کے سربراہ جنرل ڈیوڈ پیٹریسن، افغانستان میں متعین امریکی سفیر کارل ایکوی اور امریکی فوجیوں سے ملاقاتیں کیں۔ ایئربیس پر ہی قائم ہسپتال میں جسمانی، روحانی اور نفسیاتی امراض میں مبتلا امریکی فوجیوں کی عیادت کی اور پھر آخر میں اجتماعی طور پر خطاب کیا جس میں انہوں نے کہا: مجھے اس حقیقت کا بڑی شدت کے ساتھ احساس ہے کہ امریکا میں ہالیڈے سیزن شروع ہوچکا ہے۔ یہ وہ سیزن ہے جب ہر کوئی اپنے گھر والوں کے ساتھ ملنا چاہتا ہے لیکن آپ اپنے گھروں سے ہزاروں کوس دور، ان انتہائی مشکل حالات میں ہیں۔''

(انور غازی: روزنامہ جنگ کراچی، جمعہ 10 دسمبر 2010ء)

درج ذیل ابتدائیے کو ''خبری استفہامی ابتدائیہ'' کہا جاسکتا ہے کہ اس کے شروع میں خبر استفہام دونوں ہیں:

''اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے 50 بنیادی پوائنٹس کا سہارا لیتے ہوئے اپنا ڈسکاؤنٹ ریٹ بڑھا کر 14 فی صد کر دیا ہے جس کا اطلاق 30 نومبر 2010ء سے ہوگا۔ کیا یہ اضافہ درست ہے اور اس کا کوئی جواز موجود ہے؟''

(ڈاکٹر اشفاق حسن خان: روزنامہ جنگ کراچی، جمعہ 10 دسمبر 2010ء)

۲-مقولاتی ابتدائیہ:

قرآن وحدیث کا حوالہ یا کسی دانش ور یا فلسفی کا مقولہ بھی کالم کی اٹھان خوبصورت انداز سے اٹھانے میں مدد دیتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''فارسی کی ایک پرانی کہاوت ہے: ''ہر کمالے راز والے'' یعنی ہر بلندی کو پستی سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور ہر پست چیز کبھی نہ کبھی بلند ہوجاتی ہے۔ یہ قدرت کا نظام ہے۔ علامہ اقبال نے اس کو یوں بیان فرمایا ہے:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانہ میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں

اور یہی بات ہمارے اصغر شعری بھوپالی نے یوں بیان کی ہے:

اک رنگ پہ رہتا نہیں دنیا کا فسانہ
رفتار بدلتا ہوا چلتا ہے زمانہ

اور پھر اللہ تعالیٰ نے بھی تو ''سورۃ الم نشرح'' میں فرمایا ہے کہ ہر تکلیف کے بعد آرام ہے، بلاشبہ ہر تکلیف کے بعد آرام ہے۔ یعنی اس نے تبدیلی کے قدرتی عمل کی جانب اشارہ فرمایا ہے۔ تبدیلی کے اس فطری عمل پر انسان ناخوش اور غمزدہ ہوجاتا ہے کیونکہ وہ اسے مصیبت سمجھتا ہے اور قسمت کی خرابی، گناہوں کی سزا اور وقت کی بے رحمی سے تعبیر کرتا ہے۔ دیکھیے! مشکل بات یہ ہے کہ انسان، اللہ کے فرمان کے مطابق بے صبرا ہے، جلد باز ہے، ناشکرا ہے اور جب اس کو دُکھ د

تکلیف اور اپنی غلطی سے پستی، تکلیف و بیماری کا شکار ہوتا ہے تو اُٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے، اللہ کو یاد کرتا ہے...مگر جونہی اللہ تعالیٰ اس کی تکلیف، بیماری اور ذلت دور کر دیتا ہے تو اکڑ کر ایسا چلنے لگتا ہے کہ گویا کبھی اس کو تکلیف ہی نہیں ہوئی اور کبھی پستی میں نہیں گیا۔''
(حکمرانو! ہوش میں آ ؤ، ڈاکٹر عبدالقدیر خان: روزنامہ جنگ کراچی، پیر، 29 نومبر، 2010ء)

۳-محاوراتی ابتدائیہ:

کالم نگار اگر کسی مشہور مقولے، محاورے یا ضرب المثل کو لے کر کالم کا آغاز کرے تو قاری کو جلد ہی اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔ کئی مشہور کالم نگار اس طریقے کو اپناتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

''امریکیوں کو خدا سمجھے کہ انہوں نے پوری ایک صدی سے ظلم وستم کا بازار گرم کیا ہوا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں ہیروشیما ناگاساکی پر ایٹمی حملہ جس نے لاکھوں افراد کو لمحہ بھر میں لقمہ اجل بنا دیا۔ پہلی جنگ عظیم میں زبردستی کا معاہدہ جرمنی پر تھونپا جس نے دوسری عالمگیر جنگ کو جنم دیا۔ اس کے بعد مشرق بعید میں بحران پیدا کیا۔ مشرق وسطی میں اسرائیل کو مسلط کیا۔ فلسطینیوں کو خود اپنی زمین سے بے دخل کیا۔ اسپین کی خانہ جنگی میں حصہ ڈالا۔ اس کے بعد ایران کی حکومت کا تختہ الٹا۔ ویتنام کی جنگ شروع کی۔ کمبوڈیا پر حملہ کیا۔ لاؤس کو عدم استحکام کا شکار کیا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں حصہ ڈالا۔ فغان جنگ میں روس کو شکست دے کر دنیا کی واحد سپر طاقت بن گئے۔ پھر عراق ایران جنگ کرائی۔ اس کے بعد عراق کو اکسا کر کویت پر حملہ کرایا اور خود عراق پر حملہ آور ہو گئے۔ دوسری مرتبہ عراق پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ پھر 9/11 کے بعد افغانستان پر حملہ کر دیا اور خون بہائے چلے جا رہے ہیں۔ عراق کی جنگ میں وہ کون سا ظلم تھا جو امریکیوں نے نہیں کیا؟ وہ کون سا ہتھیار ماسوائے ایٹم بم کے امریکی اور اتحادیوں نے استعمال نہیں کیا؟ افغانستان پر قبضہ کرنے کے لیے ہر طرح کا نیا ہتھیار استعمال کیا۔ ڈیزی کٹر سے لے کر اسٹیلتھ طیارہ تک استعمال ہوا۔ بی بمبار طیارے استعمال ہوئے۔ ابوغریب جیل میں عراقیوں کے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا گیا۔ انہیں ننگا الٹا لٹکا کر کتوں کے حوالے کیا گیا۔ انہیں برف کی سلوں پر لٹایا گیا۔ کتوں کی طرح گلے میں پٹہ ڈالے رکھا۔ کتوں کی طرح سے زنجیر ڈال کر چلایا گیا۔ ان کے ساتھ جنسی جرائم بھی کیے۔ یہی کچھ گوانتانامو بے جیل میں بھی کیا۔ اس کی تو مثال پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔''

(امریکا اور کتنا ظلم کرے گا، نصرت مرزا: روزنامہ جنگ کراچی، جمعہ 11 مارچ 2011ء)

۴-حکایتی ابتدائیہ:

کسی دلچسپ قصے یا بامعنی لطیفے سے جو سبق ملتا ہے، یا ان میں جو نکتہ پوشیدہ ہوتا ہے، یہ بھی کالم کا مرکزی خیال سمجھانے کے لیے مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے سبق آموز حکایتیں اور دلچسپ لطیفے کالم کے ابتدائیے میں جگہ پا کر کالم نگار کو ابتدائیہ کی لکھائی عبور کروا دیتے ہیں۔

''چڑیا گھر کی سیر کے دوران ایک ہاتھی آنکھوں سے معذور چند افراد کے ہتھے چڑھ گیا۔ سب نے ٹٹول کر ہاتھی کا جائزہ لیا اور اپنی اپنی رائے پیش کی۔ ٹانگیں ٹٹولنے والے شخص نے اسے چار ستونوں پر کھڑی ڈب کھڑبی عمارت قرار دیا۔ پیٹ پر ہاتھ پھیرنے والے نے بڑا سا ڈھول جسے بجانے کے لئے خصوصی مہارت درکار ہے اور سونڈ کو ہاتھ میں لینے والے نے موٹا لٹھ۔''

(ارشاد احمد عارف: روزنامہ جنگ کراچی، منگل 14 دسمبر 2010ء)

۵-واقعاتی ابتدائیہ:

کالم کے شروع میں اگر کسی تاریخی واقعہ، جگ بیتی یا آپ بیتی کا تذکرہ کیا جائے تو کوئی شک نہیں کہ تاریخ و ادب اور قصے کہانیوں کے شوقین قاری کے لیے ایک سوغات ثابت ہوگا۔ اس میں سیرت و سوانح، تاریخی واقعات، سفر نامہ یا ذاتی تجربات بھی آ جاتے ہیں۔ گویا کہ کالم نگار نے تاریخ کا ورق الٹا ہے یا ذاتی ڈائری کا صفحہ کھول لیا ہے اور بیتی یادوں کے ساتھ رواں حالات کو جوڑ کر بیان کر رہا ہے اور قاری کو ماضی سے حال تک کی سیر کروانے کے ساتھ مستقبل کا خاکہ دکھا رہا ہے۔

''کربلا میں سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عظیم قربانی، وفا شعاری، جاں سپاری، سوزِ عشق اور جذبۂ وفا کی ایسی داستان ہے جو قیامت تک حق تعالیٰ شانہ کے خلاف و مالک، حاکم و مختار، محبوب و مطلوب اور مقصود و مشہود ہونے کی شہادت دیتی رہے گی۔ آپ رضی اللہ عنہ کربلا میں نہ آتے تو امت کو عزیمت و رخصت بلکہ صحیح اور غلط کا فرق معلوم نہ ہوتا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اولوالعزمی اور جرأت و استقامت نے امت کو یہ سبق دیا کہ جب طاقت سے ٹکرانے کا مرحلہ آئے تو مداہنت کی بجائے حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا راستہ اختیار کرنا اسوۂ حسینی رضی اللہ عنہ ہے، بلکہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ تو یہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت حسین رضی اللہ

عنہ کربلا میں جان دے کر دنیا کو یہ بتا گئے کہ سیدنا ابوبکر صدیق اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما خلفائے برحق اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے جانشین تھے۔ اگر ان کے کردار میں کسی قسم کی کمزوری یا وارثِ رسول اور امام امت ہونے میں کوئی شک ہوتا تو میرے والد علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی وہی کچھ کرتے جو میں آج کربلا میں کر رہا ہوں۔ شیر خدا رضی اللہ عنہ اپنی جان دے دیتے لیکن غلط کو غلط کہتے، وہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے مشیر و وزیر کسی بزدلی یا نفع اندوزی کے لیے نہیں بنے تھے بلکہ وہ صدقِ دل سے انہیں برحق سمجھتے تھے۔''

(مولانا محمد ازہر: روز نامہ اسلام کراچی، جمعہ 10 محرم الحرام 1432ھ 17 دسمبر 2010ء)

''جاہل اور وحشی کہلانے والے چنگیزی لشکروں نے اگر آج سے صدیوں پہلے بغداد کے کتب خانوں کو جلا کر راکھ کر دیا تھا تو دنیا میں علم و ہنر کی روشنی پھیلانے کے دعویدار تہذیب جدید کے امام بھی ان سے پیچھے نہیں بلکہ دو قدم آگے ہی ہیں۔ عراق پر امریکا اور اس کے اتحادی مغربی ملکوں کے قبضے کے فوراً بعد، کتابوں ہی کو نہیں، کتابیں لکھنے اور کتابیں پڑھانے والوں کو بھی صفحۂ ہستی سے مٹانے کا ایک نہایت منظم سلسلہ شروع ہوا جو اَب تک جاری ہے۔ پچھلے سات سال میں عراقی یونیورسٹیوں کے سینکڑوں پروفیسر صاحبان اس کا نشانہ بن چکے ہیں اور ہزاروں خوف زدہ ہو کر بیرون ملک جا چکے ہیں، مگر اس علم دشمن مہم کی تفصیلات بہت کم ہی سامنے آئی ہیں۔ بروسلز ٹریونل نامی ادارے کی ویب سائٹ پر دنیائے دانش کے ان ڈبو دیے جانے والے ستاروں کی ایک فہرست موجود ہے جسے حتمی تو نہیں کہا جا سکتا مگر اس میں پچھلے سال کے اواخر تک تمام دستیاب معلومات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ گزشتہ سال یعنی 2010ء میں بھی مختلف عراقی یونیورسٹیوں کے گیارہ پروفیسر نامعلوم قاتلوں کا نشانہ بنے۔ اس قتل عام کو فرقہ واریت سے نہیں جوڑا جا سکتا۔ عراق پر غاصبانہ قبضہ کرنے والی استعماری طاقتوں کی جانب سے ان واقعات کی روک تھام کی کوئی کوشش کی گئی نہ ان کے ذمہ داروں کو سامنے لانے کی۔ عراق کی اصل مقتدر قوتوں کا یہ رویہ اس شبہ کی پوری گنجائش فراہم کرتا ہے کہ علم دشمنی کی یہ مہم ان کی مرضی اور منشاء کے مطابق بلکہ ممکنہ طور پر ان ہی کی خفیہ ایجنسیوں کے ہاتھوں چل رہی ہے۔''

(ثروت جمال اصمعی: ''دورِ جدید کے چنگیز و ہلاکو'' روز نامہ جنگ کراچی، پیر 10 جنوری 2011ء)

٦-مفاجاتی ابتدائیہ:

بعض کالم نگار تمہید باندھنے کا تکلف نہیں کرتے، شروع ہی سے براہِ راست مقصد کی بات پر آجاتے ہیں۔ اس اچانک پن پر مشتمل اداریے کو ربط کے لفظ ''مفاجاتی'' (اچانک پن) کی طرف منسوب کرکے ''مفاجاتی ابتدائیہ'' کہا جاسکتا ہے۔

''وہ دونوں پھول تھے۔ گلاب اور چمپا میں بھی کیا حسن ہوگا جوان دونوں کو فطرت نے ودیعت کیا تھا۔ مشک اور عنبر میں بھی کیا خوشبو ہوگی جو خوشبوان کے بدنِ اطہر سے مہکتی تھی۔ یہ پھول گلشنِ انسانی کے مرہونِ منت نہ تھے بلکہ دستِ قدرت کا شاہکار تھے۔ ان کی ساخت پرداخت خانوادۂ نبوت میں کائنات کے سب سے حسین، سب سے جمیل، سب سے کریم اور سب سے خلیق انسان کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی اپنی نورِ چشم اور لختِ جگر سے فرمایا کرتے: ''میری خاطر میرے بیٹوں کو بلاؤ۔'' (جب وہ آجاتے) تو آپ انہیں سونگھا کرتے اور اپنے ساتھ چمٹا لیتے۔''

(مولانا محمد اسلم شیخوپوری: ''دو پھول'' ضربِ مومن، جمعہ 16 محرم 1432ھ 22 دسمبر 2010ء)

''جب سے میڈیا نے گڈ گورننس یعنی بہتر اندازِ حکومت کا شور مچانا شروع کیا ہے، میں ذاتی طور پر ایک مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ جہاں جاتا ہوں سب سے پہلے یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ یہ گڈ گورننس کیا شے ہے اور اسے کس کی سفارش سے حاصل کیا جاسکتا ہے؟ چونکہ ہمارے ملک میں کوئی کام سفارش کے بغیر نہیں ہوتا حتیٰ کہ سرکاری نرخ پر چینی خریدنے کے لئے اور سرکاری ہسپتالوں میں علاج کیلئے بھی سفارش کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید گڈ گورننس کا عہدہ بھی کسی کی سفارش سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ بیچارے پاکستانیوں نے نہ کبھی گڈ گورننس دیکھی ہے نہ ہی اس کا تجربہ ہوا ہے چنانچہ وہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہ کیا شے ہے؟''

(ڈاکٹر صفدر محمود: روزنامہ جنگ کراچی، منگل 14 دسمبر 2010ء)

٧-ڈرامائی ابتدائیہ:

اس سے مراد یہ ہے کہ کالم کے آغاز میں ایسی ڈرامائی کیفیت پیدا کی جائے جیسی قصہ کہانی

میں ہوتی ہے اور چونکہ انسانی فطرت خشک پن اور روایتی انداز سے زیادہ دلچسپ اور نرالا ہے۔عصر حاضر کے کچھ مشہور لکھاریوں نے اسے اتنا رواج دیا ہے کہ ان کی پہچان تفریح اور انفرادیت وانوکھے پن کی طرف مائل ہوتی ہے، اس لیے یہ اسلوب قاری کو چونکائے بغیر نہیں چھوڑتا۔اس چونکائے جانے کے نتیجے میں قاری کی جو توجہ کالم کو حاصل ہوتی ہے وہ ایسی سحر آفرین ہوتی ہے کہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر ساتھ لیے چلتی ہے اور کالم کے اختتام تک .....بشرطیکہ کالم میں آگے جا کر جھول نہ ہو.....اپنے ساتھ چپکائے رکھتی ہے۔ ''پھر کیا ہوا؟'' کا تجسس بھرا سوال اسے کالم آخر تک پڑھنے پر مجبور کیے رکھتا ہے۔

''میں آپ سے معافی کا طلبگار ہوں۔میری آج کی تحریر آپ کیلئے نہیں ہے۔میری آج کی تحریر صرف وکی لیکس کے موجد جولین کے لئے ہے، جولین کے دوستوں کے لئے ہے، جولین کے دشمنوں کے لئے ہے، جولین کے حواریوں کے لئے ہے، آپ سب کے لئے نہیں ہے۔میری آج کی تحریر اس لئے آپ کے لئے نہیں ہے کہ جولین نے انٹرنیٹ پر وکی لیکس میں جو انکشافات کئے ہیں وہ آپ کے اور میرے لئے چونکا دینے والے نہیں ہیں۔جولین اور اس کے حواری جانتے ہیں ہم اس سے کہیں زیادہ جانتے ہیں۔اگر میں یوں کہوں کہ ہم لوگ اپنے حاکموں، محکوموں، غلاموں اور غلام گردشوں کے بارے میں جتنا جانتے ہیں اس کے مقابلے میں وکی لیکس نے اپنے انکشافات میں رتی بھر باتیں بتائی ہیں۔ہم نے پہاڑ دیکھا ہے، وکی لیکس کے جولین نے ہمیں رائی کا دانہ دکھایا ہے۔ہم آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔وکی لیکس نے ہمیں چولہے کی آگ دکھائی ہے۔ہم نے آسمان کو ٹوٹ کر گرتے دیکھا ہے۔وکی لیکس نے ہمیں چھت میں پڑا ہوا شگاف دکھایا ہے۔''

(امر جلیل: روزنامہ جنگ کراچی، جمعہ 10 دسمبر 2010ء)

۸-استفہامی ابتدائیہ:

تحریر کی ابتدا میں کوئی ایسا سوال اٹھانا جو سننے والے کے تجسس کو ابھارے یا سسپنس پیدا کرے، یقیناً ایک جاندار آغاز ہے۔

اس کے وساطت سے کالم نگار شروع ہی سے قاری کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

''سقوط ڈھاکہ کیوں ہوا؟ یہ وہ سوال ہے جو گزشتہ 28 برس سے ہر پاکستانی کو کچوکے مار رہا ہے۔ ہم میں سے بے شمار لوگ اسے بھارت کی سازش قرار دیتے ہیں۔ کچھ امریکا کو مجرم گردانتے ہیں۔ بعض اسے مجیب الرحمٰن کی غداری قرار دیتے ہیں اور کچھ کا خیال ہے اس کے قصوروار جنرل یحییٰ خان، جنرل نیازی یا ذوالفقار علی بھٹو تھے۔ میں اس سے قطعاً اختلاف نہیں کر رہا تاہم میں سقوط ڈھاکہ کا ایک اور رخ آپ کے سامنے لانے کی کوشش کروں گا۔ مجھے معلوم ہے بنگلہ دیش کے قیام کے پیچھے بھارت کا ہاتھ تھا۔ مجیب الرحمٰن کی سول نافرمانی کی تحریک کے پس پردہ بھی بھارت تھا۔ میں جانتا ہوں بھارت مکتی باہنی اور علیحدگی پسندوں کو اسلحہ اور مدد فراہم کرتا رہا۔ امریکا بھی پاکستان توڑنے میں پیش پیش تھا۔ اقوام متحدہ بھی پاکستان کے خلاف تھی۔ جنرل یحییٰ خان کا کردار بھی محض پر جوش خطابات تک محدود رہا۔ جنرل نیازی نے ہتھیار ڈال کر پوری پاکستانی قوم اور فوج کی ناک کٹوا دی اور ذوالفقار علی بھٹو 8 دسمبر 1970ء کو آٹھ رکنی وفد کے ساتھ اقوام متحدہ کے اجلاس میں شرکت کے لیے روانہ ہو گئے۔ جنگ کے ان نازک ترین دنوں میں ذوالفقار علی بھٹو کی یہ تاخیر بھی بہت سارے سوالات کو جنم دیتی ہے... لیکن اس سب کے علاوہ دو باتیں بڑی حیران کن ہیں۔ ہمیں اس کے لیے ایک بار پھر تاریخ کے چند گوشوں میں جھانکنا ہوگا۔''

(یاسر محمد خان: ''16 دسمبر کی تلاش''ضرب مومن، جمعہ 16 محرم 1432ھ 22 دسمبر 2010ء)

۹- مکالماتی ابتدائیہ:

مکالمہ اور گفتگو سے بھی کالم کا آغاز ہوتا ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ مکالمے چست، برمحل اور برجستہ ہوں۔ ان کی تاریں کسی ہوئی ہوں اور بامحاورہ گفتگو کی چٹنی سے انہیں ذائقہ دار بنایا گیا ہو۔

''ایک دوست نے دوسرے سے پوچھا'' کرنٹ کسے کہتے ہیں؟''

دوست نے جواب دیا'' بجلی کی ننگی تار کو ہاتھ لگاؤ تو خود پتا چل جائے گا؟''

اب معلوم نہیں اس دوست نے بجلی کی تار کو ہاتھ لگایا یا نہیں اگر لگایا ہوگا تو اسے انتہائی حد تک

مایوسی ہوئی ہوگی یا اس کی معلومات میں غلط اضافہ ہوا ہوگا کیونکہ اگر وہ انتہائی حد تک بے وقوف ہوا تو پھر یہی سمجھے گا کہ کھردری تاروں پر لگے ہوئے زنگ کو کرنٹ کہا جاتا ہے بصورت دیگر تھوڑی بہت عقل ہوئی تو مایوسی کا سامنا ہوجانا لازمی امر ہے کہ اسے جھٹکا تو لگا ہی نہیں تو پھر کرنٹ کس کو کہا جاتا ہے۔ ''کرنٹ افیئر'' کیا ہوتا ہے؟ اس کا ترجمہ یا تشریح کوئی بھی پڑھا لکھا شخص کرسکتا ہے، مگر ان دنوں کرنٹ افیئر صرف یہی ہے کہ بجلی کی تاروں میں ''کرنٹ'' نہیں ہے۔''

(لوڈشیڈنگ، شوکت علی مظفر، قلم زوریاں: ضرب مومن)

۱۰۔ شعری ابتدائیہ:

اچھے اور بامعنی شعر یعنی جو حکمت کی کسی بات پر مشتمل ہوں، کالم کی ابتدا کے لیے اچھی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی اپنے ایک کالم کا آغاز کچھ یوں کرتے ہیں:

''منیر نیازی نے کہا تھا:

فروغ اسم محمد ہو بستیوں میں منیر
پرانی یاد نئے مسکنوں سے پیدا ہو

یہ نیا مسکن پاکستان تھا۔ یہیں سے فروغ اسم محمد ہونا تھا اور قرآنی تعلیمات کی روشنی یہیں سے پھیلنا تھی، لیکن اس کی تشریحات میں قوم کو اتنا الجھا دیا گیا اور ایسی تاویلات سے کام لیا گیا جس کا ذکر اقبال کے ہاں ان اشعار میں ملتا ہے:

ز من بر صوفی و ملا سلامے
کہ پیغام خدا گفتند را

(ترجمہ: میری طرف سے صوفی و ملا کو سلام کہ انہوں نے خدا کا پیغام ہم تک پہنچایا)''

(شہر آشوب، عطاء الحق قاسمی: روزنامہ جنگ، ہفتہ 15 جنوری 2011ء)

کالم کا اختتامیہ

کالم کا اختتام بامعنی اور نتیجہ خیز ہو تو وہ قاری پر بہت اچھا اثر چھوڑتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس نے جو وقت کالم خوانی میں صرف کیا، وہ اسے بارآور ہوتا محسوس ہوتا ہے بلکہ وہ کالم نگار کے دیے گئے لائحہ عمل یا دوٹوک اور واضح رائے کی بنا پر اسے اپنا مربّی و رہنما اور صاحب فکر و دانش شخصیت سمجھنے لگتا ہے۔ کالم نگار کی مقبولیت کا اس سے کارگر نسخہ اور اس کی محنت کا ایسا فوری صلہ اور کیا ہوگا؟ کالم نگار کا اصل ہدف اور اس کی تحریر کی معنویت و مقصدیت بھی بہت حد تک اس پر موقوف ہے کہ وہ کالم کا اختتام کسی نکتہ تک رسائی اور کسی پیغام کے ابلاغ پر کرے۔ اختتامی پیرا شروع ہوتے وقت کالم کی سحر آفرینی یا اس کا کلائمکس اپنے عروج پر ہوتا ہے، ایسے وقت اگر بات ادھوری چھوڑ دی گئی یا تحریر کا مقصد و نتیجہ واضح نہ ہوا یا پڑھنے والے کی متجسس حس کی تسکین نہ کی گئی تو وہ یوں سمجھا جائے گا جیسے بہت اچھی ضیافت یا خوشگوار ملاقات کا اختتام پھیکا اور بدمزہ ہو گیا ہے۔ کالم کا عنوان عموماً اس کے ابتدائیے یا اختتامیے سے لیا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک ایسی وجہ ہے جو ان حصوں کو زوردار اور بھرپور انداز سے نبھانے پر زور دیتی ہے۔

اختتامیہ کا کوئی لگا بندھا فارمولا یا متعین اسلوب نہیں۔ کالم نگار کی تخلیقی صوابدید اور فطری سوجھ بوجھ اسے بات کو کسی موڑ تک پہنچا کر چھوڑنے کے لیے کوئی بھی عمدہ اور اچھوتا اسلوب سجھا دیتی ہے۔ آپ آج کے بعد سے چند دنوں تک کالموں کے صرف اختتامیے مطالعہ کریں. چند دنوں تک ایسا کرنے سے آپ اچھی طرح سمجھ لیں گے کہ اختتامیے کالم کا نچوڑ یا عرق، خلاصہ یا نتیجہ کیوں کہا جاتا ہے۔ چند اختتامیے بطورِ مثال ہم بھی پیش کر دیتے ہیں:

(۱)

''میں ان مدارس کے منفی اور مثبت پہلوؤں کی تفصیل میں جائے بغیر اتنا جانتا ہوں کہ وطن

عزیز کی لاکھوں مساجد، ان کے دم سے آباد ہیں۔ معاشرے میں دینی اقدار کی کارفرمائی ان کی مساعی سے ہے۔ پانچوں وقت ملک کی فضاؤں میں بکھرنے والی اذانوں کی مشک بُو گونج انہی مدارس کی عطا ہے اور دلوں کو دائمی راحتیں بخشنے والے کلامِ الٰہی کی پرسوز قراءت، جس نے عمر رضی اللہ عنہ کے اندر کو بدل دیا تھا، انہی مدارس کا فیضان ہے۔ آپ بے شک نئے ایچی سن، نئے ایڈورڈ اور نئے بیکن ہاؤس بنایئے اور انہیں کروڑوں کے فنڈز دیجیے، لیکن کچے گھروندوں میں فروکش ان بوریانشینوں کو نہ چھیڑیے جو آپ سے کچھ نہیں مانگتے، صرف دین حق کی اشاعت کا حق چاہتے ہیں۔ برقی قمقموں کی چکاچوند سے متاثر ہوکر مٹی کے ان دیوں کو نہ بجھایئے جن کی ٹمٹماتی لو میں ہماری صدیوں کی روایات دمک رہی ہیں۔''

(مٹی کے دیے، عرفان صدیقی، روزنامہ جنگ: جمعرات 14 جمادی الاول 1423ھ، 25 جولائی 2002ء)

(۲)

''محترم قارئین! کمزوری دنیا کا سب سے بڑا جرم ہوتا ہے۔ اس کائنات، اس دنیا مین صرف اور صرف وہ جاندار زندہ رہتے ہیں جن کے پنجے، دانت اور کھال مضبوط ہوتی ہے یا پھر وہ جو دوسرے جانداروں سے تیز بھاگ سکتے ہیں۔ یہ اصول انسانوں اور قوموں پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ ہم اگر یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری عاجزی، ہماری کمزوری اور ہماری سستی ہمیں بچالے گی تو یہ ہماری خام خیالی ہے، کیونکہ اگر آنکھیں بند کرنے سے خطرے ٹل سکتے تو دنیا کی ساری بلیاں بھوکی مرجاتیں اور سر ریت میں دبالینے سے طوفان ٹل سکتے تو دنیا کے کسی شتر مرغ کو موت نہ آتی اور خواتین وحضرات! یہ بھی طے ہے ہم جب تک کھڑے نہیں ہوں گے، ہم اپنے اندر انکار کی جرأت پیدا نہیں کریں گے، ہم ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح نہیں دیں گے اور ہم جب تک روکھی سوکھی کھانے اور آبرو کے ساتھ زندہ رہنے کا فیصلہ نہیں کریں گے، ہم اس وقت تک ڈرونز سے نہیں بچ سکیں گے۔''

(ڈرونز، یاسر محمد خان: 07اپریل 2009ء)

(۳)

''دنیا کی کسی قوم میں وہ صفت نہیں جو اہلِ پاکستان میں ہے۔ ہر قوم میں کوئی ایک آدھ وصف ہوتا ہے۔ یہاں ایسی کئی اقوام ہیں جن کے ممتاز اوصاف باہم مل کر جینیس لوگوں کی سب سے بڑی تعداد کو جنم دیتے ہیں۔اس سے پوری دنیا خائف ہے۔ چنانچہ سب سے زیادہ تحریک کے قابل وزارت بہبود آبادی کی وزارت قرار دی گئی ہے۔ ذرا سوچیے! جس قوم کو قدرت نے طرح طرح کے قبیلوں اور نسلوں کا مجموعہ بنایا تھا تاکہ وہ اسلام اور عالمِ اسلام کے غلبہ کے لیے قیادت کا فرض انجام دے، وہ نسل ماری کی خودکش مہم کو خود اپنے ہاتھوں زور وشور سے پایۂ تکمیل تک پہنچا رہی ہے۔ اے میری قوم! تو خدا کی کس کس نعمت کو جھٹلائے گی؟ اے میری قوم کے لوگو! کیا تم اپنے ہاتھوں غلبہ کلی کے امکانات کو اس وقت تک ختم کرتے رہو گے جب تک تمہارے خلاف آسمانوں پر فیصلے نہیں ہو جاتے.....؟؟''

(نسل ماری کی خودکش مہم، مفتی ابولبابہ شاہ منصور: ضرب مومن، جمادی الاولیٰ 1425ھ)

اچھے کالم کی خوبیاں

کالم کی زبان اور بیان میں ایسی کون سی خوبیاں ہیں جو انہیں کالم بناتی ہیں؟ اس کے جواب بھی مختلف ہو سکتے ہیں کیونکہ ہر کالم کا اسلوب مختلف ہوتا ہے۔ اگر ایک ہی کالم نویس کسی مزاحیہ موضوع پر قلم اٹھائے تو اس کا کالم کچھ اور قسم کا ہوگا جبکہ وہی کالم نویس جب تعزیتی کالم لکھے گا تو اس کا اسلوب یقیناً مختلف ہوگا۔ ہم اس امر کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے کہ اچھے کالم نویسوں کے کالموں میں ایسی کون سی خوبیاں ہوتی ہیں جو انہیں مقبول بناتی ہیں۔

(۱) صحت زبان:

کالم نویس کو صحت زبان کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ کالم کی زبان قواعد کے اعتبار سے بھی درست ہونی چاہیے۔ بعض اوقات املا کی غلطیاں بہت خوفناک ثابت ہوتی ہیں۔ ہجوں کی غلطیوں یا رموز اوقاف کو صحیح جگہ پر نہ لگانے سے بھی تحریر کا مطلب کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔

اگر ہم دنیائے صحافت میں کامیابی حاصل کرنے والے کالم نویسوں کے کالموں کا تجزیہ کریں تو ان میں سے بیشتر کالم نویسوں نے اپنے دور کی زبان میں کالم لکھے ہیں۔یعنی آج سے پچاس سال پہلے جو اردو لکھی جاتی تھی وہ آج سے سو سال پہلے لکھی جانے والی اردو سے مختلف تھی۔اسی طرح آج جو اردو لکھی جا رہی ہے وہ ماضی کی اردو سے مختلف ہے۔اس طرح جس زمانے میں کالم نویس سانس لیتا ہے،اسے اس زمانے کی زبان میں ہی کالم لکھنا چاہیے۔

(۲) سلاست:

کالم سادہ اور سلیس ہونا چاہیے، کیونکہ یہ کم پڑھے لکھے قارئین کے لیے بھی ہوتا ہے۔اگر کالم نویس محض اپنی قابلیت اور علمیت کا رعب جھاڑنے کے لیے مشکل اور ثقیل الفاظ استعمال کرے گا تو اسے قارئین میں مقبولیت حاصل نہیں ہوگی۔کالم نویس کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس نے کوئی علمی مقالہ نہیں بلکہ کالم لکھنا ہے۔یہ کالم اخبار میں شائع ہونا ہے اور اسے صرف خواص نے نہیں، عام قارئین نے بھی پڑھنا ہے۔

(۳) اسلوب:

اچھے کالم نویس کا ایک مخصوص اسلوب ہوتا ہے۔اسلوب کیا ہے؟ زبان کے اچھے استعمال سے اپنے خیالات مؤثر و منفرد بنانے کو''اسلوب'' کہا جاتا ہے۔

بعض ادیب اسلوب کے منفرد ہونے پر زور دیتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں اس سے ایک انفرادی طریق احساس کا اظہار ہوتا ہے۔ان کی رائے میں بہتر اسلوب وہی ہوتا ہے جو ہمیں لازمی اور ناگزیر محسوس ہو اور جسے دیکھتے ہی ہم اس بنیادی احساس تک پہنچ سکیں جو اس اسلوب سے منسوب ہو۔

مولانا عبدالمجید سالک تحریر کے اسلوب کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ان کے بقول:

"مطالعہ انسان کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافے کا باعث ہوتا ہے اور اس سے اسلوب بنتا ہے۔ جس آدمی کی معلومات جتنی وسیع ہوں گی اس کا اسلوب تحریر اتنا ہی صاف ستھرا ہوگا۔"

ایک ماہر فن چار چیزوں کو اسلوب کی بنیاد قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ادیب کی سوچ اس کا بیش قیمت سرمایہ ہے جسے الفاظ کا انتخاب، ان کا استعمال اور خیالات کا تسلسل، حسن بخشتا ہے۔ ان چار بنیادی چیزوں کے بغیر اسلوب نہیں بنتا۔ اگر سوچ منفرد اور معیاری نہیں تو محض لفاظی کب تک سہارا دے گی؟ الفاظ کا انتخاب صحیح نہیں تو مضمون کا مفہوم بدل سکتا ہے۔ اگر ادبی اصطلاحات استعمال نہیں ہوتیں تو حسن پیدا نہیں ہوتا اور اگر ان کی ترتیب نہ ہو تو اجزا ٹوٹ جاتے ہیں اور ٹوٹے ہوئے موتی بازار میں کوئی قیمت نہیں پاتے۔"

اچھے کالم کا اسلوب دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کس نے لکھا ہے؟ خواہ اس کے ساتھ اس کا نام نہ بھی شائع ہوا ہو۔

(٤) شگفتگی:

شگفتگی کو کالم نویس کا ہتھیار قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے کالم نویس اپنی انفرادیت منواتا ہے۔ لیکن یہ ہے کیا؟ یہ کھٹاس و مٹھاس کا متوازن امتزاج ہے۔ شورش کاشمیری اس کے متعلق کہتے ہیں:

"مزاح، دشنام نہیں اور نہ ہی مسخرہ پن ہے۔ مزاح کی خوبی یہ ہونی چاہیے کہ جس شخص کی آپ چٹکی لے رہے ہیں، وہ خود بھی لذت اندوز ہو...... یا ترشی اتنی ہونی چاہیے جتنا ہلکے ہلکے بخار کا سرور ہوتا ہے۔"

کالم میں شگفتگی پیدا کرنا ایک مشکل معاملہ ہے کیونکہ مزاح کو الفاظ میں بیان کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ ایک قہقہے کو دہرانا، لیکن یہ مزاح ہی ہے جو تحریر کی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے کیونکہ ہر قاری ہنسنے یا مسکرانے کو پسند کرتا ہے، لہٰذا کالم نویس کو ہلکے پھلکے چٹکلوں، بامعنی طنز و مزاح اور چھوٹی موٹی حکایات و لطائف سے شگفتگی کا عنصر کالم میں سمونے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(٥) اختصار:

مولانا محمد علی جوہر سے ایک مرتبہ کسی نے کہا آپ مختصر لکھا کریں۔ انہوں نے کہا: ''میرے پاس مختصر لکھنے کے لیے وقت نہیں ہوتا۔'' کالم نویسی کے لیے اختصار بے حد ضروری ہے کیونکہ کالم نویس کو تقریباً ایک ہزار الفاظ میں اپنی بات مکمل کرنا ہوتی ہے۔ اگر کالم طویل ہو جائے تو وہ کالم

نہیں رہتا بلکہ مضمون نما چیز بن جاتا ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ معروف کالم نویسوں نے کئی قسطوں پر مبنی کالم بھی لکھے ہیں لیکن اس ضمن میں اختصار کو بہر حال ترجیح دی جاتی ہے۔

(٦) انوکھا پن:

کالم میں انوکھا پن ہونا چاہیے۔ یہی خوبی اسے دوسرے کالموں سے منفرد کر کے مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے، لیکن اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ کالم نویس عجائبات کو ہی اپنے کالم کا موضوع بنائے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کالم میں کوئی نہ کوئی ایسی بات بھی بتائی جانی چاہیے جسے قاری پہلے سے جانتا ہو لیکن اب بھول بیٹھا ہو یا ایسی بات جو اس کے لیے عجیب اور انوکھی ہو۔ اگر کالم نویس قارئین کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جائے کہ وہ انہیں چونکا سکتا ہے اور ان کے لیے انوکھی معلومات سے آگاہی کا ذریعہ بن سکتا ہے تو اس سے قارئین کو ایک طرح کی مسرت کا احساس ہوگا اور وہ کالم نویس کے خیالات کو اپنے خیالات سمجھ کر اپنائیں گے۔

(٧) منطق اور دلیل:

کالم میں منطق اور دلیل سے بھی کام لیا جاتا ہے، لیکن کالم کی منطق اور دلیل ریاضی کے علم جیسی نہیں ہوتی، جہاں دو اور دو ہمیشہ چار ہوتے ہیں بلکہ اس میں شاعری جیسا انداز ہوتا ہے۔ جس میں کچھ پابندیاں تو ضرور ہوتی ہیں مگر یہ پابندیاں شاعری کے تاثر اور حسن کو بڑھانے کے لیے ہوتی ہیں۔ اسی طرح کالم میں منطق اور دلیل کالم کو بہتر بنانے کے لیے ہوتی ہے۔ اگر انہیں زیادہ استعمال کیا جائے تو تحریر غیر دلچسپ ہو جاتی ہے۔

(٨) تکلف سے پرہیز:

کالم عموماً ایسے لکھا جاتا ہے جیسے دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگائی جا رہی ہو۔ اس میں تکلف سے پرہیز ضروری ہے اور اپنائیت کے احساس کو اس کی خوبی قرار دیا جاتا ہے، مگر کالم نگار کی بے تکلفی میں عامیانہ پن نہیں ہونا چاہیے۔ کامیاب کالم اس صورت میں لکھے جا سکتے ہیں جب کالم نویس کا قلم تصنع سے پاک ہو، اسے عوام کی نفسیات اور ان کے احساسات کا شعور ہو اور وہ ان کے

متعلق ہمدردی اور خلوص کے ساتھ غور وفکر کرے۔

کالم لکھنے کے بعد

جب کالم لکھ لیں تو اس کے بعد کیا کرنا چاہیے؟ نوآموز کالم نویس سمجھتے ہیں کہ کالم لکھنے کے بعد ان کا کام ختم ہوجاتا ہے اور مدیر کا کام شروع ہوجاتا ہے، مگر ماہرین صحافت کا کہنا ہے کہ یہ بات درست نہیں ہے۔ کالم لکھنے کے بعد کم ازکم اسے ایک مرتبہ ضرور پڑھنا چاہیے۔ کالم کا دوبارہ جائزہ لیتے ہوئے اگر درج ذیل امور کا خیال رکھا جائے تو اس سے بہتر نتائج حاصل ہوسکتے ہیں:

(۱) تصحیح:

بعض اوقات کالم نویس کا ذہن اتنی تیزی سے کام کرتا ہے کہ اس کا قلم ذہن کا ساتھ نہیں دے پاتا اور بہت سے الفاظ تحریر ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ اس لیے کالم کا دوبارہ مطالعہ کرتے ہوئے اس امر کا خیال رکھیں کہ کہیں کوئی لفظ رہ نہ جائے یا اگر کوئی لفظ بلاضرورت لکھا گیا ہو تو اسے کاٹ دیا جائے۔

(۲) اعادہ:

کالم میں کاٹ چھانٹ اتنی زیادہ ہوجائے کہ کمپوزر کو اس کے لکھنے میں دقت پیش آنے کا امکان ہو تو اسے دوبارہ صاف صاف لکھنا چاہیے۔ کالم دوبارہ لکھتے ہوئے اس میں اچھے اضافے بھی کیے جاسکتے ہیں اور غیر ضروری چیزوں کو حذف بھی کیا جاسکتا ہے۔ بعض کالم نویسوں کا کہنا ہے کہ اگر وہ کالم دوبارہ لکھیں تو اکثر نیا کالم وجود میں آجاتا ہے۔ بہرحال جو بھی صورت ہو، یہ ایک حقیقت ہے کہ دوبارہ کالم لکھنے سے اکثر اس کی شکل بہتر ہوجاتی اور نکھر جاتی ہے۔

(۳) مراجعت:

کالم نویس کو لغت سے استفادے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ اگر کسی لفظ کے متعلق شبہ ہو کہ اس کے ہجے یا املا درست نہیں یا یہ مناسب طور پر استعمال نہیں ہو رہا تو اس سلسلے میں لغت سے مدد لینی چاہیے۔ اسی طرح اگر آپ کالم میں اعداد وشمار یا تاریخی وتحقیقی معلومات دے

رہے ہیں تو ان کے درست ہونے کا یقین کرنے کے لیے متعلقہ مراجع سے استفادہ ضرور کرنا چاہیے۔اس سلسلے میں ماہرین سے مشورہ کرنے میں بھی جھجک محسوس نہیں کرنا چاہیے۔

(٤) جائزہ:

کالم نویس کو مدیر کی نظر سے بھی کالم پڑھنا چاہیے۔اس میں اگر کوئی ایسی بات ہو جو کسی وجہ سے اخبار کی پالیسی کے خلاف ہو تو اسے کم از کم اس چیز کو ایسے انداز میں ضرور پیش کرنا چاہیے جس سے اخبار کی انتظامیہ کی توقعات اور قارئین کے جذبات مجروح نہ ہوں۔اگرچہ کالم نویس کو کالم لکھنے کے سلسلے میں خاصی آزادی ہوتی ہے اور اس کے کالم کے متعلق مدیر کا اختیار محدود ہوتا ہے یا بالکل نہیں ہوتا،لیکن اس کے باوجود اگر مدیر یہ محسوس کرے کہ اس کالم کی اشاعت سے اخبار کی ساکھ متاثر ہونے کا خطرہ ہے تو وہ کالم میں ایسی تبدیلیاں کرتا ہے جس سے وہ کالم قارئین اور اخبار کے لیے قابل قبول ہو جاتا ہے۔اگرچہ ایسی صورت میں اہم کالم نویس بہت احتجاج کرتے ہیں،لیکن ایک ایسے آدمی کو مطمئن کرنا مدیر کے لیے آسان ہے جو اس کے ادارے سے وابستہ ہو بہ نسبت لاکھوں ایسے قارئین کو مطمئن کرنے کے جن سے رابطہ اور معذرت اس کے لیے ایسا سر درد ثابت ہو سکتی ہے جس کا علاج نہ ہو۔

(٥) تلافی:

کالم کو قارئین کی نظر سے بھی پڑھنا چاہیے۔اگر ایسا محسوس ہو کہ کسی جگہ کالم کے مندرجات کا ابلاغ قارئین تک نہیں ہوگا یا کم ہوگا تو اس صورت میں کالم کی اس خامی کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔بعض کالم نویس ذومعنی باتوں سے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ذومعنی باتوں کے استعمال سے ابہام رہ جانے کا اندیشہ رہتا ہے،کیونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک بات کو جس طرح کالم نویس محسوس کرتا ہو،اسی طرح عام قاری محسوس کرے۔اس لیے ذومعنی جملے لکھیں ضرور،یہ کالم کا حسن شمار ہوتے ہیں،لیکن ان میں اتنا ابہام نہ ہو کہ قاری اُلجھن محسوس کرنے لگے۔

(٦) مشورہ یا مشاورتی اصلاح:

نوآموز کالم نویس کے لیے یہ بڑی خوش نصیبی سمجھی جاتی ہے کہ اسے کسی ایسی شخصیت کی

رہنمائی حاصل ہو جائے جو اس کی خام تحریر کو اپنی اصلاح سے کندن بنا دے یا ایسا دوست میسر ہو جائے جسے وہ کالم دکھا کر مشورہ لے سکے اور اس کی ''مشاورتی اصلاح'' کی روشنی میں اپنے کالم کو بہتر سے بہتر کر سکے۔ بعض مشہور کالم نویس بھی کالم لکھنے کے بعد اپنے کسی دوست یا صاحبِ علم شخصیت کو دکھا کر مشورہ لیتے ہیں اور اگر مناسب معلوم ہو تو مشورے کی روشنی میں اپنے کالم میں ضروری ترمیم بھی کر لیتے ہیں۔

کالم کیسے شائع کروایا جائے؟

کالم لکھنے کے بعد اس کی اشاعت کا مرحلہ آتا ہے جو ایک مستقل معرکہ ہے۔ لیکن گھبرائیے نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر مشکل کا حل ضرور پیدا کیا ہے۔ بس ہمت اور مستقل مزاجی سے اس حل کو تلاش کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔

یاد رکھیے! ہر اخبار کے ایڈیٹر کو اور ہر صفحے کے انچارج کو بہتر سے بہتر تحریر کی تلاش رہتی ہے۔ اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے قارئین کے سامنے نئی سے نئی اور عمدہ سے عمدہ تحریر پیش کرے تاکہ اس کے صفحے اور اخبار کا معیار بہتر ہو اور اس کی ریٹنگ بڑھے۔ چنانچہ ایڈیٹر یا انچارج کی میز پر آنے والی تحریریں لازمی طور پر ایڈیٹر یا معاون ایڈیٹر کی نظر سے گزرتی ہیں۔

بعض اوقات تحریر بہت عمدہ ہوتی ہے۔ اس میں پیش کیا گیا آئیڈیا بھی زبردست ہوتا ہے، لیکن نوآموز کالم نگار سے تعارف نہ ہونے کی وجہ سے وہ تحریر روک لی جاتی ہے، چنانچہ نوآموز لکھاریوں کو چاہیے کہ وہ اخبارات کے ایڈیٹرز اور مختلف صفحات کے ذمہ داروں سے روابط پیدا کریں۔

رابطے کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ دفتر جا کر ایڈیٹر اور انچارج صفحات سے بالمشافہ ملاقات کریں، اپنا تعارف کروائیں اور بتائیں کہ میں لکھنے لکھانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ نیز 3 تحریریں بھی ساتھ لے جائیں۔ یہ تینوں تحریریں 3 مختلف موضوعات پر لکھی ہوئی ہونی چاہییں۔ جب آپ کا تعارف ہو جائے گا تو پھر جب بھی آپ کی کوئی تحریر ایڈیٹر کی میز پر جائے گی تو ترجیحی بنیاد پر جگہ پائے گی۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کالم کے ساتھ اپنا پورا مختصر سا، لیکن جامع تعارف بھی لکھا جائے۔اصل نام، قلمی نام رابطہ نمبر اور شناختی کارڈ نمبر لازمی لکھا ہوا ہونا چاہیے، کیونکہ بعض اوقات کوئی بات سمجھنے کے لیے رابطے کی فوری ضرورت پیش آتی ہے۔اور یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس نئے لکھنے والے کا تعلق کہیں مطلوب افراد میں سے تو نہیں ہے۔جب شناختی کارڈ اور موبائل نمبر ہوگا تو آسانی سے تحقیق کر کے تشفی کر لی جائے گی۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی تیسرے شخص کے ذریعے اپنا تعارف کروایا جائے۔وہ تیسرا شخص آپ کے بارے میں ایڈیٹر اور صفحات کے انچارج کو بتائے کہ یہ اچھا لکھنے والے ہیں اور آپ کے صفحات کے لیے لکھنے کے خواہش مند ہیں۔تعلق اور روابط پیدا کرنے کے ان کے علاوہ اور طریقے بھی ہو سکتے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ آپ نے کسی نہ کسی طریقے سے ایڈیٹر، سب ایڈیٹر اور خصوصی صفحات کے ذمہ داروں اور ان کے معاونین سے اپنا تعارف کروانا ہے۔تعارف کے بعد آپ کی تحریر کے شائع ہونے کے امکانات روشن ہو جائیں گے۔صفحات پر جب بھی جگہ نکلے گی تو آپ کی تحریر ترجیحی بنیادوں پر شائع کی جائے گی۔

ذیل میں ہم آپ کو اہم عالمی و اسلامی دنوں کی فہرست دے رہے ہیں۔آپ ان دنوں سے پہلے ہی متعلقہ موضوع پر کالم لکھ کر تیار رکھیں۔اور عین اس وقت جب اخبار کو اس موضوع پر کالم یا مضمون کی ضرورت ہو، اہتمام کے ساتھ روانہ فرما دیں۔ان شاء اللہ آپ کی یہ مربوط کوششیں رنگ لائیں گی۔

اہم اخبارات کی ویب سائٹس اور ای میل ایڈریس

اخبار کا نام	ای میل ایڈریس
ہفت روزہ ضرب مؤمن	www.zarbmomen.com
	zarbmomen@gmail.com
روزنامہ اسلام	www.dailyislam.pk
	editorial@dailyislam.pk
روزنامہ جنگ	www.jang.com.pk
	pr.khi@janggroup.com.pk
روزنامہ ایکسپریس	www.express.com.pk
روزنامہ امت	www.ummat.com.pk
	info@ummatpublication.com.pk
روزنامہ نوائے وقت	www.nawaiwaqt.com.pk
	editor@nawaiwaqt.com.pk
روزنامہ دنیا	www.dunya.com.pk
	info@dunya.com.pk
روزنامہ آج کل	www.aajkal.com.pk

اہم ایام

تاریخ	خصوصی دن	تاریخ	خصوصی دن
یکم جنوری	نیوایئر ڈے	5 فروری	یوم یکجہتی کشمیر
14 فروری	بسنت ڈے	14 فروری	ویلنٹائن ڈے
8 مارچ	خواتین کا عالمی دن	16 مارچ	یوم راچل کوری
20 مارچ	سقوط بغداد۔امریکہ	23 مارچ 1940	قرارداد پاکستان
23 مارچ 1956	پاکستان کے پہلے دستور کا اعلان کیا گیا	23 مارچ 1956	پانی کا عالمی دن
24 مارچ	عالمی تپ دق دن	1 اپریل	اپریل فول
11 اپریل	ماؤں کا عالمی یوم صحت	21 اپریل	یوم وفات علامہ اقبال
30 اپریل	یوم شہداء افواج پاکستان	مئی کا پہلا ہفتہ	یوم اساتذہ
1 مئی	مزدوروں کا عالمی دن	1 مئی	یوم القدس
2 مئی	شہادتِ شیخ اسامہ بن لادن	3 مئی	یوم آزادی صحافت
4 مئی	یوم شہادت ٹیپو سلطان	6 مئی	یوم شہدائے بالاکوٹ، سید احمد شہید
13 مئی	مدر ڈے	19 مئی	عالمی ہیپاٹائٹس ڈے
25 مئی	گم شدہ بچوں کا عالمی دن	28 مئی	یوم تکبیر
28 مئی	یوم تصحیح قبلہ	31 مئی	عالمی یوم انسدادِ تمباکو
1 جون	بجٹ، بچوں کا عالمی دن	15 جون 1988	جنرل ضیاء الحق کی جانب سے شریعہ آرڈیننس کا نفاذ

26جون	عالمی یوم انسداد منشیات وغیر قانونی اسمگلنگ	26جون	عالمی یوم برائے تشدد کا خاتمہ
1جولائی	بینک ہالیڈے	4جولائی	یوم آزادی امریکا
11جولائی	عالمی یوم آبادی	18جولائی	فادرڈے
6اور 9اگست	ہیروشیما ناگاساکی	14اگست	یوم آزادی پاکستان
4ستمبر	عالمی یوم حجاب	6ستمبر	یوم دفاع
7ستمبر	یوم تحفظ ختم نبوت	7ستمبر	یوم فضائیہ
8ستمبر	یوم بحریہ	8ستمبر	عالمی یوم خواندگی
16ستمبر	یوم شتیلہ وصابرہ	11ستمبر	ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی
11ستمبر	یوم وفات بابائے قوم قائد اعظم	20ستمبر	فتح بیت المقدس
5 2ستمبر 1969	یوم تاسیس او آئی سی(OIC)	1اکتوبر	بزرگوں کا عالمی دن
5اکتوبر	یوم اساتذہ	7اکتوبر	افغانستان پر جارحیت
8اکتوبر	یوم زلزلہ کشمیر	16اکتوبر	یوم شہادت لیاقت علی خان
17اکتوبر	عالمی غربت کے خاتمے کا دن	24اکتوبر	یوم تاسیس آزاد جموں وکشمیر
24اکتوبر	یومِ اقوامِ متحدہ	27اکتوبر	بھارتی تسلط کیخلاف اہل کشمیر عالمی یوم سیاہ مناتے ہیں
9نومبر	یوم سقوط جونا گڑھ	9نومبر	یوم ولادت علامہ اقبال
11نومبر	یوم سقوط حیدرآباد دکن	12نومبر	سقوط کابل

14 نومبر	عالمی یوم ذیابیطس	16 نومبر	رواداری و ہم آہنگی کا بین الاقوامی دن
6 دسمبر	سندھی ٹوپی	10 دسمبر	عالمی یوم حقوق انسانی
16 دسمبر	سقوط ڈھاکہ	25 دسمبر	یوم پیدائش محمد علی جناح
25 دسمبر	کرسمس		

تاریخ اسلامی

تاریخ	خصوصی دن	تاریخ	خصوصی دن
1 محرم الحرام	شہادت فاروق اعظمؓ	10 محرم الحرام	عاشورہ
10 محرم الحرام	شہادت حسینؓ	28 صفر	وفات صلاح الدین ایوبی
ربیع الاول	یوم ولادت النبی	22 جمادی الثانیہ	وفات صدیق اکبر
22 رجب	وفات امیر معاویہ	28 رجب 1342ھ	سقوط خلافت عثمانیہ
15 شعبان	شب براءت	1 رمضان	رمضان ایڈیشن
17 رمضان	یوم بدر	شعبان، رمضان	زکوۃ ایڈیشن
17 رمضان	وفات حضرت عائشہؓ	21 رمضان	وفات حضرت علیؓ
1 شوال	عید الفطر	18 رمضان	یوم فتح مکہ
10 ذی الحجہ	عید الاضحیٰ	8 ذی الحجہ	یوم الترویہ
9، 10، 11، 12، 13 ذی الحجہ	عشرہ ذی الحجہ: فضائل و احکام ایڈیشن، ایام تشریق	9 ذی الحجہ	یوم عرفہ
18 ذی الحجہ	یوم شہادت عثمان غنی		

کالم شائع ہونے کے بعد

جب کالم شائع ہو جائے تو اسے ایک مرتبہ ضرور پڑھنا چاہیے کیونکہ بعض اوقات کمپوزنگ یا کسی دوسری غلطی کی وجہ سے کالم کا مفہوم ہی تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ شائع ہو جاتا ہے یا پیراگراف ہی آگے پیچھے ہو جاتا ہے۔ ان غلطیوں کا انکشاف کالم کی اشاعت کے بعد ہی ہوتا ہے۔ چونکہ آپ کے قلم کاری کا شغل اور کالم نگاری کا عمل صرف اور صرف حق کی تبلیغ اور خیر کی اشاعت کے لیے اپنایا تھا۔ اس لیے آپ کے لیے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ضروری ہے کہ آپ خلوص دل سے اپنی لفظی اور معنوی خامیوں کا جائزہ لیں۔ کسی صاحب علم وقلم سے اصلاح لیں اور انداز دعوت کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش نظر ثانی و ثالث... کے ذریعے جاری رکھیں۔ کسی غلطی کے اعتراف سے نہ ہچکچائیں اور حق بات کہنے پر آنے والی مشقت سے کبھی نہ گھبرائیں کہ یہی مردانِ حق کا شیوہ ہے۔

مشق

۱-''موضوع کی تلاش: کتنی مشکل، کتنی آسان'' ایک صفحے کے برابر نوٹ لکھیں۔
۲-ابتدایئے کی تمام اقسام کے نام مع یک سطری تعارف تحریر کریں۔
۳-''اختتامیے'' میں کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے؟ وضاحت کے ساتھ لکھیں۔
٤-اچھے کالم کی خوبیوں کی فہرست بنائیں۔
٥-ایک عدد کالم حالات حاضرہ یا کسی بھی دوسرے موضوع پر تحریر کریں۔

حاشیہ نگاری

صفحہ کے ذیلی حصے کو "حاشیہ" کہا جاتا ہے۔ایک افقی خط حاشیے کو متن سے جدا کرتا ہے، تاکہ پڑھنے والا اشتباہ سے محفوظ رہے۔ حاشیے میں ان مآخذ و مراجع سے متعلق معلومات فراہم کی جاتی ہیں جن کے اقتباسات متن میں مذکور ہوتے ہیں۔ متن میں ذکر کردہ افکار کی وضاحت اور ان سے متعلق ثانوی درجے کی معلومات کو بھی حاشیے ہی میں درج کیا جاتا ہے تاکہ متن میں غیر ضروری تفصیلات نہ آنے پائیں اور قاری کا ذہن مرکزی افکار سے ہٹنے نہ پائے۔

حاشیہ نگاری کا عمل سنجیدہ اور فنی تحریروں نیز ترتیبِ متن کا ایک اہم اور لازمی جز ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے نہ صرف ماخذ کی نشاندہی کی جاتی ہے، بلکہ بہت سے توضیح طلب نکات کی وضاحت بھی کی جاتی ہے، اس لیے حاشیہ نگاری تصنیف و تالیف کا ایک لازمی جز ہے، جسے سلیقے کے ساتھ ملحوظِ نظر رکھے بغیر علمی اور تحقیقی مواد قارئین کے لیے پیش نہیں کیا جاسکتا۔

حاشیے کی نشان دہی کے لیے زمانۂ قدیم اور دورِ وسطیٰ میں بہت سی علامتیں استعمال کی جاتی تھیں، لیکن یہ سب علامتیں ہمارے دور میں متروک ہو چکی ہیں۔ آج کل ہندسوں یا ستاروں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ان ہندسوں کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے عموماً تین طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔

پہلا طریقہ جو طرفین کا رمصنف اور قاری دونوں کے لیے سہل، قابلِ عمل اور عام فہم ہے، وہ یہ ہے کہ ہر صفحے کے حواشی اسی پر درج کیے جائیں۔ ایک صفحے پر جتنے حواشی درج ہوں اتنے ہی ہندسے ہوں، مثلاً ایک صفحے پر چھ حواشی ہیں تو ہندسے ایک سے چھ تک ہی لکھے جائیں گے اور آئندہ صفحے کے حواشی نئے سرے سے شروع ہو کر اسی صفحے پر ختم ہو جائیں گے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہر فصل یا باب کے لیے مسلسل نمبر لگاتے چلے جائیں اور اس کے اختتام پر تمام حواشی اکٹھے درج کریں۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ پوری کتاب کے حواشی کے لیے مسلسل نمبر

ہوں اور کتاب کے آخر میں سارے حواشی اکٹھے دیے جائیں۔ یہ دونوں طریقے تحقیقی مضامین اور رسائل ومقالات میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ طویل کتابوں میں حواشی کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے انہیں اختیار نہیں کیا جاتا۔

ان میں سے ہر طریقے کا فائدہ بھی ہے اور مشکل بھی۔ مثلاً پہلے طریقے کا فائدہ یہ ہے کہ ہر صفحے کا حاشیہ اسی صفحے پر پڑھنے کو مل جاتا ہے، محض ایک حوالہ دیکھنے کے لیے کئی صفحات نہیں الٹنے پڑتے، لیکن اس میں مشکل یہ ہے کہ اگر متن یا حاشیے میں ترمیم یا اضافہ کرنا پڑ جائے تو متن اور حواشی دونوں میں کافی کچھ تبدیلی کرنی پڑتی ہے۔ دوسرے اور تیسرے طریقے کا فائدہ یہ ہے کہ "تحقیق" کے کسی حصے کو حذف کر دینے سے حاشیہ کی ترتیب کے سلسلے میں کسی الجھن کا شکار نہیں ہونا پڑتا، لیکن اس میں خرابی یہ ہے کہ حوالہ یا وضاحت دیکھنے کے لیے باب یا کتاب کے آخر تک جانا پڑتا ہے جس سے پڑھنے والے کے مطالعاتی سوچ کے تسلسل میں انقطاع واقع ہوجاتا ہے۔ بہرحال: "وللناس فیما یعشقون مذاهب."

حواشی کے اندراج کا طریق کار:

جب مصنف، مقالہ نگار یا مضمون نویس حاشیے میں اپنے مصادر اور مراجع کا ذکر کرے تو درج ذیل اصول پیش نظر رکھے:

۱- قرآن کریم کی آیات کا حوالہ یوں لکھا جاتا ہے:

- ایک ہی آیت کا حوالہ دینا ہے تو سورت کا نام لکھ کر آیت نمبر لکھیے اور بیچ میں دو عمودی نقطے لگائیے، جیسے: البقرة: ۵۱، التوبة: ٤٠

- کئی مسلسل آیتیں ہوں تو پہلی اور آخری آیت کا نمبر لکھ کر بیچ میں خط لگائیے، جیسے:

البقرة: ۲۹-۳۳..... یعنی آیت ۲۹ سے لے کر ۳۳ تک۔

- اگر غیر مسلسل آیتیں ہوں تو بیچ میں سکتہ لگا کر لکھیے، جیسے:

البقرة: ١٦، ۲۱..... یعنی آیت ١٦ اور آیت ۲۱

۲- کسی حدیث کا حوالہ لکھنے کے لیے پہلے کتاب کا نام (مثلاً: جامع ترمذی) حصہ کا نام (مثلاً کتاب الطہارۃ) باب کا نام (مثلاً: باب المسح علی الخفین) اور کتاب کا جلد وصفحہ درج کیا

جائے گا۔رقم الحدیث کا اندراج جلد وصفحہ کے اندراج کے قائم مقام سمجھا جاتا ہے۔لہٰذا دونوں میں سے ایک پر اکتفا کرلیا جائے تو بھی درست ہے۔

۳- مصنف اور کتاب کا نام لکھنے کے لیے یہ ترتیب اختیار کرے کہ سب سے پہلے ''مصنِّف''،اس کے بعد ''مصنَّف'' (یعنی کتاب) کا نام ،پھر جلد وصفحہ اور اس کے بعد آخر میں طابع کا نام درج کرے۔اس کا طریقہ کار کچھ یوں ہوگا:

- مصنف کا نام اس کے مشہور حصے سے شروع کیا جائے،یعنی کنیت، لقب، نام اور نسبت میں سے جو زیادہ مشہور ہو اسے پہلے لکھا جائے، جیسے: الغزالی، پھر سکتہ (،) لگا کر پورا نام مثلاً: محمد بن حامد لکھا جائے۔حتی الوسع نام مکمل لکھا جائے۔

- اس کے بعد تصنیف یا کتاب کا نام، جیسے: "احیاء علوم الدین"، اس کے بعد علامت تفصیلیہ (:) لگائی جائے۔

- اس کے بعد جلد وصفحہ کا ذکر کیا جائے،جس کے لیے "ج" اور " ص" کا اختصار استعمال کیا جائے۔ ہمیشہ جلد کا ذکر پہلے اور صفحے کا اس کے بعد ہوگا، کیونکہ مراجعت کرنے والا جلد پہلے تلاش کرے گا، اس کے بعد صفحہ کھولنا چاہے گا۔ اب یہ معمول ہے کہ ج اور ص لکھنے کے بجائے جلد وصفحہ کے درمیان خط فاصل (/) لگاتے ہیں۔اس میں مزید اختصار وسہولت ہے، جیسے:۳/ ۳٦۰

- اس کے بعد ماخذ کا مطبع، جائے طباعت اور تاریخ طباعت درج کی جاتی ہے،لیکن اگر یہ معلومات آخر میں مآخذ اور مراجع کی فہرست میں درج کی جارہی ہیں تو انہیں حاشیے پر درج نہ کیا جائے۔

تنبیہ: یاد رہے کہ جلد وصفحہ اور دیگر معلومات کے اختتام پر ختمہ ،سکتہ وغیرہ کوئی علامت نہیں لگائی جاتی۔

٤- اگر متن میں کتاب کا نام لکھ دیا گیا ہے تو حاشیہ میں صرف مصنف کا نام لکھ کر باقی حاشیہ مکمل کیا جائے۔اسی طرح اگر متن میں مصنف کا نام لکھ دیا گیا تو حاشیہ میں صرف کتاب کا نام لکھا جائے۔اگر متن میں مصنف اور کتاب دونوں کا نام لکھ دیا گیا تو حاشیہ میں صرف باقی ماندہ حوالہ یعنی جلد نمبر اگر ہو اور صفحہ نمبر درج کیا جائے۔جیسے متن میں یوں لکھا گیا:

"ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے...... "تو حاشیہ میں صرف جلد وصفحہ نمبر لکھ دیا جائے۔

۵- اگر کسی کتاب کے دو یا تین مؤلفین ہیں تو ان کے نام سرورق کی ترتیب کے مطابق درج کیے جائیں گے۔ اگر کسی کتاب کے تین سے زیادہ مؤلفین ہیں تو سرورق پر درج پہلا نام لکھ کر "اور دیگر رفقاء" لکھ دیا جائے گا۔

٦- اگر مؤلف کا نام معلوم نہ ہو تو "نامعلوم" لکھ کر دیگر امور سابقہ طریقے کے مطابق لکھے جائیں گے۔

۷- جب مصنف، مقالہ نگار یا مضمون نویس نے کسی ترجمے سے استفادہ کیا ہو اور کتاب کی اصل زبان سے واقف نہ ہو تو حاشیہ یوں لکھا جائے:

یوسف القرضاوی، فقہ الزکوٰۃ: ۱/ ٦۵، اردو ترجمہ: ساجد الرحمٰن صدیقی

۸- اگر اقتباس کسی رسالے یا اخبار میں شائع ہونے والے مضمون سے لیا گیا ہے تو مضمون نگار اور مضمون کا نام، اخبار کا نام اور تاریخِ اشاعت درج کی جائے۔

۹- اگر اقتباس کسی انٹرویو سے اخذ کیا گیا ہے تو حاشیہ میں انٹرویو دینے والی شخصیت کا نام، انٹرویو لینے والے اخبار یا فرد کا نام اور انٹرویو کی تاریخ درج کی جائے گی۔

۱۰- جب اصل مرجع تک رسائی نہ ہو سکے اور کسی ثانوی ماخذ سے استفادہ کیا جائے تو حاشیہ اس طرح لکھا جائے:

سبط ابن الجوزی، مرآۃ الزمان: ۸/ ۲۲۷، بحوالہ خزائن الکتب القدیمۃ فی العراق لجرجیس عواد: ص ۱۵۵

یعنی یہ بند جرجیس عواد کی کتاب "خزائن الکتب القدیمہ فی العراق" سے انتخاب کیا گیا۔ ایسا اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ علمی دیانت برقرار رہے اور دونوں اصحابِ مآخذ کی علمی فضیلت کا اعتراف کیا جا سکے۔

متعدد صفحات کا حوالہ:

۱- اگر دو مسلسل صفحات ہوں تو بیچ میں سکتہ (،) لگائے، جیسے:

نعمانی، مولانا محمد منظور، معارف الحدیث: ج ۳ ص ٤۰، ٤۱

اسی طرح اگر کوئی بات کسی کتاب میں دو الگ جگہ ذکر ہو تو بھی بیچ میں سکتہ لگایا جاتا ہے، جیسے:

کاندھلوی، محمد ادریس، مولانا، سیرۃ المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم: ۳/ ۷۰، ۸۲

یعنی ص ۷۰ اور ص ۸۲ دو جگہوں پر یہ بات دیکھی جائے۔

۲- اگر دو سے زیادہ مسلسل صفحات سے استفادہ کرے تو ان صفحات کے بیچ میں " خطہ " (-) لگائے، جیسے:

ندوی، سید ابوالحسن علی، مولانا، سیرت سید احمد شہید: ص ۲۲-۲۷

یعنی ص ۲۲ سے ص ۲۷ تک۔ اگر آخری صفحے کی تحدید ممکن نہ ہو تو لکھا جائے: ص ۲۲ اور اس کے بعد

۳- جب کسی کتاب میں کوئی چیز جا بجا موجود ہو اور سب کا حوالہ طوالت کا باعث ہو تو حاشیہ یوں لکھا جائے:

صفدر، محمد سرفراز خان، مولانا، راہ سنت: متعدد مقامات

حوالۂ مکرّرہ کا اندراج:

۱- جب ایک ہی ماخذ بغیر فاصلے کے بار بار ذکر کیا جائے تو پہلی بار مذکورہ چاروں امور ذکر کیے جائیں، اس کے بعد صرف یہ لکھا جائے:

مذکورہ بالا ماخذ: ص ۸

۲- جب ایک ہی ماخذ سے دو حاشیے دیے جائیں لیکن دونوں کے درمیان کوئی اور حاشیہ آچکا ہو تو ماخذ کا نام لیے بغیر اس طرح لکھیں:

تھانوی، حکیم الامت، مولانا محمد اشرف علی، مذکورہ بالا ماخذ: ص ۹۹

اہم ہدایات

۱- حاشیہ کی ایک سطر میں دو حوالے نہ لکھے جائیں۔ ہر سطر میں ایک ہی حوالہ درج کیا جائے۔ البتہ کبھی کبھار مثلاً جب کتاب کا نام متن میں ہو اور حاشیے میں صرف صفحہ نمبر دیا جا رہا ہو اور ایسے متعدد حوالے ایک صفحہ میں جمع ہو جائیں تو ہر حوالے کو مستقل سطر میں لکھنے سے کاغذ کا کافی حصہ خالی رہ جاتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں ایک سطر میں ایک سے زیادہ حوالے بیچ میں مناسب بیاض

چھوڑ کر لکھے جا سکتے ہیں، تا کہ کاغذ کے بے جا ضیاع اور ناشر و قاری پر غیر ضروری اضافی اخراجات کا بوجھ ڈالنے سے بچا جا سکے۔

۲- ہر صفحہ کے حاشیہ میں اتنی وسعت ضرور ہونی چاہیے کہ متن میں اشارہ کردہ مآخذ اس میں بآسانی درج کیے جا سکیں۔

۳- حاشیہ نگاری میں مبالغہ سے کام لینا مناسب نہیں۔لہذا بدیہی اور عام فہم امور کا حوالہ دے کر بلاوجہ حواشی کا انبار نہ لگایا جائے اور نہ ہی طویل اشیا مثلاً: فہرستیں، رپورٹیں اور عمومی تفصیلات حاشیے میں ذکر کی جائیں۔ان اشیا کو تحقیق کے آخر میں "ضمیمہ جات" میں درج کیا جائے۔

٤- حاشیہ کو ظاہر کرنے والے ہندسے اصل مضمون میں سطر سے تھوڑا سا اوپر قوسین کے درمیان لگائے جاتے ہیں جبکہ حاشیے میں یہی ہندسے سطر کے متوازی ہوتے ہیں اور ان کے بعد چھوٹا سا خط مستقیم (-) لگتا ہے۔

۵- اگر متن میں دیے گئے ہندسے کسی اقتباس کا حوالہ دینے کے لیے جا رہے ہیں تو یہ ہندسے اقتباس سے پہلے مقالہ نگار کے الفاظ پر نہیں بلکہ اقتباس میں لی گئی عبارت کے آخر میں لگائے جاتے ہیں۔

٦- حاشیہ میں ہندسوں کے نیچے ہندسے اور حروف کے نیچے حروف لکھے جاتے ہیں، لہٰذا جب حاشیہ ایک سطر میں مکمل نہ ہو تو اگلی سطریں حاشیہ نمبر کے نیچے کی جگہ خالی چھوڑ کر حروف کے نیچے سے شروع کی جائیں تا کہ قاری کو معلوم ہو کہ یہ سطریں سابقہ حاشیہ سے تعلق رکھتی ہیں، یہ کوئی نیا حاشیہ نہیں ہے۔

۷- جب کبھی حوالہ دینے کے بجائے وضاحتی تحریر لکھنا مقصود ہو تو ہندسوں کے بجائے ستارہ (☆) یا پھول (✱) لگایا جاتا ہے۔ ✱ اگر اس صفحے پر دوسری وضاحت دینی پڑ جائے تو دو ستارے (☆☆) یا دو پھول (✱✱) لگا دیے جاتے ہیں، وعلی ھذا القیاس۔اسی طرح اگر کسی عنوان پر کوئی حاشیہ لگانا ہو تو ہندسوں کے بجائے ستارہ یا پھول لگایا جاتا ہے۔گویا کہ ستارہ یا پھول دو جگہوں پر لگایا جاتا ہے: وضاحت اور عنوان۔

۸- بعض لوگ اقتباس نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: '' دیکھیے: فلاں کتاب'' اور پھر جلد و صفحہ لکھ

دیتے ہیں۔ یاد رکھیے! یہ تعبیر محض حوالہ دینے کے لیے نہیں ہے، اسے اس موقع پر لکھا جاتا ہے جب متعلقہ ماخذ میں نقل کردہ اقتباس سے زائد کوئی ایسی چیز ہو جس سے مراجعت کرنے والا مزید استفادہ کرسکے۔ اگر وہاں اس کے لیے مزید کوئی معلومات نہیں ہیں تو حوالہ دینے کا یہ انداز بے جا اور غلط ہے۔ اس طرز کو صرف اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب اصل مرجع میں تحقیق کار کی تشفی اور استفادے کا خاطر خواہ اضافی مواد موجود ہو۔

۹-ایسے نام جو نہایت معروف ہیں ان کے مشہور ترین جز (چاہے وہ کنیت ہو یا نسبت یا تخلص) پر اکتفا کرنا بھی درست ہے، جیسے: امام شافعی، امام بخاری، امام رازی رحمہم اللہ...... لیکن شرط یہ ہے کہ آخر تک وہی جز لکھا جائے۔ کہیں ایک چیز اور کہیں دوسری نہ ہو۔

درج بالا اصولوں اور ہدایات پر عمل کیا جائے تو علمی و تحقیقی مضامین اور مقالات کی معیاری حاشیہ نگاری کی جاسکتی ہے۔

اشاریے (انڈکس) کی ترتیب:

اشاریے کے تحت عام طور پر دو چیزیں ذکر کی جاتی ہیں:

(۱) کتاب میں جن جن شخصیات، اقوام وقبائل کا تذکرہ ہے، ان کا نام صفحہ نمبر کے ساتھ۔

(۲) کتاب میں جن جن مقامات کا ذکر ہے، ان کا نام صفحہ نمبر کے ساتھ۔

بعض اوقات ان میں یہ چیزیں بھی دی جاتی ہیں:

۱-کتاب میں جو آیاتِ قرآنیہ ذکر کی گئی ہیں، وہ صفحہ نمبر کے ساتھ۔

۲-کتاب میں جو احادیثِ نبویہ ذکر کی گئی ہیں، وہ صفحہ نمبر کے ساتھ۔

جدید انداز کی تحقیقی کتابوں یا رسالوں کے آخر میں اشاریے دیکھنے سے آپ کو اس کی نوعیت بھی معلوم ہو جائے گی۔

مآخذ و مصادر (کتابیات) کی ترتیب:

طویل مقالوں (جو دراصل کتاب ہی ہوتے ہیں) اور کتابوں کے آخر میں مآخذ و مصادر اور کتابیات کی فہرست ہوتی ہے۔ گویا مصنف یہ بتانا چاہتا ہے کہ ہماری بحث و تحقیق کا ماخذ کون سی

کتابیں ہیں؟ کتابیات سے مقالہ اور کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کتابیات کی فہرست کی ترتیب میں اہم علوم کو ترجیح دی جاتی ہے۔ مثلاً کسی کتاب کے مآخذ و مصادر میں تفسیر وعلوم قرآن، حدیث وفقہ، تاریخ سبھی ہوں تو تفسیر وعلومِ قرآن پر مشتمل کتب کا نام پہلے، پھر حدیث وعلومِ حدیث پر مشتمل کتابیں، پھر فقہ واصولِ فقہ پھر تاریخ وغیرہ۔ حاشیہ میں تو ہمیشہ مصنف کا نام پہلے اور کتاب کا بعد میں لکھا جاتا ہے، لیکن کتابیات میں کبھی کتاب کا نام پہلے لکھا جاتا ہے، پھر مصنف کا نام اور کبھی اس کے برعکس بھی کیا جاتا ہے۔ دو چار کتابوں کے آخر میں مراجع کی فہرست دیکھنے سے آپ کو اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

مراجع کے اندراج کی ترتیب:

مراجع میں عموماً تین طرح کی کتابیں ہوتی ہیں: قلمی مخطوطات، مصادر اصلیہ، مآخذ ثانویہ۔" مصادر ومراجع" یا" فہرست کتابیات" میں ان تینوں اقسام میں سے صرف ان بنیادی مآخذ کے نام درج کیے جائیں جن سے تحقیق نگار نے عملی طور پر مدد حاصل کی ہے اور اپنی رائے کی تائید کے لیے فی الواقع ان سے اقتباسات لیے ہیں۔ چاہے وہ اصلی ہوں یا ثانوی۔ محض مصادر ومراجع کی کثرت دکھانے کے لیے کتابوں کا نام درج نہ کیا جائے۔ مآخذ پانچ طرح کے ہو سکتے ہیں۔ ذیل میں ان کو کتابیات میں درج کرنے کا طریقہ بیان کیا جاتا ہے:

(۱) قلمی مخطوطات:

اگر ماخذ کسی کتاب کا ایسا قلمی نسخہ ہے جس کے شائع ہونے کی اب تک نوبت نہیں آئی تو کتاب اور مصنف کا نام دینے کے بعد اس کے محلِ وجود کی تعیین اور غیر مطبوعہ ہونے کی وضاحت کی جائے۔

(۲) کتاب:

مآخذ کوئی کتاب ہو تو درج ذیل امور کو پیش نظر رکھنا چاہیے:

- کتاب سے متعلق تینوں معلومات (مُصَنِّف، مُصَنَّف، طابع) درج کی جائیں گی، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

-اگر کتاب کا مؤلف گم نام ہو تو حوالے کا آغاز کتاب کے نام سے ہوگا۔

-اگر ماخذ کسی کتاب کا ترجمہ ہے تو پہلے مؤلف کا نام، اس کے بعد مترجم کا نام اور پھر دیگر معلومات درج کی جائیں گی۔

-اگر مآخذ کوئی علمی تحقیق ہے، مثلاً ایم-اے یا پی-ایچ-ڈی کا مقالہ وغیرہ تو سب سے پہلے تحقیق نگار کا نام لکھا جائے گا، اس کے بعد "تحقیق" کا نام لکھ کر متعلقہ درجہ کی طرف اشارہ کیا جائے گا، نیز اس کے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ ہونے کا ذکر کیا جائے گا۔

-اگر مآخذ سرکاری مطبوعات ہیں جو سرکاری وزارت یا سرکاری محکموں کی جانب سے شائع کی گئی ہیں تو ان کو حوالے میں پیش کرتے وقت پہلے شہر کا نام اور اس کے بعد شائع کرنے والی سرکاری وزارت یا محکمے کا نام درج کیا جائے گا۔

-اگر مآخذ ذاتی یادداشتیں، نجی خطوط، عدالتی فیصلے یا تاریخی مقامات اور آثارِ قدیمہ کی تحریرات ونقشے ہیں تو ان کا حوالہ دیتے وقت دیگر متعلقہ امور کی تعیین کے ساتھ ان کا مقامِ موجودگی بھی بیان کیا جائے گا۔

(۳) اخبارات اور رسائل وجرائد:

اگر ماخذ کسی اخبار یا رسالے میں شائع ہونے والا مضمون ہے تو درج ذیل ترتیب اختیار کی جائے گی:

- مضمون نگار کا نام (سابقہ طریقے کے مطابق)
- واوین کے درمیان مضمون کا عنوان
- رسالے یا اخبار کا نام، شمارہ نمبر، صفحہ نمبر، اس کے بعد سکتہ
- شمارے کی تاریخِ اشاعت قوسین میں، اس کے بعد سکتہ
- مقامِ اشاعت میں اس شہر کا نام جس سے اخبار نکلتا ہے۔

(٤) انٹرویو:

اگر مآخذ انٹرویو اور باہمی گفتگو کی صورت میں ہے تو انٹرویو لینے اور دینے والی شخصیت اور اخبار یا رسالے کا نام لکھا جائے گا۔

(۵) غیر مطبوعہ مواد:

اگر ماخذ غیر مطبوعہ مواد مثلاً آڈیو کیسٹ میں محفوظ یا انٹرنیٹ سے لی گئی معلومات پر مشتمل ہے تو اس کا حوالہ دینے کا طریقہ تحقیق نگار کی صوابدید پر ہے۔

اگر اس کے علاوہ کچھ غیر معروف ماخذ ہیں تو ان کی الگ فہرست بنائی جا سکتی ہے۔

مشق

۱-حاشیہ نگاری کے تین طریقے درج کیجیے۔

۲-حواشی کے اندراج کا ضابطہ مع نمونہ تحریر کیجیے۔

۳-حاشیہ، اشاریہ کی تعریف اور دونوں میں فرق لکھیے۔

٤-کتابیات مرتب کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ وضاحت کیجیے۔

۵-حوالے کے بجائے حسب ضرورت وضاحتی تحریر کیسے لکھی جائے گی؟

مقالہ نگاری

تحقیق اور مقالے کی تعریف:

''تحقیق'' کے لغوی معنی چھان بین، دریافت، جستجو اور کھوج لگانے کے ہیں۔ اصطلاح میں کسی چیز کی حقیقت کو دلیل سے ثابت کرنے کا نام تحقیق ہے۔ ہمارے اسلاف نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال واحوال کی تحقیق اور تصدیق کے لیے جن مصائب اور دشواریوں کا سامنا کیا وہ تاریخ کا ایک روشن باب ہیں اور تحقیق کے مختلف میدانوں میں رہنما بھی۔

''مقالہ'' ایک ایسی مکمل اور مستند تحریر کا نام ہے جس میں تحقیق نگار کسی موضوع کی ذمہ دارانہ تحقیق دلائل وشواہد کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

مضمون ومقالے میں فرق:

تحقیق وہ عمل ہے جس سے کھرے اور کھوٹے، سچ اور جھوٹ اور حق وباطل میں دلیل کے ذریعے فرق کیا جاتا ہے۔ اس کے ضمن میں تحقیقی مضمون نگاری اور مقالہ نویسی دونوں شامل ہیں کہ دونوں کا اسلوب واندازِ تحریر یکساں ہوتا ہے۔ فرق صرف حجم کا ہوتا ہے۔ تحقیقی مضمون نسبتاً مختصر اور کم حجم کا حامل ہوتا ہے، جبکہ مقالہ سیر حاصل بحث پر مشتمل ایک مکمل تحقیقی جائزے کو کہتے ہیں۔ مقالے کی ضخامت کے حوالے سے جامعات کے اپنے اپنے معیارات ہوتے ہیں۔ ادبی مقالات کے حجم کے متعلق عرفِ عام یہ ہے کہ ایم اے کا مقالہ تقریباً دو سو صفحات (۴۰،۰۰۰ الفاظ) اور پی ایچ ڈی کا مقالہ تقریباً تین سو صفحات (۶۰،۰۰۰ الفاظ) پر محیط ہونا چاہیے۔

تحقیق کی کامیابی کے عوامل

تحقیق نگار کو چاہیے کہ ''تحقیق'' کا مسوّدہ لکھنے سے پہلے چند ضروری امور پیش نظر رکھے تاکہ وہ

ایک ایسی ''تحقیق'' لکھنے میں کامیاب ہو سکے جو نہ صرف خود اس کے لیے اطمینان کا باعث بن سکے، بلکہ اس کے دل و دماغ کو اس خوش گوار احساس سے سرشار کر دے کہ اس کی کاوش متعلقہ استاد، ممتحن اور عام شائقینِ علم کے معیار پر پورا اترنے میں کامیاب رہی ہے۔ ان امور کو ہم ''تحقیق کی کامیابی کے عوامل'' کا نام دے سکتے ہیں۔

تحقیقی مقالے کی کامیابی میں کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں جن میں اہم پانچ ہیں:

۱- وسعتِ مطالعہ:

ایک کامیاب مقالے کا پہلا بنیادی عنصر یہ ہے کہ مقالہ نگار کا مطالعہ وسیع ہو، لہٰذا مقالہ لکھنے والے طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ مسلسل پڑھتا رہے اور ان تمام اہم ابحاث و نکات سے اپنے آپ کو باخبر رکھے جو اس کے موضوع سے متعلق ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مقالہ کی تکمیل کے بعد ''امتحانی مناقشہ'' (Viva) کے دوران کوئی ایسی چیز سامنے آ جائے جس تک طالبعلم کی رسائی نہ ہوئی ہو اور وہ مقالہ میں پیش کردہ نتائج و سفارشات پر اثر انداز ہو یا اس کے اخذ کردہ نتائج سے زیادہ بہتر نتائج پر مشتمل ہو۔

۲- باریک بینی:

مقالہ نگار کو چاہیے کسی عبارت کو سمجھنے اور اسے نقل کرنے میں بہت احتیاط، بیدار مغزی اور باریک بینی سے کام لے۔ بسا اوقات طالب علم کم فہمی یا عبارت نقل کرنے میں بے احتیاطی کی وجہ سے خطرناک یا مضحکہ خیز غلطی کر بیٹھتا ہے۔ اسے یاد رکھنا چاہیے کہ وہ مقالے میں موجود تمام مواد کا ذمہ دار ہے۔ وہ کسی چیز سے صرف اس بنا پر بری الذمہ نہیں ہوسکتا کہ اس نے یہ مواد کسی دوسرے مصنف سے نقل کیا ہے، لہٰذا جب تک اس کو کسی بات پر خود اطمینان نہ ہو، اس وقت تک اس کو اپنے مقالے میں نقل نہ کرے۔

۳- حقیقت پسندی:

طالب علم کو دوسروں کی رائے اور ان کے دلائل پر کھلے دل اور انصاف پسندی سے غور کرنا چاہیے۔ نہ تو ایسا افراط ہو کہ وہ کسی رائے کو من وعن مسلّمہ حقیقت کے طور پر لے اور اس کی سند

وعلت پر غور کرنے کی زحمت ہی نہ کرے، اور نہ یہ تفریطھو کہ کوئی بات دلائل وشواہد کی رُو سے سامنے آنے کے بعد اسے تسلیم کرنے میں اس وجہ سے ہچکچائے کہ وہ اس کے رجحانات اور میلانات کے خلاف ہے۔

٤-جدّت:

مقالہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ اپنے مقالے میں کوئی کام کی بات سامنے لائے اور انسانیت کے پاس موجود علمی ورثے میں کسی قابلِ ذکر چیز کا اضافہ کرے تاکہ وہ تحقیق کے عمل کو آگے بڑھائے اور علمی ترقی میں اپنا حصہ ڈال سکے۔ اگرچہ وہ کسی مخطوطے کی تحقیق کی شکل میں کیوں نہ ہو۔ قلم کے بجائے قینچی سے لکھنا اور تحقیقی انکشافات کے بجائے روایتی اقتباسات جمع کرنا مقالہ نگاری کی روح کے منافی ہے۔

اگرچہ ایک بہترین موضوع کی اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں "جدت" اور "افادیت" پائی جائے، لیکن اس کے باوجود یہ ضروری نہیں کہ آپ کسی نئے موضوع ہی کا انتخاب کریں۔ آپ قدیم موضوعات پر مختلف جہت اور ایک نئے نقطۂ نظر سے کام کر سکتے ہیں، سابقہ تحقیقات کے نتائج کی روشنی میں مزید تحقیق وتدقیق کا فریضہ بھی انجام دے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کسی قدیم موضوع پر اپنے ان مطالعاتی نتائج کی روشنی میں از سرِ نو تحقیق کریں جو اس سے پہلے سامنے نہیں آئے تھے۔ ایسی تحقیق فکر ونظر کی نئی راہیں کھولتی ہے اور علم کے دائرے کو مزید وسعت بخشتی ہے، لہٰذا اسے "اضاعتِ وقت" نہیں کہا جا سکتا۔ افادیت کا پہلو اس میں پایا جانا عین ممکن ہے۔

٥-حسنِ ترتیب:

طالب علم کی آخری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے مقالے کو اس انداز سے ترتیب دے جو ممتحنین کو بھی متاثر کرے اور قارئین کے لیے بھی پرکشش ہو۔ اس کی پیش کردہ معلومات مفید اور مرتب ہوں۔ اس کی تحریر آسان اور اسلوب عمدہ ہو۔ اس میں وضاحت اور تسلسل ہو۔ غیر متعلقہ بحث اور ابہام نہ ہو۔

اس کے لیے وہ عسکری قائد کی مثال سامنے رکھے۔ کوئی کمانڈر جب کسی قلعے پر حملہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اپنے لشکر کو مکمل طور پر تیار کرے،

جنگی ضروریات کا اہتمام توجہ اور مہارت سے کرے اور مطلوبہ ہدف کے حصول تک دشمن پر مسلسل دباؤ قائم رکھے۔

اسی طرح طالب علم کو سب سے پہلے خاطر خواہ مواد جمع کرنا چاہیے، پھر اسے واضح اور آسان اسلوب میں پیش کرنے کے لیے پوری توجہ سے کام لینا چاہیے اور پھر آخر تک یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اس میں غیر ضروری اضافات اور ابہام نہ ہو۔ طالب علم کو شروع سے آخر تک اسی اصول پر کاربند رہنا چاہیے، کیونکہ اس کی ذمہ داری صرف اتنی نہیں کہ وہ ایک نئی چیز کا اضافہ کرے، بلکہ ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جس چیز کا وہ اضافہ کرنا چاہتا ہے، اس کو ایسے خوبصورت سانچے میں ڈھالے جس میں کشش اور جاذبیت ہو۔

مقالہ نگاری کے چار مراحل

یہاں ان مراحل کو ترتیب سے پیش کیا جارہا ہے جن سے تحقیق نگار کو سابقہ پڑتا ہے اور جن سے واقفیت اس کے تحقیقی سفر میں زادِراہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ مراحل چار ہیں:

(۱) موضوع کا انتخاب (۲) خاکہ سازی (۳) معلومات جمع کرنا (٤) مسوّدہ لکھنا۔

ذیل میں چاروں کو تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔

پہلا مرحلہ-موضوع کا انتخاب

موضوع کا انتخاب کرتے وقت عام طور پر طالب علم اس وجہ سے مشکل میں پڑ جاتا ہے کہ اس کے خیال کے مطابق تمام اہم موضوعات..... جن کا اس کے مضمون سے تعلق ہوتا ہے..... پر تحقیق کی جاچکی ہے اور اس کے لیے کام کا میدان باقی نہیں رہا، حالانکہ یہ محض ایک وہم ہے جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ بہت سارے موضوعات ابھی تک ایسے ہیں جن کا ہمارے ذمے قرض باقی ہے اور بہت سے موضوعات ہمیشہ ایسے رہیں گے کہ ان پر کام ہو اور انہیں منظر عام پر لایا جائے۔ قدیم قلمی نسخوں (مخطوطات) کی تحقیق، تخریج وتعلیق بھی بطور مقالہ منظور کروائی جاسکتی ہے۔ اس بنا پر طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مضمون کے اساتذہ اور دیگر اہل علم کے ساتھ خصوصی تعلق قائم رکھے، ان کے پاس آتا جاتا اور گفت وشنید کرتا رہے۔ انشاءاللہ وہ خود

اس نتیجے پر پہنچ جائے گا کہ ایک سے زیادہ موضوعات یا مخطوطات ایسے ہیں جو ابھی تک تحقیق طلب ہیں اور ان پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

موضوع کے انتخاب کے لیے چار معیاری سوالات:

جب طالب علم کسی موضوع کو اپنے لیے مناسب سمجھنے لگے تو وہ اسے حتمی طور پر منتخب کرنے سے پہلے اپنے آپ سے مندرجہ ذیل چار سوالات کرے:

۱-کیا یہ موضوع ایسا ہے کہ اس پر اتنی محنت کی جائے؟

۲-کیا اس موضوع پر (طویل) مقالہ لکھنا ممکن بھی ہے؟

۳-کیا اس موضوع پر مقالہ لکھنا میرے لیے ممکن ہے؟

٤-کیا میں اس موضوع سے دلچسپی رکھتا ہوں؟

اگر ان سوالات میں سے کسی ایک کا جواب بھی نفی میں ہو تو اُسے چاہیے کہ اس موضوع کو چھوڑ کر کوئی دوسرا موضوع تلاش کرے اور اپنا وقت اور توانائی ایسی چیز میں ضائع نہ کرے جس میں کامیابی کے واضح امکانات نہیں پائے جاتے۔

اب ہم ان چار سوالات پر ایک ایک کر کے گفتگو کرتے ہیں:

۱-موضوع کی اہمیت:

ہر موضوع اتنی اہمیت کا حامل نہیں ہوتا کہ اس پر بھر پور محنت کی جائے۔ طلبہ کو چاہیے کہ نتیجہ خیز اور مفید موضوعات کا انتخاب کیا کریں اور ایسے موضوعات منتخب نہ کریں جو سند کے حصول کی حد تک تو مفید ہوں، لیکن بعد میں الماری میں بند گرد و غبار کی تہہ تلے پڑے رہیں۔ مقالہ نگاری کا اصل ہدف یہ نہیں کہ طالب علم کاغذات کا پلندہ اکٹھا کر لے یا کوئی سند حاصل کر لے، بلکہ اس کا ہدف یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے اندر تحقیق کی روح، ذوق و شوق اور سلیقہ پیدا کرنے کے ساتھ ایک ایسے مفید کام کو منظرِ عام پر لائے جس سے قارئین بھی اور وہ خود بھی آئندہ زندگی میں فائدہ اٹھا سکے۔

۲-مطلوبہ مواد کی دستیابی:

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی موضوع بہت مفید اور عمدہ ہوتا ہے، لیکن اس سے متعلق دستیاب مواد

اتنا کم ہوتا ہے کہ مقالے کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ان جیسے موضوعات پر علمی رسالوں میں تحقیقی مضمون لکھنا تو صحیح ہے،لیکن وہ کسی مقالے کا موضوع نہیں بن سکتے۔

۳-صلاحیت واہلیت:

تیسرا سوال طالب علم کی صلاحیت واہلیت سے متعلق ہے جس میں تین چیزیں آتی ہیں:

(۱) طالب علم کے مخصوص حالات وذاتی کوائف کیا ہیں؟اس میں متعلقہ زبانوں کا جاننا بھی شامل ہے۔

(۲) طالب علم نے یہ مقالہ کتنی مدت میں مکمل کرنا ہے؟

(۳) طالب علم کی مالی حیثیت کیسی ہے؟

مختلف زبانیں:

جو طالب علم متعدد زبانیں نہیں جانتا، وہ ایسے موضوع پر معیاری مقالہ نہیں لکھ سکتا جس کے بارے میں اجنبی زبانوں میں کتابیں لکھی گئی ہوں۔مثلاً کوئی طالب علم صرف عربی اور اردو زبان جانتا ہے تو اس کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ اپنے لیے ایسے موضوع کا انتخاب کرے جس پر زیادہ لکھنے والے غیر مسلم مستشرقین نہ ہوں جو انگریزی یا دوسری اجنبی زبانوں میں لکھتے ہیں۔وہ ایسا موضوع منتخب کرے جس میں زیادہ تر عربی ہی میں لکھا گیا ہوتا کہ وہ ممکنہ حد تک زیادہ سے زیادہ مواد پڑھ سکے۔

مقررہ وقت:

موضوع کے انتخاب میں وقت کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے،لہٰذا طالب علم ایسا موضوع اپنے لیے تجویز کرے جس کو وہ متعینہ مدت میں مکمل بھی کر سکے۔اسے چاہیے کہ وہ کسی متعین اور محدود موضوع کا انتخاب کرے۔ایک طویل اور وسیع موضوع سے کام کی ابتدا کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔

ذیل میں چند مثالوں کی مدد سے تحقیق کے موضوع کی امکانی حد تک تحدید وتعین کر کے ایک "وسیع تر" موضوع کو "محدود تر" موضوع میں تبدیل کر کے دکھایا گیا ہے:

۱- طلبہ کی مشکلات

یہ ایک وسیع تر موضوع ہے۔اب اس کی بتدریج "تحدید" ملاحظہ فرمائیں:

۲- پاکستان میں طلبہ کو درپیش مشکلات (دیگر ممالک سے قطع نظر)

۳- پاکستان میں طلبہ کو درپیش تعلیمی مشکلات (دیگر مشکلات سے قطع نظر)

٤- پاکستان میں طلبہ کو انگریزی زبان سیکھنے میں درپیش مشکلات (دیگر مضامین سے قطع نظر)

۵- پاکستان میں دینی مدارس کے طلبہ کو انگریزی زبان سیکھنے میں درپیش مشکلات (دیگر تعلیمی اداروں سے قطع نظر)

٦- کراچی میں دینی مدارس کے طلبہ کو انگریزی زبان سیکھنے میں درپیش مشکلات (مملکت پاکستان کے دیگر شہروں سے قطع نظر)

۷- کراچی کے دینی مدارس کے طلبہ کو انگریزی بولنے میں درپیش مشکلات (انگریزی لکھنے اور قواعد کے جاننے کی مشکلات سے قطع نظر)

آپ نے پہلے اور ساتویں موضوع کے درمیان فرق ملاحظہ کرلیا ہوگا اور اس محنت و مشقت کو بھی خوب سمجھ گئے ہوں گے جو کسی تحقیق نگار کو ساتویں عنوان کی بنسبت پہلے عنوان پر لکھنے کی صورت میں پیش آسکتی ہے۔کسی بھی "تحقیق" کو آسان اور مختصر بنانے کے لیے موضوع کی " تحدید " کا یہی طریقہ اختیار کیا جائے گا۔

مالی حیثیت:

بسا اوقات طالب علم کی مالی حیثیت بھی موضوع کے انتخاب میں اثر انداز ہوتی ہے۔مثلاً کوئی موضوع ایسا ہے جس پر مقالہ لکھنے کے لیے دور دراز واقع کتب خانوں میں موجود قلمی نسخوں کا عکس لینے کی ضرورت ہے یا ایسی کتابیں خریدنی پڑتی ہیں جو ابھی تک عام کتب خانوں میں دستیاب نہیں،ایسی صورتحال میں اگر طالب علم کی مالی حیثیت ان چیزوں کی متحمل نہیں تو یہ موضوع اس کے لیے نہیں، کسی اور کے لیے مناسب رہے گا۔

٤-قلبی شوق:

طالب علم کسی موضوع پر تحقیق میں کم از کم دو سال صرف کرے گا، لہٰذا اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے لیے ایسا موضوع منتخب کرے جو اس کو پسند ہو، اس کے مزاج سے مطابقت رکھتا ہو۔ اس کی طرف اس کا قلبی میلان ہو اور اس میں اس کی ذاتی دلچسپی کا سامان ہو۔ اس کا جی اس کے لیے محنت کرنے سے گھبراتا یا اکتاتا نہ ہو۔

چند مشورے:

☆... "منتہی درجات" اور "تخصص" کے طلبہ کو چاہیے کہ مقالہ لکھنے سے پہلے مختلف مضامین کے مطالعہ کے دوران ہی متعدد موضوعات کو سامنے رکھ کر کسی ایک کا انتخاب کرلیں، اور موضوع کے انتخاب کو تحقیق کے آغاز تک مؤخر نہ کریں۔ ایسا کرنے سے عین وقت پر وہ تذبذب کا شکار ہو جائیں گے اور جلد بازی میں کسی ایسے موضوع کا انتخاب کر بیٹھیں گے جس کی طرف نہ تو ان کا قلبی میلان ہوگا اور نہ ہی وہ موضوع ان کی صلاحیت واستعداد اور رجحانات سے کوئی مناسبت رکھتا ہوگا۔

☆... تحقیق نگار کو چاہیے کہ انتخاب کے وقت کسی ایسے شخص سے ضرور مشورہ کرے جو تحقیق کی اہمیت، اس کی جدت وعمدگی کے معیار، تحقیق مکمل ہونے کی ممکنہ مدت اور اس کے لیے درکار مآخذ ومراجع اور ضروری مواد کی دستیابی کے امکانی وقت کے بارے میں خوب واقفیت رکھتا ہو، تاکہ تحقیق نگار پورے انہماک اور دل جمعی سے موضوع پر کام کرسکے، یا پھر زیرِ غور موضوع سے عدمِ اطمینان کی صورت میں کسی دوسرے موضوع کا انتخاب اس کے لیے سہل اور مفید ہو۔

☆... کچھ مخصوص حالات بھی کبھی کبھی موضوع کے انتخاب میں مدد دیتے ہیں، مثلاً: کسی طالب علم یا اس کے خاندان یا جاننے والوں کے پاس ایک ایسا ذاتی کتب خانہ ہے جس میں کسی مضمون سے متعلق وافر مقدار میں کتابیں موجود ہیں یا کسی غیر مطبوعہ کتاب کے ایسے قلمی نسخے کسی طالب علم کے ہاتھ لگ جاتے ہیں جو مفید اور نایاب ہیں تو بلا شبہ یہ ایسا موقع ہے کہ جس سے فائدہ اٹھا کر طالب علم آسانی تحقیق کا عمل مکمل کرسکتا ہے۔

☆... کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ طالب علم نے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے، اس کے بارے میں خاطر خواہ مواد نہیں ملتا، یا طالب علم کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اس موضوع پر تحقیق ہو چکی ہے، یا اس موضوع پر کام کے لیے درکار اہم کتابوں کا حصول مشکل ہے.....ایسی صورتحال میں ضروری ہے کہ طالب علم جلد از جلد اس موضوع کو تبدیل کر لے تا کہ اس کا وقت ایسی چیز میں ضائع نہ ہو جس میں کوئی فائدہ نہیں۔

☆... طالب علم کو چاہیے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے آپ سے سابقہ چار سوالات کرتا رہے۔اگر ان سوالات میں سے کسی ایک کا بھی جواب مثبت نہیں تو پھر بہتر یہی ہے کہ اس موضوع کو چھوڑ دیا جائے اور کسی ایسے موضوع کو تلاش کیا جائے جس میں چاروں شرائط پائی جاتی ہوں۔

عنوان کے الفاظ:

یہاں تک جو کچھ تحریر کیا گیا موضوع کے انتخاب کے حوالے سے تھا، اب اس کے نام یا" عنوان" کے لیے الفاظ کے چناؤ کی طرف آتے ہیں۔مقالے کے عنوان (اسی طرح مرکزی اور ذیلی عنوانات) میں چار صفات پائی جانی چاہییں :اختصار، وضاحت، جامعیت اور دلکشی۔یعنی:

-ایسا مختصر ہو کہ کم سے کم کلمات پر مشتمل ہو۔

-ایسا واضح ہو کہ اس میں کسی قسم کا ابہام نہ ہو۔اس کے حدود اربعہ واضح اور متعین ہوں۔مثلاً وہ اس طرح کا نام نہ ہو:''برصغیر کی جدید تاریخ کے خدوخال'' یا ''بعض جدید ادبی نظریات کا مطالعہ''۔اس طرح کے عنوانات پہلے قدم سے ہی طالب علم کے لیے مشکل پیدا کر دیتے ہیں۔

-ایسا جامع اور پر مغز ہو کہ اس کے الفاظ سے تحقیق کی جزئیات وتفصیلات جھلکتی ہوں اور وہ تحقیق کے ذیلی عنوانات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہو۔

-ایسا دل کش، انوکھا، اور جاذب نظر ہو کہ پہلی نظر میں قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لے۔

ذیل میں دی گئی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کون سا "عنوان" آپ کو پوری کتاب پڑھنے پر ابھارتا ہے:

۱- آپ بیتی

۲- کاروانِ زندگی

....

۳- بیس ملکوں کا سفرنامہ

٤- جہانِ دیدہ

....

۵- سقوطِ ڈھاکہ کی رُوداد

٦- میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا

....

۷- ایک نومسلم کی داستانِ ایمان

۸- گنگا سے زمزم تک

یہ نام اگرچہ تحقیقی مقالات کے نہیں، لیکن آپ نے یقیناً محسوس کیا ہوگا کہ عنوان ۲، ٤، ٦، ۸، پڑھنے والوں کے لیے زیادہ کشش کا باعث ہیں، بنسبت عنوان ۱، ۳، ۵، ۷ کے۔ یہاں یہ بھی یاد رکھیں کہ "عنوان" میں بے جا تکلف، سجع بندی اور مبالغہ آرائی کسی طور مناسب نہیں، خصوصاً "علمی تحقیق" میں اس سے مکمل گریز کرنا چاہیے۔

دوسرا مرحلہ- خاکہ تیار کرنا

جس طرح کسی عمارت کی تعمیر سے پہلے اس کا نقشہ بنانا ضروری ہے، اسی طرح کسی مقالے یا تصنیف سے پہلے اس کا خاکہ (خُطّة البحث) تیار کرنا ضروری ہے۔ خاکہ سازی کا مطلب یہ ہے کہ طالب علم اپنی تحقیق سے متعلق تین چیزیں متعین کرے:

۱- مقالے کا ایسا نام جو مختصر ہونے کے ساتھ واضح اور جامع ہو۔

۲- اس نام کے تحت آنے والے مرکزی عنوانات۔ ان میں سے ہر ایک کی حیثیت مقالے کے "باب" کی ہوگی۔

۳- مرکزی عنوانات کے تحت آنے والے ذیلی عنوانات۔ ان میں سے ہر ایک کی حیثیت

مقالے کی ''فصل'' کی ہوگی۔

خاکہ تیار کرنے کے لیے تحقیق نگار کو دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے: معیاری نمونہ اور بنیادی مآخذ۔

''معیاری نمونہ'' سے مراد کوئی ایسا مقالہ ہے جس کو دیکھ کر نوآموز تحقیق کار اپنے ذہن میں ایک سانچہ بنا سکے۔ جامعات کے کتب خانوں میں بہت سے معیاری مقالات موجود ہوتے ہیں۔ طالب علم کو چاہیے کہ وہ جس مضمون میں تحقیق کر رہا ہے اس میں لکھے ہوئے کسی مقالے تک رسائی حاصل کر کے اس کے خاکے یعنی فہرست کی مدد سے اپنے مقالے کے بنیادی خدوخال متعین کرنے میں مدد لے۔ مثلاً فقہی موضوع پر تحقیق کرنے والا فقہی مقالات کے خاکوں اور کسی شخصیت یا مقام مثلاً آثارِ قدیمہ پر تحقیق کرنے والا کسی شخصیت یا تاریخی جگہ پر لکھے گئے مقالوں کی فہرست سے استفادہ کرے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بعینہٖ اسی مقالے کا طرز اپنائے، اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے مقالے کے ''خطۃ البحث'' (Synopsis) کی تیاری میں ان سے رہنمائی حاصل کرے۔

دوسری چیز جو طالبعلم کو خاکہ سازی کے لیے درکار ہوتی ہے وہ ''بنیادی مآخذ'' ہیں یعنی وہ ابتدائی کتابیں جن کی مدد سے طالبعلم ابتدائی خاکہ تیار کرے گا۔ ان سے آگاہی کیسے حاصل کی جائے؟ نوآموز طلبہ کے لیے یہ ایک مشکل سوال ہے، لیکن اس کا جواب نہایت آسان ہے کہ مندرجہ ذیل پانچ ذرائع سے آپ اپنے موضوع کے متعلق کتابوں سے ابتدائی شناسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد مزید مراجع دورانِ تحقیق خود بخود سامنے آتے رہیں گے۔ وہ ذرائع یہ ہیں:

(۱) اساتذہ اور ماہرینِ فن:

سب سے پہلے طالبعلم کو اپنے اساتذہ اور ماہرین فن سے استفادہ کرنا چاہیے۔ ان کا بے لوث تعاون اس کے لیے اہم مراجع کی نشاندہی کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

(۲) کتب خانوں کے نگران حضرات:

طالب علم کو چاہیے کہ ان تمام کتب خانوں کے نگران حضرات اور ان کے ماتحتوں سے دوستانہ تعلقات استوار کرے جن میں اس کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ مراجع کے حوالے سے ان حضرات کی معلومات بہت وسیع ہوتی ہیں اور وہ ایسی جدید وقدیم کتابوں سے واقف ہوتے

ہیں جن تک دوسروں کی رسائی آسان نہیں ہوتی۔

(۳) کتب خانوں کی فہرستیں:

ہر معیاری کتب خانے میں کتابوں کی مرتب فہرستیں (کیٹلاگ) ہوتی ہیں۔ زیرِ تحقیق مضمون سے متعلقہ کتابوں کی فہرست پر نظر ڈالنے سے نئے نئے مراجع طالبعلم کے سامنے آتے جاتے ہیں۔

(٤) دائرہ ہائے معارف یا موسوعات (انسائیکلوپیڈیاز):

دائرۃ المعارف یا انسائیکلوپیڈیا میں جن موضوعات پر مختلف ماہرین سے مقالات لکھوائے جاتے ہیں، ان کے آخر میں ان مقالات کے مآخذ بھی درج ہوتے ہیں۔ طالبعلم اپنے موضوع سے متعلق تمام شخصیات، مقامات پر لکھے گئے مقالات کا مطالعہ کرے اور ان کے آخر میں دیے گئے مراجع سے استفادہ کرے۔

(۵) تحقیقی کتابیں اور رسائل:

وہ کتابیں جن میں کسی موضوع پر تحقیق ہوتی ہے، اسی طرح وہ جدید تحقیقی رسائل جن میں اصولِ تحقیق کو مدنظر رکھ کر تحقیقی مضامین و مقالات پیش کیے جاتے ہیں، ان کے حاشیے میں یا آخر میں متعلقہ کتب کے حوالہ جات درج ہوتے ہیں۔ ان حاشیوں اور کتابیات سے طالبعلم کو بہت سے مراجع مل سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا پانچ ذرائع سے طالبعلم کو مراجع کا مفید ذخیرہ مل جائے گا۔ پھر وہ جیسے جیسے آگے بڑھے گا اس کے مطلوبہ مراجع شاخ درشاخ پھیلتے جائیں گے۔ ممکن ہے کہ وہ تحقیق کی ابتدا بیس مراجع سے کرے اور اختتام تک اس کے پاس دو سو مراجع جمع ہو جائیں۔

یاد رہے کہ مقالے کے عنوان کے طرح مرکزی اور ذیلی عنوانات بھی قطعی اور حتمی نہیں ہوتے۔ تحقیق کار اگر آگے چل کر ان میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کرے تو اپنے نگران استاد کی رہنمائی اور مشورے سے ایسا کر سکتا ہے۔

تیسرا مرحلہ-معلومات جمع کرنا

تحقیق کا خاکہ تیار کرنے کے بعد اگلا مرحلہ معلومات جمع کرنے کا ہے تا کہ اس خاکے میں رنگ بھرا جاسکے۔معلومات جمع کرنے کے طریقے مقالات کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں،لیکن یادرکھیے!تحقیق خواہ کسی بھی قسم کی ہو،اس کی ابتدا کتب خانے سے کرنی چاہیے اور اوپر دیے گئے پانچ ذرائع سے استفادہ کرتے ہوئے ان مآخذ تک رسائی حاصل کرنی چاہیے جن میں اس کے موضوع سے متعلق معلومات موجود ہوں۔

تحقیق نگار کو چاہیے کہ اپنے اساتذہ اور متعلقہ شعبہ کے ماہرین سے معلومات حاصل کرنے میں جھجک اور ہچکچاہٹ کو ہرگز حائل نہ ہونے دے۔اسی طرح تحقیق نگار کو کتب خانوں کے منتظمین سے خوش گوار روابط قائم کرنے چاہییں،تاکہ مطلوبہ مآخذ تک رسائی کے لیے وہ اسے اپنی خدمات اور تعاون نہایت خوش دلی سے پیش کریں۔اس طرح وہ بہت سا وقت اور محنت بچالینے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔

معلومات جمع کرنے کا طریقہ:

تحقیق نگار کو علمی تحقیق نگاری میں مختلف مراجع سے معلومات جمع کرنے کے لیے ''نوٹ بک'' اور ''فائل بندی'' کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔یعنی وہ اپنے پاس دو چیزیں رکھے: بیاض (نوٹ بک)اور فائل۔بیاض میں ابتدائی یاداشتیں لکھے یا وہ چیزیں جو اسے ہنگامی طور پر یاد آئیں یا کہیں مل جائیں،پھر انہیں ترتیب سے فائل میں مقررہ جگہ میں اتارتا رہے۔

فائل ترتیب دینے کا طریقہ یہ ہے کہ تحقیق نگار ایک فائل لے کر اسے ابواب اور فصول یعنی مرکزی عنوانات اور ذیلی عنوانات کے اعتبار سے مختلف حصوں میں تقسیم کردے،اس کے بعد فائل کے کاغذ سے نسبتاً موٹا کاغذ لے کر تیر کے مشابہ ٹکڑے (کارڈ) بنائے اور ان پر فائل میں بنائے گئے حصوں کے نام لکھ کر بطور علامت فائل کے صفحات میں رکھ دے۔یوں فائل میں ہر موضوع کا ایک حصہ مقرر ہوجائے گا اور تیر کا نشان اس کے لیے بطور علامت ہوگا۔اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہر موضوع سے متعلق اقتباسات اور دیگر معلومات کو فائل میں اس کی مقرر کردہ جگہ پر رکھنا آسان

ہوگا۔ رجسٹر کی جگہ فائل اپنانے کا فائدہ یہ ہے کہ بوقت ضرورت صفحات میں حسبِ منشا کمی بیشی آسان رہتی ہے۔

اس کے بعد جب تحقیق نگار معلومات جمع کرنے کی غرض سے مطالعہ شروع کرے تو ہر اہم، مفید اور موضوع سے متعلق چیز کا خلاصہ یا عنوان فائل میں موجود اس کے خاص حصے میں درج کرتا چلا جائے اور اس کے ساتھ کتاب اور مؤلف کا نام، جلد وصفحہ نمبر، ناشر کا نام اور تاریخ اشاعت بھی نوٹ کرے اور آخر میں یہ بھی لکھ لے اسے یہ ماخذ کہاں دستیاب ہوا؟ آیا خود اس کے پاس موجود ہے، کسی دوست کے ہاں پایا ہے یا کسی کتب خانے میں دیکھا ہے؟ تا کہ بوقتِ ضرورت اس کے حصول میں دشواری نہ ہو۔

تحقیق نگار کے لیے مناسب ہوگا جن مآخذ وکتب کو ایک بار دیکھ چکا ہے ان کی ایک فہرست تیار کرلے، تا کہ آیندہ چل کر کسی غلط فہمی کی بنا پر وقت اور محنت ضائع نہ ہو۔ ایک اچھا تحقیق نگار اسی طرح کتابوں کی چھان بین کر کے اقتباسات، اہم معلومات اور دیگر مواد اپنے پاس محفوظ کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کے پاس معلومات کا ایک وسیع ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے۔

معلومات جمع کرنے کے اصول:

ایک نئے تحقیق نگار کو معلومات جمع کرتے وقت درج ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہیے:

۱- جو چیز بھی دیکھے گہری نگاہ سے اس کا مطالعہ کرے۔ رطب و یابس جمع کرنے سے اجتناب کرے۔

۲- فائل میں درج کی گئی معلومات واقتباسات وغیرہ کی فوٹو کاپی بنوانے کا اہتمام کرے، تا کہ الگ الگ دو فائلیں تیار ہو جائیں۔ ایک گھر میں محفوظ رکھے اور دوسری کہیں آتے جاتے وقت اپنے ساتھ رکھے۔

۳- تحقیق کے لیے معلومات جمع کرنے کا آغاز "بنیادی اور اصلی مآخذ" سے کرے، مگر ثانوی مآخذ" اور ایسی جدید کتب کو بھی سامنے رکھے جن میں تازہ ترین اور مستند معلومات دی جاتی ہیں۔

٤- معلومات جمع کرنے کی غرض سے جس کتاب کا بھی مطالعہ کرے اس کی "کتابیات" کی

فہرست ضرور پڑھے، تاکہ ایسے مآخذ ومراجع سامنے آسکیں جو پہلے اسے معلوم نہ تھے۔ اسی طرح حاشیے میں دیے گئے حوالہ جات پر بھی نظر رکھے کہ ان سے بھی نئے مآخذ ملتے ہیں۔

۵- تحقیق نگار کے لیے ضروری ہے کہ بیدار مغز اور دقیق النظر ہو۔ اپنی تحقیق سے متعلق اہم مضامین کو پورے انہماک سے پڑھے، غیر متعلقہ اجزا سے صرفِ نظر کرے، تاکہ ان کی تفصیل میں الجھ کر وقت ضائع نہ ہو۔ اپنے مطلوبہ افکار کی تلاش کے لیے سطروں پر نگاہ دوڑائے اور بین السطور کو بھی سمجھنے کی کوشش کرے تاکہ مصنف کے ذکر کردہ افکار ونظریات کا خلاصہ اور نچوڑ صحت اور سلیقہ کے ساتھ نکال سکے۔

٦- اگر کسی خاص فصل یا باب سے متعلق معلومات جمع کرتے وقت تحقیق نگار کے سامنے کسی دوسری فصل یا باب کی اہم معلومات آجائیں تو اسے چاہیے کہ انہیں غنیمت جان کر فوراً اپنی بیاض یا فائل میں اس کی مقررہ جگہ میں درج کرلے، تاکہ اسے بعد میں از سرنو تلاش کی مشقت نہ اٹھانی پڑے۔ اگر بالفرض دوسری فصل یا باب کی معلومات فائل میں درج کرنے کی وجہ سے اسے اپنے خیالات کا تسلسل منقطع ہونے کا اندیشہ ہو تو کم از کم ان معلومات کا اجمالی اشارہ اور مختصر حوالہ ہی محفوظ کرلے۔

۷- تحقیق نگار کو چاہیے کہ ایک چھوٹی بیاض اور قلم ہر وقت اپنے پاس رکھے۔ جب بھی کوئی نئی بات، نکتہ یا رائے ذہن میں آئے تو اسے فوراً درج کرلے۔ کم از کم اس کا اشاریہ تو لکھ ہی لے۔ چاہے وہ اس وقت کسی علمی مجلس میں شریک ہو یا کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہو یا دوستوں کے ساتھ بحث ومباحثہ کررہا ہو۔ پھر جلد از جلد اسے اصل بیاض (فائل) میں مقررہ جگہ پر درج کرے۔

تحقیق نگار سوتے وقت بھی اس بیاض کو اپنے آپ سے جدا نہ کرے، اس لیے کہ افکار کی آمد کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب انسان سونے کے لیے بستر پر دراز ہوتا ہے تو افکار وخیالات کا ایک تانتا بندھ جاتا ہے اور نت نئے نکات کا ورود شروع ہوجاتا ہے۔ اب اگر صبح کے انتظار میں انہیں لکھے بغیر یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو بسا اوقات وہ پردۂ نسیان کے پیچھے غائب ہوجاتی ہیں۔ نیند سے اٹھنے کے بعد بھی اسی طرح کی کیفیت پیش آتی ہے، اس لیے یہ چھوٹی یادداشت سرہانے دھری رہنی چاہیے تاکہ بعد میں کفِ افسوس نہ ملنا پڑے۔

۸- تحقیق نگار کو چاہیے کہ ہر حوالے اور اقتباس کو الگ الگ صفحہ پر لکھے، تاکہ بوقتِ ضرورت

اس صفحے کو فائل میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا آسان ہو۔

۹-تحقیق نگار صفحے کے ایک جانب لکھے اور دوسری جانب کو خالی چھوڑ دے تاکہ بعد میں سامنے آنے والی نئی باتوں کو پشت پر لکھا جاسکے۔ اس صورت میں ضروری ہے کہ تیر کا نشان بنا کر صفحے کی پشت کی طرف اشارہ کر دیا جائے اور ساتھ یہ عبارت بھی درج کر دی جائے: "صفحہ کی دوسری جانب ملاحظہ فرمایئے" تاکہ ضرورت کے وقت دوسری جانب دیکھنا بھول نہ جائے۔

۱۰-اگر دو صفحات کے درمیان ایک صفحہ بڑھانے کی ضرورت پڑ جائے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اضافی صفحے کو پن کے ساتھ جوڑ کر اصل صفحے پر مثلاً ۳۰ الف اور اضافی صفحے پر ۳۰ ب لکھ دیا جائے، تاکہ ان کے جدا ہو جانے کی صورت میں تلاش کرنا آسان ہو۔

۱۱-تحقیق نگار کو چاہیے کہ کتابوں سے اخذ کردہ اقتباسات اور اپنے غور و فکر کا حاصل جسے "تعلیقات" کہتے ہیں، کے درمیان واضح طور پر امتیاز قائم کرے۔ ہر اقتباس سے پہلے اور بعد اپنی تمہید اور تبصرہ کے ذریعے موضوع پر اپنی گرفت کا اظہار کرے تاکہ اس کا مقالہ محض اقتباسات کا پلندہ نہ ہو، بلکہ اس میں مقالہ نگار کی محنت اور انفرادیت جھلک رہی ہو۔

۱۲-تحقیق نگار کو چاہیے کہ اقتباسات و تعلیقات کو واضح اور خوشخط لکھے اور انہیں نقل کرنے میں خوب احتیاط سے کام لے، تاکہ ایک بار لکھی گئی چیز واضح نہ ہونے کی بنا پر دوبارہ اصل ماخذ سے تلاش کرنے کی زحمت نہ ہو۔

۱۳-اگر ہر صفحہ پر درج شدہ معلومات کی مناسبت سے ایک عنوان بھی لکھ دیا جائے تو تحقیق کو آخری شکل میں لکھتے وقت تحقیق نگار تلاش و جستجو کی ایک بڑی مشقت سے بچ سکتا ہے۔

۱۴-تحقیق نگار کے لیے مناسب ہے کہ گاہے گاہے اپنی بیاض (فائل) کی ورق گردانی کرتا رہے۔ جو مواد جمع ہو چکا ہے اس پر نگاہ ڈالتا رہے، تاکہ اس کی ساری محنت اس کے سامنے رہے اور ایک بار درج کردہ معلومات کسی دوسری کتاب میں دیکھ کر دوبارہ درج کرنے میں وقت اور محنت ضائع نہ ہو۔

۱۵-تحقیق نگار کو چاہیے کہ تحقیق کے اس مرحلے میں صبر و سکون اور تحمل مزاجی کا ثبوت دے۔ اپنے جمع کردہ مواد اور تحقیق کی ضروریات کا تقابل کرے اور یوں اپنی مربوط جد و جہد کے ذریعہ

اپنے کام کو کمال اور عمدگی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچائے۔

مشق

١-تحقیق وریسرچ کی جامع تعریف ذکر کریں۔

٢-مقالہ نگاری کے 4 مراحل کا تعارف مختصرا لکھیں۔

٣-موضوع کے انتخاب میں کن پہلوؤں کو لازمی طور پر پیش نظر رکھا جائے گا؟

٤-خطہ سازی کے بنیادی عناصر ترکیبی کیا ہیں؟

٥-تحقیق کے طالب علم کو دوران تحقیق کن اہم باتوں کا خیال رکھنا چاہیے؟ صرف دس نکات ایک ایک سطر میں لکھیں۔

چوتھا مرحلہ-مسوّدہ لکھنا

جب تحقیق نگار کو اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ وہ بقدر کفایت معلومات کا ذخیرہ جمع کر چکا ہے تو تحقیق کا مسودہ لکھنے کا آغاز کر دے۔ مرکزی عنوانات سے ذیلی عنوانات کی طرف بڑھتا جائے اور ایک ایک فصل لکھتا جائے۔اس دوران وہ ان آداب کا لحاظ رکھے:

۱-تحقیق کی ابتدا میں تحقیق کا مقدمہ، موضوع کے خلاصہ، اس کی اہمیت اور ان اسباب پر مشتمل ہوتا ہے جو تحقیق لکھے جانے کا سبب بنے۔مختصر یہ کہ "مقدمہ" تحقیق کا اجمالی خاکہ پیش کرتا ہے اور قاری کو تحقیق کے اہم عناصر سے روشناس کراتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ تحقیق نگار کے اختیار کردہ علمی اسلوب اور معلومات جمع کرنے کے طریقِ کار پر بھی روشنی ڈالتا ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ مقدمہ ایسی سنجیدہ و جامع عبارت اور دلآویز اسلوب میں لکھا جائے جو قاری کو پوری تحقیق پڑھنے پر آمادہ کر دے۔

۲-تحقیق کے آخر میں "خاتمہ" ہوتا ہے، اس میں ان افکار ونظریات کا نچوڑ پیش کیا جاتا ہے جن پر تحقیق نگار تحقیق کے دوران خوب تفصیل سے کلام کر چکا ہوتا ہے، اس کے علاوہ ان نتائج کا بھی بیان ہوتا ہے جن تک تحقیق نگار نے رسائی حاصل کی۔

۳- نئے باب اور فصل کے آغاز سے پہلے ایک مختصر سا مقدمہ تحریر کیا جائے، اس میں آنے والی معلومات کو پیش کرنے کے طرز اور ترتیب کا ذکر ہو اور اس خاکہ کی وضاحت ہو جس کے مطابق تحقیق نگار تحقیق کو ڈھالنا چاہتا ہے، اسی طرح جن اہم امور سے تحقیق نگار کسی وجہ سے صرفِ نظر کرنا چاہتا ہے ان کی بھی نشاندہی کر دی جائے۔

باب یا فصل کا اختتام ایک "خلاصہ" کے ساتھ کیا جائے، اس میں ان اہم نتائج کا مختصر جائزہ لیا جائے جن تک تحقیق نگار پہنچ سکا یا پھر "خلاصہ" میں باب کی اہم معلومات کا سرسری جائزہ پیش

کیا جائے۔

٤- اگر تحقیق نگار کسی امر کا مدعی ہے تو دلیل پیش کرنا اس کے ذمہ لازم ہے اور اگر صرف ناقل ہے تو مکمل حوالہ ذکر کرنا ضروری ہے۔

٥-تحقیق میں غور وفکر اور تنقید و تجزیہ ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ تحقیق نگار کو چاہیے کہ تحقیق میں اپنے آپ کو کھپا دے اور تحقیق سے متعلق ہر چیز کا خوب عرق ریزی سے مطالعہ کرے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مطالعہ میں آنے والے ہر فکر ونظریہ کو ایسی ناقابلِ تردید حقیقت سمجھ کر قبول نہ کرے جو بحث وتنقید سے بالاتر ہو، بلکہ وہ اپنے آپ کو ایسا منصف مزاج قاضی تصور کرے جو اچھی طرح چھان پھٹک کرنے کے بعد ہی کسی دلیل کو قبول کرتا یا کوئی فیصلہ دیتا ہے۔

٦-تحقیق میں شخصیات کی طرف اشارہ کرتے وقت بہتر ہے کہ علمی القاب اور عہدے وخطابات ذکر نہ کیے جائیں، الّا یہ کہ موقع کی مناسبت سے اس کی ضرورت ہو اور تحقیق نگار اپنی رائے اور نظریے کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے لیے لقب ذکر کرنا ضروری سمجھے، مثلاً: وہ یہودیوں کے بارے میں تحقیق کر رہا ہے اور اپنی کسی رائے کی تائید پیش کرتے ہوئے کہتا ہے:

"یہودیوں کے صفِ اوّل کے رہنما اور عالمی صہیونی تحریک کے بانی ڈاکٹر وائزمین نے اپنی کتاب...... میں لکھا ہے...... ۔

ایسا کرنے سے تحقیق میں جان اور رائے میں وزن پیدا ہو جاتا ہے۔

٧-ایک اہم بات یہ ہے کہ تحقیق نگار جمع شدہ تمام مواد کو تحقیق کا حصہ بنانے پر اصرار نہ کرے کہ اس سے مقالہ بہت طویل اور بوجھل ہو جائے گا، بلکہ اسے چاہیے کہ مواد میں سے تحقیق کے لیے مفید اور اہم نکات کا باریک بینی سے انتخاب کر لے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی ماندہ مواد کو تلف کر دے، بلکہ اسے بھی آخری وقت تک محفوظ رکھے، کیوں کہ بسا اوقات تحقیق کو آخری شکل میں لکھتے وقت یا دیگر علمی تحقیقات کے ساتھ تقابل کی صورت میں اس محفوظ مواد کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔

٨-تحقیق سے حاصل شدہ نتائج اور افکار کی صحت وصداقت کا اطمینان کیے بغیر ان کی عام اشاعت میں عجلت سے کام نہیں لینا چاہیے۔

۹-تحقیق کو پیش کرنے سے پہلے نظر ثانی نہایت ضروری ہے تا کہ لغوی، املائی اور علمی اغلاط کی اصلاح کی جا سکے نیز کمپوزنگ کی غلطیوں سے اطمینان ہو جائے۔

۱۰-تحقیق نگار کو چاہیے کہ دورانِ تحقیق پیش آنے والی مشکلات اور تھکان سے دلبر داشتہ اور پست ہمت نہ ہو، اس لیے کہ شہد کی مٹھاس سے لطف اندوز ہونے کے لیے شہد کی مکھی کے ڈنک سہنے پڑتے ہیں اور دوشیزہ کو پیغامِ نکاح دینے والے کو مہر کی گرانی برداشت کرنی ہی پڑتی ہے۔

تحقیق کی زبان اور اسلوب:

۱-جہاں تک ممکن ہو متکلم کی ضمائر (میں، ہم وغیرہ) سے اجتناب کرنا چاہیے۔ایسی عبارات سے بھی گریز کیا جائے جن سے اپنی ذات کے اظہار یا تعلّی کا تاثر ملے، جیسے: "میرا یہ نظریہ ہے" یا" میں اس تحقیق پر پہنچا ہوں۔" اس کے بجائے یوں کہا جائے: "تحقیق نگار کا یہ نظریہ ہے" اور" تحقیق نگار اس نتیجے پر پہنچا ہے۔"

۲-ایسا اسلوب اختیار کرنے سے بھی پرہیز کرنا چاہیے جس سے فخر وغرور اور عجب وخود پسندی جھلکتی ہو، اسی طرح ایسی باتوں سے بھی بچے جس سے اپنے عمل، ذات، محنت اور تحقیق کی راہ میں مشکلات کے بارے میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہو، جیسے:

"اپنے طویل تجربے اور تحقیق کی بنیاد پر میرا یہ یقین ہے......" یا" نہایت غور وفکر اور سخت جدوجہد کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں......"

اس کے بجائے یوں کہا جائے: "تحقیق نگار پر یہ بات ظاہر ہوئی......" یا اس طرح کہا جائے:"پہلے جو کچھ ذکر ہو چکا ہے اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے......" یا یوں کہے:"اس ساری تحقیق سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ......"

۳-تمسخرانہ انداز، رکیک جملوں اور کسی کے افکار پر کیچڑ اچھالنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

٤-تحقیق کو فصیح زبان میں املا ولغت کے قواعد کی رعایت کے ساتھ تحریر کیا جائے۔ایسے موزوں الفاظ کا انتخاب کیا جائے جو معنیٰ کی گہرائی اور حسن کو نکھار کر سامنے لائیں۔اسلوب ایسا سہل، واضح اور جاندار ہو کہ ایک علمی تحقیق کے ساتھ مکمل مطابقت رکھے۔لفظی پیچیدگیوں اور غیر

ضروری قافیہ بندی سے پاک چھوٹے چھوٹے جملے تحریر کا حسن ہیں اور اس کی وقعت میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔

۵-تحقیق کا مسودہ لکھنے کے دوران ''املا'' اور ''لغت'' کی غلطیوں سے بچنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔

٦-فعل و فاعل، مبتدا و خبر، شرط و جزا اور موصول وصلہ میں طویل فاصلے سے احتراز کرنا چاہیے تاکہ جملے کے دونوں اجزا کا باہمی ربط سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔

۷-اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ تحریر میں اپنی رائے پر کہیں بھی تذبذب اور بے یقینی کی کیفیت ظاہر نہ ہونے پائے۔

۸-کسی رائے کی تائید میں دلائل ذکر کرتے وقت نسبتاً کمزور دلیل سے آغاز کر کے بتدریج قوی اور قوی تر کی طرف بڑھنا چاہیے۔

۹-کسی بات اور مفہوم کے بار بار تکرار سے قطعی اجتناب کریں۔ اگر کہیں اس کی ضرورت پیش آجائے، مثلاً: آپ دو موضوعات میں ربط اور مناسبت بتانا چاہتے ہیں تو یوں لکھیں:

"جیسا کہ اس کی وضاحت فلاں صفحہ میں گزر چکی ہے۔"

یا یوں کہیں: "جیسا کہ اس کی تفصیل فلاں صفحہ پر آرہی ہے۔"

۱۰-تحریر میں طوالت سے گریز کیا جائے۔ اگر کوئی مفہوم پانچ الفاظ میں بیان ہو سکے تو اسے چھ یا اس سے زائد الفاظ میں بیان نہ کیا جائے۔ ایسی تفصیل سے بچنا چاہیے جو تحریر کو ضرورت سے زیادہ پھیلا دے اور موضوع سے اس کی وابستگی جاتی رہے۔ اس کے بالمقابل تحقیق کو ایسے اختصار سے بھی پاک رکھنا چاہیے جس سے مطلب سمجھنے میں دشواری ہو۔

تحقیق میں عبارات کا اندراج:

۱-اقتباس کردہ آیات ''وادین'' میں لکھی جائیں گی یا انہیں ان خوبصورت پھولدار قوسین میں رکھا جائے گا جو کمپیوٹر میں اسی غرض کے لیے مخصوص ہوتی ہیں، نیز ان کو نسبتاً گہرے اور موٹے خط میں یا قرآن شریف کے لیے مخصوص خط میں یا (ممکن ہو تو) کسی دوسرے رنگ میں لکھا جائے

گا۔اس کے بعد قوسین میں سورت کا نام اس کے بعد دو نقطے اور پھر آیت نمبر درج کیا جائے گا۔

۲ - احادیث کو بھی واوین یا مخصوص قوسین میں لکھا جائے گا۔بہتر ہوگا کہ حدیث کی کمپوزنگ بھی نسبتاً گہرے اور موٹے خط میں یا (ممکن ہو تو) کسی دوسرے رنگ میں ہو۔اس کے بعد حدیث کی کتاب، باب اور جلد وصفحہ ہو۔مثلاً: "متفق علیہ" یا" رواہ الشیخان" یا" رواہ اصحاب السنن" لکھنے کے بعد کتاب، باب اور جلد وصفحہ درج کیا جائے گا۔

اگر رقم الحدیث ذکر کر دیا جائے تو جلد وصفحہ کا قائم مقام ہوتا ہے۔مثلاً:

صحیح بخاری: کتاب العلم، باب فضل العلم، رقم الحدیث:۲۵

۳ - اقتباس کا متن نقل کرنے میں تحقیق نگار کو انتہائی احتیاط سے کام لینا چاہیے اور ایک ایک لفظ کو دھیان سے بغیر کسی ترمیم کے نقل کرنا چاہیے۔اگر نقل کردہ اقتباس میں لغت، املا یا معنی وفکر کی کوئی غلطی پائی جائے اور تحقیق نگار قاری کو یہ بتانا چاہے کہ یہ غلطی اصل کتاب کی ہے تو عبارت کو جوں کا توں غلط نقل کرنے کے بعد قوسین میں لکھ دے: [اصل کتاب میں اسی طرح ہے]

٤- جب تحقیق نگار کسی عبارت کی تلخیص کرکے اسے اپنے اسلوب اور عبارت میں پیش کرے تو وضاحت کردے کہ یہ تعبیر لفظی نہیں، تعبیرِ معنوی ہے۔نیز انتہائی توجہ سے کام لے کہ معنی و مفہوم میں فرق نہ ہو جائے۔احتیاط اور دیانت کا تقاضا ہے کہ کسی عبارت کی تلخیص یا اختصار کے بعد تحقیق نگار کو اس بات کا مکرر اطمینان کرلینا چاہیے کہ وہ مؤلف کی مراد کو اچھی طرح سمجھ چکا ہے۔ اس لیے کہ "سوءِ فہم" علم کے لیے بہت بڑی آفت ہے۔

ن - اگر اقتباس بعینہٖ مؤلف کے الفاظ میں نقل کیا گیا ہے تو درج ذیل باتوں کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے:

(الف) اگر اقتباس پانچ سطروں سے زائد نہ ہو تو اسے "مقالہ" ہی کے رسم الخط اور حجم میں لکھا جائے گا اور بین السطور کا فاصلہ بھی اسی کے مطابق ہوگا۔

(ب) اگر اقتباس طویل ہو یعنی پانچ سطروں سے زائد ہو تو دونوں طرف قدرے زیادہ حاشیہ چھوڑ کر، دو سطروں کے درمیانی فاصلے کو کم کرکے اور اقتباس کے الفاظ کو بقیہ الفاظ سے چھوٹا رکھ کر لکھا جائے گا۔

٦- کسی ایسے مآخذ سے استدلال کو جو خود کسی دوسرے ماخذ سے لیا گیا ہو، اصل ماخذ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اصل ماخذ کی طرف رجوع کر کے اغلاط، تصحیف، تحریف اور کمی بیشی سے محفوظ ہونے کا اطمینان کرلیا جائے۔ اگر اصل ماخذ تک رسائی ممکن نہیں تو اقتباس کردہ عبارت کو علاماتِ تحدید کے درمیان لکھ کر قوسین میں یوں رکھ دیا جائے: ("......") اور حاشیہ میں یوں اشارہ کیا جائے: "فلاں مؤلف نے اپنی فلاں کتاب کے فلاں صفحہ پر یہ اقتباس نقل کیا ہے۔"

٧- اقتباس نقل کرتے وقت بہتر ہوگا کہ اس سے پہلے موضوع سے اس کا ربط اور اہمیت بیان کردی جائے اور اس کے بعد اس کا نچوڑ اور خلاصہ یا نتیجہ ذکر کردیا جائے۔ مختلف عبارتوں سے پہلے تمہید لکھنے، ان کے درمیان تقابل کرنے اور ان کے بعد تبصرہ لکھنے میں طالب علم کو اپنی تحقیقی وتحریری صلاحیت اجاگر کرنا چاہیے تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس نے جمع کردہ معلومات اور مواد کو اچھی طرح سمجھا ہے اور ان سے صحیح صحیح مطلب اخذ کیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ صرف انہیں نقل کرتا چلا گیا ہو، کیونکہ اس صورت میں وہ صرف ایک ناقل ہوگا نہ کہ تحقیق نگار۔

٨- تحقیق نگار کو چاہیے کہ الفاظ میں ہیر پھیر اور اقتباسات میں ایسے حذف وترمیم سے بچے جس سے مفہوم کے سمجھنے میں خلل واقع ہو۔ یہ اہل حق کا طریقہ نہیں، اہلِ باطل کا امتیاز ہے۔ اہل باطل اپنے غلط نظریات یا علمائے حق پر بے جا اعتراضات کے لیے یہ جھوٹا اور ناجائز حربہ استعمال کرتے ہیں۔ امامِ اہلِ سنت حضرت مولانا سرفراز خان صاحب صفدر رحمۃ اللہ علیہ کی معرکۃ الآرا کتاب "عباراتِ اکابر" میں اس کی متعدد مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ حال ہی میں "مسجدِ اقصیٰ کی تولیت" اور "ارضِ فلسطین کی وراثت" یہود کے حوالے کرنے کے لیے ایک نوجوان عالمِ دین نے جو مقالہ لکھا، اس میں مسلمانوں کے دل میں یہود کے لیے نرم گوشہ بنانے کے لیے یہ کہا کہ یہود حضور علیہ الصلاۃ والسلام پر ایمان لے آئے تھے۔ صرف اتنا تھا کہ وہ انہیں بنو اسماعیل کا نبی سمجھتے تھے، بنو اسحاق کا نہیں۔ اس کے لیے مقالہ نگار نے پرلے درجے کی علمی خیانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے حاشیہ میں سورۃ البقرہ آیت ٧٦ لکھنے پر اکتفا کیا۔ اب عام قاری تو دھوکے میں پڑ جائے گا لیکن اگر کوئی سورۃ البقرہ کی ٧٦ آیت پڑھنے کی زحمت کرلے تو اسے حیرت ہوگی کہ علم سے نسبت رکھنے والا کوئی ادنیٰ شخص بھی اتنی بڑی حماقت یا خیانت کرسکتا

ہے۔آپ بھی اس آیت کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے کہ باطل دعوی کو ثابت کرنے کے لیے کیسے کیسے باطل طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔مذکورہ آیت کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

''اور جب یہ لوگ (منافق یہودی) مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جب ایک دوسرے کے ساتھ تنہائی میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں: کیا تم ان مسلمانوں کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر کھولی ہیں تاکہ یہ مسلمان تمہارے پروردگار کے پاس جا کر انہیں تمہارے خلاف دلیل کے طور پر پیش کرے؟ کیا تمھیں اتنی بھی عقل نہیں؟''

واضح رہے کہ یہودیوں کے کفر کے بارے میں یہی بات سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۱٤ میں بھی کہی گئی ہے لیکن مذکورہ بالا تحقیق نگار نے چوری پکڑے جانے کے ڈر سے اس کا حوالہ نہیں دیا، کیونکہ اس میں واضح طور پر "وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیَاطِیْنِهِمْ" کہہ کر ان منافق یہودیوں کو شیطان قرار دیا گیا ہے۔

مقالہ کو حتمی شکل دینا

ذیل میں کچھ ہدایات دی جارہی ہیں جن کا خیال رکھنے سے تحقیق نگار کی محنت کو چار چاند لگ جاتے ہیں اور تحقیق اپنی آخری شکل میں اس طور پر سامنے آجاتی ہے کہ اس کی قدر و قیمت اور مقام میں نمایاں اضافہ محسوس ہوتا ہے۔

۱۔تحقیق لکھنے کے لیے بہترین اور معیاری کاغذ استعمال کرنا چاہیے۔تحقیق کی جلد بندی یا فائل بندی کرنی چاہیے اور اسے ایسی عمدہ صورت میں پیش کرنا چاہیے کہ تحقیق نگار کے اعلیٰ ذوق کی عکاسی کرے۔

۲۔تحقیق کو حتمی شکل دیتے وقت ترتیب، سلیقے اور صفائی کا خاص خیال رکھا جائے۔الفاظ کی کاٹ پیٹ اور مکرر لکھائی سے حتی الامکان بچا جائے۔حاشیے کی حد سے تجاوز بھی نہ کیا جائے۔

۳۔مقالہ ہاتھ سے لکھتے وقت ایک سطر چھوڑ کر لکھا جائے۔کمپوزنگ کی صورت میں اس کی ضرورت نہیں۔

٤۔تحقیق کو واضح اور خوش خط لکھنا چاہیے۔حروف کی موٹائی مناسب ہونی چاہیے، نہ بہت بڑے ہوں اور نہ اتنے چھوٹے کہ پڑھے نہ جا سکیں۔اگر مقالے کو کمپوز کیا جائے تو ۱٤ یا ۱۵ کا

پوائنٹ رکھنا چاہیے۔

۵- پانچ سطروں سے زائد اقتباسات کو کمپوز کرتے وقت چھوٹے حجم میں، سطروں کا درمیانی فاصلہ کم کر کے اور دونوں طرف کے حاشیے سے نسبتاً زیادہ جگہ چھوڑ کے لکھا جائے گا۔

٦- صفحے کی دونوں جانب حاشیے کے لیے جگہ چھوڑی جائے۔ صفحے کے اوپر کا خالی حصہ صفحے کے نیچے کے خالی حصے سے اور دائیں جانب کا حاشیہ بائیں جانب سے قدرے زیادہ ہونا چاہیے۔ عام طور پر علمی تحقیقات میں اوپر کی جانب سے ٤ سینٹی میٹر، دائیں سے بھی ٤ جبکہ بائیں طرف سے ۳ اور نیچے کی جانب سے ۲ سینٹی میٹر کے بقدر حاشیہ چھوڑا جاتا ہے۔

۷- مرکزی عنوان سطر کے وسط میں جلی قلم سے لکھا جائے۔ ان پر واوین وغیرہ کچھ نہ ڈالا جائے۔ ذیلی عنوانات کو سطر کی ابتدا میں مرکزی عنوان سے قدرے چھوٹا کر کے لکھا جائے گا یا کم از کم تحقیق کے خط کے برابر لیکن گہرے سیاہ رنگ میں (بولڈ کر کے) لکھا جائے۔

۸- جب کسی چیز کی ضمنی تقسیم ہو رہی ہو تو اوّلی وثانوی تقسیم کو اس طرح ظاہر کیا جاتا ہے کہ ''اوّلی تقسیم'' کو اول، دوم، سوم کے الفاظ سے، ''ثانوی تقسیم'' کو الف، ب، ج کے حروف سے اور تیسری تقسیم کو اعداد سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اول، دوم، سوم کے الفاظ سطر کے شروع میں الف، ب، ج کے حروف ذرا اندر کی طرف ہٹ کر اور ۱، ۲، ۳ وغیرہ اعداد مزید اندر کی طرف لکھے جائیں گے۔ ان کے نیچے کی جگہ خالی رہے گی تاکہ تقسیمات اصلیہ وضمنیہ خوب ظاہر ہوں۔ اس کی تفصیل اس کتاب کے چوتھے باب ''رموزِ اوقاف'' کی دوسری فصل کے آخر میں بیان کردی گئی ہے۔

۹- مقالہ ہاتھ سے لکھنے کی صورت میں مختلف رنگوں اور خط کی مختلف اقسام کا استعمال ناگزیر ہے، مگر اس میں مبالغہ اور اسراف سے احتراز کرنا چاہیے۔

۱۰- ایسے تمام الفاظ پر بقدرِ ضرورت اعراب لگائے جائیں جن کے بلا اعراب ہونے کی صورت میں غلط فہمی اور التباس کا اندیشہ ہو۔ اسی طرح غیر معروف الفاظ، نیز وہ الفاظ جن کے کسی دوسرے لفظ کے ساتھ خلط ملط ہونے کا خطرہ ہو، ان پر بھی بقدرِ ضرورت اعراب لگانا چاہیے۔

مقالے کی ہیئت اور ترتیب:

تحقیق کے شروع میں ''سرورق'' اور ''اندرونی سرورق'' کے بعد ایک صفحہ "انتساب" کے لیے اور ا ... ت تشکر" کے لیے خاص ہوگا۔ اس میں معلومات جمع کرنے سے لے کر تحقیق کے م ... مختلف مراحل میں تعاون کرنے والوں کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ تحقیق میں "فہ ... مضامین" بھی شامل کی جائے گی۔ اس میں ہر فصل، باب اور مرکزی عنوان کا صفحہ نمبر درج کیا جائے گا۔ اس کے بعد تحقیق کا اصل متن پھر آخر میں ضمیمہ جات اور کتابیات آئیں گی۔ اس طرح سے تحقیق کی ترتیب کچھ اس طرح سے ہوگی:

- بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور آیتِ قرآنی یا حدیثِ نبوی (یا دونوں) کے لیے ایک صفحہ
- صفحہ برائے ''سرورق''
- صفحہ برائے ''اندرونی سرورق''
- صفحہ برائے "خلاصۂ تحقیق" (اس کی ضرورت انکشافی علمی تحقیقات میں پیش آتی ہے)
- صفحۂ انتساب
- صفحہ برائے "کلماتِ تشکر"
- صفحات برائے فہرست

(مقالے میں نقشے، خاکے یا گراف موجود ہوں تو ان کے لیے الگ سے مخصوص فہرست ترتیب دی جائے گی)

- تحقیق کا مقدمہ
- تحقیق کا متن
- خاتمہ
- ضمیمہ جات (اگر موجود ہوں)
- فہرستِ کتابیات

☆ تحقیق کے ابتدائی صفحات (جن میں عنوان کا صفحہ بھی شامل ہے) کے نمبر شمار'' حروف

ابجد'' میں لکھے جائیں گے اور باقی صفحات (مقدمہ کی ابتدا سے تحقیق کے اختتام تک) ہندسوں میں لکھے جائیں گے۔

☆ کتاب یا مقالہ کے متن کے صفحات نمبر صفحے کے اوپر دائیں، بائیں یا وسط میں ہونے چاہییں۔ اس لیے کہ حوالہ دیکھنے والا پہلے صفحہ نمبر دیکھتا ہے، پھر نیچے عبارت میں اپنا مطلوب تلاش کرتا ہے۔ اگر صفحات نمبر نیچے لکھے ہوں تو اسے طبیعت کے برخلاف نظر کو نیچے سے اوپر لے جانا پڑے گا۔ ہاں! جب صفحے کے اوپر والے حصے میں عنوان یا اعداد یا اور ایسی کوئی چیز ہو جس کی وجہ سے صفحہ نمبر وہاں لکھنا مناسب نہ ہو تو ایسے موقع پر اسے صفحے کے نچلے حصے میں منتقل کر دینا چاہیے۔ اس میں بھی موزونیت نہ پائی جائے تو صفحہ نمبر لکھے بغیر شمار کیا جائے گا۔

☆ اگر کتاب متعدد رسائل کا مجموعہ ہو اور کتاب اور رسائل کے صفحات کو الگ الگ ظاہر کرنا مقصود ہو تو کتاب کے صفحات حسبِ معمول صفحے کے اوپر اور رسالے کے صفحات نیچے اور چھوٹے خط میں لکھے جاتے ہیں۔

☆ ہر فصل کی ابتدا میں ایک مستقل صفحہ پر فصل کا عنوان اور اس کے ذیلی عنوانات درج کرنے چاہییں۔

اختتامی ہدایات:

☆...طالب علم کو چاہیے کہ مقالہ شروع کرنے سے پہلے موضوع سے متعلق مختلف پہلوؤں پر چھوٹے چھوٹے تحقیقی مضامین لکھتا رہے۔ استاد کی نگرانی اور ہدایات کے تحت لکھے گئے ان تحقیقی مضامین کی مدد سے طالب علم اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ آئندہ اصل مقالے کی ابتدا شروع ہی سے اچھی طرح کر سکے۔

☆...جمع کردہ مواد میں سے کچھ کو چھوڑنا اور انہیں مقالے کا جز نہ بنانا کافی کڑوا گھونٹ ہے۔ مواد اکٹھا کرنے کے دوران طالب علم نے جتنی محنت کی تھی، اس سے گزرنے کے بعد اس مواد کو استعمال نہ کرنا اس پر بہت گراں گزرتا ہے، لیکن اس کڑواہٹ کو خوشی خوشی نگلنے سے متعلق گفتگو ضروری ہے۔

طالب علم کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ غیر ضروری مواد جمع کرنے سے مقالے پر

لازماً منفی اثر پڑتا ہے۔اس کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ تحقیق کے لیے کی گئی محنت صرف مقالے کی تیاری کے لیے نہیں ہوتی ، بلکہ اس کا اصل ہدف متعلقہ مضمون میں مہارت حاصل کرنا، تحقیق کا طریقہ وسلیقہ سیکھنا اور تحقیقی ذوق کو فطرتِ ثانیہ بنانا ہوتا ہے۔ طالبعلم نے جتنا پڑھا ہے اور جتنا مواد اکٹھا کیا ہے، اس سے یقیناً اس کو فائدہ ہوا ہے اور یہ مواد اگر چہ مقالے کا حصہ نہیں بنا ہے، لیکن وہ اس کی علمی زندگی کا حصہ ضرور ہے اور امتحانی مناقشہ کے دوران وہ اس کے کام آئے گا۔ نیز مستقبل میں مزید تحقیق کرتے وقت وہ اس کو دوسرے تحقیقی مضامین کا حصہ بنا سکتا ہے۔

☆...طالب علم مقالے میں مذکورہ تمام مواد کا ذمہ دار ہوگا۔ وہ کسی چیز سے صرف اس لیے بری الذمہ نہیں ہوسکتا کہ اس نے یہ مواد کسی دوسرے شخص سے نقل کیا ہے، اگر چہ وہ دوسرا شخص علمی مرتبے میں انتہائی بلندی پر ہو، لہٰذا طالب علم کو اُن تمام مصنفین کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہیے جنہوں نے زیرِ بحث موضوع پر لکھا ہو۔ اسی طرح اس کو یہ بھی جاننا چاہیے کہ کون سے مصنف تسامح وتساہل کرتے ہیں اور کون سے مصنف حزم واحتیاط؟ ان کی معاملہ فہمی کتنی ہے؟ وہ علمی، اخلاقی اور تحقیقی روایات کی کتنی پابندی کرتے ہیں؟ اور اس کے علاوہ ہر اس چیز کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنا چاہیے جو کسی بھی لکھنے والے کی تحریر پر اثر انداز ہوسکتی ہے، مثلاً: سیاسی افکار، اقتصادی نظریات، دینی جذبات اور مذہبی رجحانات تا کہ وہ ان میں سے صرف ان حضرات سے استفادہ کرے جو اس بارے میں احتیاط، باریک بینی اور دقت نظری سے کام لیتے اور معاملات کو قریب سے جانتے اور سمجھتے ہیں۔

☆...عام تسلیم شدہ حقائق جو بہت ہی زیادہ مشہور ہوتے ہیں، ان کو قدیم یا جدید مراجع کا حوالہ دیے بغیر بھی مقالے میں ذکر کیا جاسکتا ہے۔ بعض مقالہ نگار اصل مضمون سے زیادہ مراجع کا انبار لگانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہ طریقہ اصل کو تابع اور تابع کو اصل بنا دیتا ہے۔ مرجع کا حوالہ تو کسی اہم بات یا نظریے کی توثیق کے لیے ہوتا ہے۔ مراجع بذاتِ خود مقصود نہیں، اس لیے بات بات پر حوالہ جات کا ڈھیر لگانا کوئی قابلِ رشک بات نہیں۔ اگر مراجع زیادہ ہوں تو قدیم ترین اور موضوع کے ساتھ قریبی تعلق والے مراجع ذکر کرنا چاہیے اور جب مرجع اصلی کا حوالہ دے دیا جائے تو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ ان ثانوی مراجع کا بھی حوالہ دیا جائے جن میں یہی عبارت مرجع اصلی سے لی گئی ہے۔

مقالے کے مراجع ومصادر

ہر مقالے کے آخر میں مراجع ومصادر درج کیے جاتے ہیں، لہٰذا یہاں مراجع کی اقسام اور ان کے اندراج کا طریق کار ذکر کیا جاتا ہے۔

مراجع اصلیہ وثانویہ:

مراجع دو طرح کے ہوتے ہیں: مراجع اصلیہ اور ثانوی مآخذ۔

۱- مراجع اصلیہ:

''مراجع اصلیہ'' وہ کتب یا مآخذ ہیں جو مقالے کے موضوع اور اس کے متعلقہ حقائق سے براہ راست تعلق رکھتے ہوں اور اصالۃً اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوں جس پر طالب علم مقالہ لکھ رہا ہے۔

مراجِع اصلیہ کی پھر دو قسمیں ہیں: خصوصی مراجع اصلیہ اور عمومی مراجع اصلیہ۔ مثلاً اگر کوئی طالب علم تاریخ پر مقالہ لکھ رہا ہے تو اس کی ''خصوصی مراجع اصلیہ'' تاریخی کتابیں ہی ہوں گی۔ البتہ اگر دوران تحقیق کسی آیت، حدیث سے استشہاد کی ضرورت پیش آئی اور اس نے کتب تفسیر وحدیث کی طرف مراجعت کی تا کہ اس تفسیری نکتے یا حدیث کی صحت کے بارے میں مفسرین ومحدثین کا تبصرہ نقل کرے یا دوران تحقیق کسی لفظ کا لغوی معنی بیان کرنے کی ضرورت پڑی، مثلاً وہ خلافت یا امامت میں فرق بیان کرنا چاہتا ہے یا کسی شاعر کے چند اشعار کو بطور دلیل پیش کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے کتب لغت یا شعر کے دیوان سے حوالہ دیتا ہے تو یہ ''عمومی مراجع اصلیہ'' ہوں گے۔

مراجِع اصلیہ ہی مقالے میں سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، کیونکہ یہ موضوع پر مشتمل مواد کا قدیم اور مستند ذخیرہ ہوتا ہے۔ مراجع اصلیہ سے جتنا زیادہ استفادہ ہو اور ان سے مستفاد حقائق جتنے زیادہ ہوں، اتنا ہی مقالے کا معیار بڑھے گا، خصوصاً جب یہ حقائق اور معلومات ایسی ہوں کہ مقالہ نگار سے پہلے ان تک کسی کی رسائی نہ ہوئی ہو اور نہ کسی نے ان کو بطور اقتباس نقل کیا ہو۔

۲-ثانوی مآخذ:

ثانوی مآخذ وہ مراجع ہیں جن میں اور تحقیق نگار میں ایک یا زیادہ واسطوں کا فاصلہ ہو۔یعنی وہ مآخذ جن میں کسی ناقل نے مراجعِ اصلیہ سے مواد لے کر اپنے اسلوب و انداز میں پیش کیا ہو۔

اگر طالب علم کو ثانوی مراجع میں ایسا مواد مل جائے جو مقالے کے لیے ضروری ہو تو اسے چاہیے کہ ان پر اعتماد کرنے کے بجائے مراجعِ اصلیہ کی طرف رجوع کرے اور اس اقتباس یا محولہ کلام کے اصل مآخذ تک رسائی حاصل کر کے اسے اس کے سیاق و سباق کے ساتھ مطالعہ کرے۔ طالب علم کو چند مرتبہ کے تجربے سے معلوم ہو جائے گا کہ مراجعِ اصلیہ کو خود اپنی نظر سے دیکھنا کتنا ضروری ہوتا ہے؟ کیونکہ کچھ ثانوی مراجع ایسے ہیں جن میں مراجعِ اصلیہ سے منقول عبارات سمجھنا مشکل ہوتا ہے یا وہ مواد ثانوی مراجع میں ایک خاص رنگ میں رنگ کر پیش کیا جاتا ہے جس سے اصل ماخذ کا مفہوم اور مطلب کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔

مراجعِ اصلیہ کی مراجعت کیے بغیر ثانوی مراجع پر اعتماد کرنا کتنی سنگین اور خطرناک بات ہے؟ اس کو یوں سمجھیے کہ تجربے سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی شخص سے کوئی بات نقل کرے، پھر وہ شخص اس بات کو آگے نقل کرے اور پھر چوتھا شخص اس تیسرے سے وہی بات نقل کرے تو عموماً یہ ہوتا ہے کہ جو بات چوتھے شخص نے کہی یا لکھی ہے، وہ پہلے شخص کی کہی یا لکھی ہوئی بات سے تھوڑی بہت مختلف ہوگی۔ حدیث اور فقہ جیسے محقق و مستند دینی علوم کی روایات کے علاوہ عام اقتباسات اور حوالہ جات میں احتیاط نہ کرنے سے نقل در نقل در آنے والی غلطیوں کی مثالوں کی فہرست کافی طویل ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ نے اس احتیاط پر بہت زور دیا ہے اور اس حوالے سے کی گئی بے احتیاطی کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں جو ان کی کتاب ''شرح عقود رسم المفتی'' میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ میں نے اپنی کتاب ''ردالمحتار'' (المعروف بہ ''فتاوی شامی'') میں یہ التزام کیا ہے کہ ہر حوالہ کو اس کے اصلی مآخذ سے رجوع کرنے کے بعد درج کروں گا۔ یہ احتیاط اس کتاب کی مقبولیت کی ان متعدد وجوہات میں سے ایک ہے جن کی بنا پر ان کی یہ کتاب اہل علم کا مرجع بن گئی ہے۔

یہاں دو نکتے سمجھ لیجیے:

۱-مراجعِ اصلیہ کبھی جدید بھی ہوتے ہیں، جیسے: سرکاری شماریات، جنہیں حکومت، آبادی، درآمدات، برآمدات اور تجارتی اتار چڑھاؤ کے بارے میں وقتاً فوقتاً شائع کرتی ہے، اسی طرح با اعتماد علمی حلقوں میں مقبولیت عام پانے والے علمی تجربات اور عدالتی فیصلوں کا پس منظر اور وجوہات وغیرہ۔ البتہ وہ جدید کتابیں جن میں موجود اقتباسات کے حوالے نہیں ہوتے، مقالہ نگار کے کسی کام کی نہیں۔

۲-ثانوی مراجع بھی کبھی کبھی اصلی اور کارآمد تحقیقی نکات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ مثلاً ثانوی ماخذ کا مصنف جس چیز کے بارے میں تحقیق کر رہا ہے، اس کے بارے میں اپنا ایک خاص نقطۂ نظر اپنی کتاب میں ظاہر کرتا ہے، یا مراجعِ اصلیہ سے کوئی اقتباس نقل کرنے کے بعد اس پر تبصرہ وتنقید کرتا ہے..... وغیرہ وغیرہ۔ یہ ساری چیزیں اصل نکات ہیں بشرطیکہ اس جیسی بات اس سے پہلے کسی اور نے نہ کہی ہو۔

مراجع ومصادر کی ترتیب:

مقالے کے آخر میں ان تمام ماخذ کو ایک خاص ترتیب سے لکھا جاتا ہے جن سے مقالے کے دوران استفادہ کیا گیا۔ اس ترتیب کو ہم ''حاشیہ نگاری'' والے مضمون کے آخر میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ وہاں دیکھ لیا جائے۔

مشق

۱-مقالے کی تدوین کے اجزائے ترکیبی کیا ہوتے ہیں؟ تحقیق کے چوتھے مرحلے ''تسوید وتدوین'' کا مرحلہ وار ڈھانچہ لکھیے۔

۲-''تحقیق کے اسلوب پر بطور مجموعی سنجیدگی اور وقار کے ماحول کو طاری رکھا جائے گا۔'' اس پر مختصر اور جامع نوٹ لکھیں۔

۳-''تحقیق میں دیانتداری کے تقاضوں کو خصوصیت کے ساتھ نبھایا جائے'' اس حوالے سے اصولی نکات ذکر کریں۔

٤-مراجع اصلیہ وثانویہ کی وضاحت اور تفصیل لکھیے۔

۵-مقالے کو حتمی شکل دینے کا طریقہ کار مختصراً لکھیے۔

آخری بات

✓ قلم کی حرمت اور حروف کے تقدس کا ہمیشہ خیال رکھیں۔اپنی نیتوں کو پاک صاف اور عزائم کو بلند رکھیں۔شہد کی مکھی بنیں جس کی فضیلت خود اس کا خالق بتاتا ہے۔گندگی کی مکھی والی عادتوں سے دور رہیں۔جن سے مخلوق بھی نفرت کرتی ہے اور خود مکھی کو بھی... بالآخر...کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

✓ قلم کی حرمت اور حروف کے تقدس کا ہمیشہ خیال رکھیں۔فن تحریر کی مشق اور لفظ جوڑنے کے فن کو صرف اور صرف حق کا بول بالا کرنے اور حق و باطل کے معرکے میں اپنا وزن اہل حق کے پلڑے میں ڈالنے کے لیے استعمال کریں۔

✓ درست اور سچے نظریات کی اشاعت اور غلط و باطل امور کی تردید کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے اس صلاحیت کو کبھی استعمال نہ کریں ورنہ دنیا میں فائدے کے بجائے نقصان اور آخرت میں سخت پکڑ کا اندیشہ ہے۔

سب سے آخری بات

یہ کہ شروع میں کہی گئی پہلی اور دوسری بات پر گاہے گاہے ایک نظر ڈالتے رہیں۔نیز ان سات قرآنی نصیحتوں کو ہمیشہ حرز جان بنائے رکھیں جو خالق لوح وقلم نے ہر داعی الی الخیر کو تاکید سے کی ہیں،تاکہ آپ کے سیکھے گئے فن کا دنیوی معیار جیسا بھی ہو،اخروی نتیجہ فلاح ونجات اور مغفرت ورحمت کی شکل میں ہو۔

کتابیات

یہ کتاب دراصل مؤلف کی ضخیم کتاب تحریر کیسے سیکھیں؟ سے تلخیص کی گئی ہے، لیکن اس کی تیاری میں درج ذیل کتابوں سے بھی کم یا زیادہ استفادہ کیا گیا ہے، جس کے لیے مؤلف نیچے دی گئی تمام کتابوں کے مصنفین کا اپنے اور تمام طلبہ کی طرف سے شکر گذار ہے۔ اللہ تعالی اس حقیر کاوش کو جو درحقیقت دینی مدارس کے طلبہ کے لیے فنِ تحریر سکھانے کا ''مختصر نصاب'' ہے، سب کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے۔ آمین

۱	آپ بھی اچھا لکھ سکتے ہیں	رائے صابر حسین	ہم قدم مئی ۲۰۰۱ء
۲	آپ بھی لکھیں	ڈاکٹر غلام فرید بھٹی	حقیقت بہاول پور ستمبر ۹۰ء
۳	لکھاری کیسے بنتا ہے؟	امجد جاوید	علم و عرفان پبلشرز لاہور
٤	اردو ادب کی تدریس و تمرین	عزیز دانش امدادی	حاجی امداد اللہ اکیڈمی، حیدرآباد، سندھ
٥	رہنمائے مطالعہ و مضمون نگاری	مفتی جمیل احمد نذیری	مکتبہ ارسلان، کراچی
٦	كيف تكتب بحثا أو رسالة؟	دكتور احمد شلبي	مكتبة النهضه، قاهره
۷	مقالہ نگاری کے اصول	مولانا عقیل الرحمٰن	مکتبۂ ارسلان اردو بازار کراچی
۸	تحریر کیسے سیکھیں؟	مفتی ابولبابہ شاہ منصور	السعید، پبلشرز، کراچی

مصنف کی دیگر کتب

الحجاز
0314-2139797